

# زندگیاں



اقبال کاظمی



یہ دنیا بڑی عجیب و غریب جگہ ہے۔ یہاں ہر لمحہ خوفناک حادثات اور عجیب و غریب اوزر پر اسرار واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو اس قدر حیرت انگیز اور پر اسرار ہوتے ہیں کہ ان پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا اور انسانی عقل انہیں تسلیم نہیں کرتی۔ برمودہ ٹرائی ایگل کی مثال دنیا کے سامنے ہے۔ وسیع و عریض سمندر پر محیط پانی کی یہ ٹکون ایک ایسا معہ بنی ہوئی ہے جسے سائنس بھی حل نہیں کر سکی۔ انسان نے چاند پر اپنے قدموں کے نقوش ثبت کر دیئے مگر اپنی ہی زمین پر پانی کی محدود گہرائی میں پوشیدہ راز دریافت نہیں کر سکا کہ برمودہ ٹرائی ایگل میں سفر کرنے والے بحری جہاز کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے سائنس دان ایک صدی سے بھی زائد عرصے سے یہ معہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

معاملہ برمودہ ٹرائی ایگل میں صرف بحری جہازوں کی گمشدگی تک ہی محدود نہیں ہے۔ پانی کی اس ٹکون کے اوپر فضا میں پرواز کرنے والے لاقعد طیارے بھی پر اسرار طور پر غائب ہو چکے ہیں۔

برمودہ ٹرائی ایگل کے بارے میں سائنس دانوں کی آراء مختلف ہیں۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سمندر کے اس حصے میں زیر آب ایسی متناطیسی چٹانیں موجود ہیں جو سطح آب پر آنے والے بحری جہازوں اور فضا میں پرواز کرنے والے ہوئی جہازوں کو اپنی طرف یعنی پانی کے نیچے کھینچ لیتی ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان لاپتہ ہوئی جہازوں یا بحری جہازوں کا پتہ نہیں چل سکا۔ اگر واقعی طیارے یا بحری جہاز زیر آب متناطیسی چٹانوں کی کشش سے سمندر کی گہرائی میں چلے جاتے ہیں تو ان کے غرق شدہ ڈھانچوں یا ان کے مسافروں کا کچھ تو پتہ چلنا چاہئے تھا۔ مگر آج تک کسی چیز کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ بعض سائنس دان اس مفروضے پر بھی کام کر رہے ہیں کہ کسی اجنبی سیارے کی بہت

ہی ترقی یافتہ مخلوق نے برمودہ ٹرائی اینگل میں سمندر کی عمیق ترین گہرائی میں اپنا کوئی ایسا مرکز قائم کر رکھا ہے جہاں وہ حضرات انسان پر مختلف قسم کے تجربات کر رہے ہیں۔ وہ اس علاقے میں پانی کی سطح پر سفر کرنے والے بحری جہازوں اور فضا میں پرواز کرنے والے طیاروں کو اپنے آپ اس زیر آب تحقیقاتی مرکز میں لے جاتے ہیں اور اس طرح ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس اجنبی مخلوق کے بارے میں بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ سائنسی ترقی میں انسان سے صدیوں آگے ہے۔ یہ سائنس دان اس اجنبی مخلوق کی موجودگی کے ثبوت پر بہت ہی تیز روشنی کے ان جھماکوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں جو اکثر و بیشتر سمندر کے اس حصے میں نمودار ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ ان سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سمندر پر دیکھے جانے والے خیرہ کن روشنی کے یہ جھماکے دراصل اس اجنبی مخلوق کی وہ پراسرار اژدن طشتریاں ہیں جو سمندر کی عمیق گہرائیوں سے نمودار ہو کر پلک جھپکتے ہیں آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو جاتی ہیں۔

برمودہ کی اس سمندری تکنوں پر تحقیقات کا سلسلہ برسوں سے جاری ہے لیکن آج تک سائنس میں اس قدر ترقی کر لینے کے باوجود انسان اس معے کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس سمندر کے اس حصے میں تحقیقات کی غرض سے ہر قسم کے جدید ترین سائنسی آلات سے لیس بحری جہاز اپتے ہو چکے ہیں۔ اور مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ برمودہ ٹرائی اینگل میں سمندر کے ایک مخصوص حصے میں داخل ہوتے ہی بحری جہازوں اور فضا میں پرواز کرنے والے طیاروں کا ریڈیائی رابطہ فوراً ختم ہو جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔ برمودہ ٹرائی اینگل کیا ہے؟ یہاں سمندر کی گہرائیوں میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ دنیا بھر کے سائنس دان اس معے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا کہ اس دنیا میں ہر لمحہ عجیب و غریب اور پراسرار واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور بعض واقعات تو ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسانی عقل تسلیم نہیں کرتی۔ ایسا ہی ایک پراسرار اور ناقابل یقین واقعہ ہمارے ملک میں بھی پیش آچکا ہے اور یہاں کے عوام کئی سال گزر جانے کے بعد بھی حیران ہیں کہ گلگت کی فضا میں پرواز کرنے والا وہ ہوائی جہاز کہاں غائب ہو گیا جس کے مسافر برف سے ڈھکی بلند ترین پہاڑی چوٹی

ناگہاں بہت کا نظارہ کرنے کے لئے گھر سے نکلے تھے۔

☆

وہ اپریل کی ایک رات تھی۔ کراچی میں گلشن اقبال کے علاقے میں واقع ایک میرج لان بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ اس رات ایک جوڑا اپنی زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرنے والا تھا۔ مزید رشتہ دار اور دوست احباب سب ہی خوشی کے اس موقع پر موجود تھے۔ میرج لان کو بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک سٹیج پر لڑکیاں دلہن کو گھیرے بیٹھی تھیں اور دوسرے سٹیج پر دولہا کے دوست اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس بچے میزوں کے گرد گھومتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کچھ بچے اپنی ماؤں سے لپٹے منہ بسورے بار بار ان سے کھانے کو مانگ رہے تھے۔

اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میرج لان مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ کھانا ابھی تک نہیں کھلا تھا۔ لوگ ٹولیوں میں کھڑے چمگولیاں کر رہے تھے۔ موضوع گفتگو تھا کہ اس قسم کی تقریبات میں مہمانوں کی آمد میں تاخیر اور پھر انہیں مزید تاخیر سے کھانا کھانا ایک رواج بن چکا ہے۔

ندیم بھی اپنے چند دوستوں کے ساتھ گیٹ کے قریب ہی کھڑا اس موضوع پر باتیں کر رہا تھا۔ ان سے چند گز کے فاصلے پر گیٹ کے ساتھ ہی میرج لان کے میئر کا دفتر تھا۔ جہاں ایک کونے میں ایک چھوٹائی وی سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ٹی وی پر اس وقت کوئی انگریزی فلم آرہی تھی۔ بعض لوگ دفتر کے دروازے کے سامنے کھڑے فلم دیکھ رہے تھے۔ ندیم بھی اپنے دوستوں سے ہٹ کر دفتر کے دروازے کے سامنے آگیا۔ وہ فلم کا غالباً آخری سین تھا۔ دو آدمی ایک پہاڑی چٹان پر لڑ رہے تھے اور ظاہر ہے ان میں ایک ہیرو تھا اور دوسرا ولن..... کچھ دیر تک ان میں لڑائی ہوتی رہی۔ لڑائی کے دوران بعض ایسے خوفناک مناظر بھی آئے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور بالآخر ولن کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ ہیرو کا گھونسا کھا کر چٹان سے اچھلا اور سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ کی تہ کی طرف گرنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری چیخ بہت طویل اور بہت ہی خوفناک تھی۔

اس خوفناک منظر کے ساتھ ہی فلم ختم ہو گئی اور سکرین پر ایک نوجوان نیوز کاسٹر کا چہرہ ابھر آیا جو اس شب کے آخری پروگرام فرمان الہی سے پہلے خاص خاص خبریں سننے کو تیار بیٹھا تھا۔ ٹی وی سکرین پر نیوز کاسٹر کو دیکھتے ہی دفتر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ ان لوگوں کو غالباً خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ندیم وہیں کھڑا رہا۔ بلکہ وہ دو قدم آگے بڑھ کر دروازے کے قریب آ گیا۔ شادی کی اس تقریب میں آنے کی تیاری کے چکر میں اس نے رات نوبے والا خبر نامہ نہیں سنا تھا۔ لیکن میرج لان میں آنے کے بعد اس نے بعض مہمانوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا کہ کوئی طیارہ لاپتہ ہو گیا تھا۔ طیارہ کہاں کا تھا؟ کیسے لاپتہ ہوا؟ اسے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ ٹی وی سکرین پر نیوز کاسٹر کو دیکھ کر اس کا تجسس ابھر آیا۔ اور وہ یہ سوچ کر کھڑا رہا کہ شاید خاص خاص خبروں کے اس ٹیلیٹن میں اس طیارے کے بارے میں بھی کچھ بتایا جائے۔ نیوز کاسٹر پہلے سرکاری خبریں سناتا رہا۔ پھر اس نے گمشدہ طیارے کا بھی تذکرہ کر دیا۔ خبر بہت مختصر تھی۔

”آج صبح گلگت سے اسلام آباد آنے والا ایک مسافر بردار طیارہ لاپتہ ہو گیا۔ یہ ایک چارٹرڈ سفاری فلائٹ تھی جس میں ساٹھ مسافر اور عملے کے چھ افراد سوار تھے۔ گلگت کے ہوائی اڈے سے پرواز کے چند منٹ بعد کنٹرول ٹاور سے طیارے کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ آخری اطلاعات کے مطابق اس طیارے کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔“

خبریں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ٹی وی پر فرمان الہی کا پروگرام آرہا تھا۔ ندیم وہیں کھڑا رہا۔ لیکن وہ یہ پروگرام نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ ہی اسے یہ پتہ چل سکا کہ کھانا کھل گیا ہے اور ان میں موجود تمام مہمان کھانے پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ وہ تو دفتر کے دروازے کے قریب کھڑا گلگت کی فضاؤں میں اس گمشدہ طیارے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خبر میں اگرچہ طیارے کے مسافروں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کا ذہن اپنے بھائی کلیم میں الجھا ہوا تھا۔ کلیم اس سے دو سال بڑا تھا۔ اس نے گریجویشن کیا تھا۔ کچھ عرصہ تک محکمہ سیاحت کے ایک گائیڈ کی حیثیت سے دنیا کی بلند ترین چوٹی نانگا پربت کے دامن تک بھی گیا تھا۔ گلگت میں ایک سال گزارنے کے بعد جب اسے کوئٹہ ٹرانسفر کے احکامات ملے تو اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ملازمت سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ اس کی دو وجوہات

تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اسے یہ علاقہ بہت پسند آیا تھا۔ ملازمت چھوڑنے کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اس نے اسی علاقے میں پرائیویٹ گائیڈ کی حیثیت سے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں سیزن میں یہاں اتنے سیاح آتے تھے کہ ان سے اچھی خاصی آمدنی ہو سکتی تھی۔

کلیم نے گلگت ہی میں گولڈن پیک ان نامی ہوٹل میں اپنا چھوٹا سا دفتر کھول لیا۔ محکمہ سیاحت سے پرائیویٹ گائیڈ کا لائسنس حاصل کرنے میں بھی اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ ایک سال تک گلگت والے دفتر میں اپنا کام چلاتا رہا۔ اس کام میں آمدنی اس کی توقع سے زیادہ تھی۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

گلگت کی وادی اور نانگا پربت، راکا پوشی اور دنیا کی بلند ترین چوٹی کے ٹوکا فضائی نظارہ کرنے کے لئے لوگ سفاری فلائٹس کے ذریعے ان فضاؤں میں آتے تھے۔ کلیم نے سوچا تھا کہ اگر وہ سیاحوں کو ان چوٹیوں کا فضائی نظارہ کرانے کا کوئی بندوبست کر سکے تو اس میں بڑی آمدنی ہو سکتی تھی۔ اس بزنس میں آمدنی تو بلاشبہ تھی۔ لیکن اس میں کچھ رکاوٹیں بھی تھیں اور کلیم جیسے شخص کے لئے ان رکاوٹوں کو عبور کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر کے تھوڑے ہی عرصے میں تمام انتظامات مکمل کر لئے۔ روپے پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ سب سے پہلے اس نے گلگت میں سیاحوں کو ٹھہرانے کے لئے کئی کمروں پر مشتمل ایک کالنج حاصل کیا اور اپنا دفتر بھی گولڈن پیک ان سے اسی کالنج میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اسلام آباد میں ایک دفتر قائم کیا اور ایئر سفاری ٹور آپریٹرز کے نام سے اس نے اپنا یہ نیا بزنس شروع کر دیا۔ اسے نہ صرف اچھا خاصا شاف رکھنا پڑا بلکہ اس کی خوب پبلسٹی بھی کی گئی تھی۔ کلیم نے قومی ایئر لائن کے علاوہ بعض پرائیویٹ ہوائی کمپنیوں سے بھی چارٹرڈ سفاری فلائٹس کے لئے معاہدے کر لئے تھے۔

کلیم کا ایئر سفاری ٹور آپریٹرز والا بزنس خوب چل نکلا۔ ابتدا میں تو اسے کچھ مشکلات ضرور پیش آئی تھیں۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ اسے ہفتے میں ایک فلائٹ مل جاتی۔ ساٹھ ستر سیاحوں سے وہ ایک ہفتے ہی میں کم از کم دو دو حائی لاکھ روپے کمالیتا تھا۔ وہ اسلام آباد سے طیارہ چارٹر کر کے سیاحوں کو پہلے گلگت لاتا۔ کم از کم ایک دن اور ایک رات وہاں قیام کے دوران کالنج کے کرائے اور دیگر اخراجات کی مد میں سیاحوں سے خاصی رقم مل جاتی۔ ان

نظارہ کرنے کیوں آتے ہیں۔ برف سے ڈھکی ہوئی ان چوٹیوں میں واقعی بڑی کشش تھی۔ طیارہ ان چوٹیوں کے پہلو میں پرواز کر رہا تھا اور کلیم جہاز کے مائیک سسٹم پر مسافروں کو ان برف پوش چوٹیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دنیا کی ان بلند ترین چوٹیوں کو اپنے بالکل قریب دیکھ کر ندیم کے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جہاز کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر ہاتھ باہر نکالے اور ان برف پوش چوٹیوں کو چھو لے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ چوٹیاں جہاز سے سینکڑوں گز دور تھیں۔

کلیم سے ندیم کا آخری رابطہ دو ہفتے پہلے ہوا تھا۔ ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ کلیم نے ضرورت کی کچھ چیزیں منگوائی تھیں جو ندیم نے دوسرے ہی روز اسے بھیج دی تھیں۔ اور اب ٹی وی پر گلگت کی فضاؤں میں چارٹرڈ سفاری فلائٹ کی گمشدگی کا سن کر ندیم کے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اسلام آباد کی بعض دیگر ٹور آپریٹرز ایجنسیاں بھی سفاری فلائٹس چلاتی تھیں اور خبروں میں کسی ایجنسی کا نام نہیں بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ندیم بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

”ارے ندیم! تم یہاں کھڑے ہو۔ کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

یہ آواز ندیم کو خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ایک دوست کھانے کی پلیٹ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ پلیٹ میں روسٹ کئے ہوئے مرغ کی رانیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ران اس کے دوسرے ہاتھ میں تھی جسے وہ دانتوں سے نوج رہا تھا۔ ندیم کو اپنے اس دوست کے ندیدے پن پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ بھی کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے تھے جیسے انہوں نے برسوں سے کچھ نہ کھایا ہو۔

”نہیں یار! میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ دوست نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں! طبیعت ٹھیک ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“ ندیم کہتے ہوئے گیت سے باہر نکل گیا۔

سفاری فلائٹس کے سیاح زیادہ تر غیر ملکی ہوتے تھے۔ ان کے آنے کا مقصد بھی سیر و تفریح ہوتا تھا اور اس کے لئے وہ دل کھول کر پیسہ خرچ کرتے تھے۔ بعض غیر ملکی سیاح کئی کئی روز تک گلگت میں رہ جاتے تھے۔ انہیں جھپوں کے ذریعے ہنزہ، وادی نیپال، یاسین فینڈر، جھیل رام اور شیندور تک کی سیر کرائی جاتی تھی۔ شیندور دنیا کا بلند ترین پولو گراؤنڈ تھا یہاں آنے والے غیر ملکی سیاح پولو کا کھیل دیکھ کر بے حد محظوظ ہوتے۔ یوں بھی فٹت اور شمالی علاقہ جات کی پوری وادی کرہ ارض پر قدرت کا حسین ترین شاہکار سمجھی جاتی تھی۔ جا بجا نیلگوں پانی کی جھیلیں، گنگنائی ندیاں اور چشے، وسیع و عریض وادیاں، رنگ برنگے پھول اور گلشیرز، غیر ملکی سیاحوں کے لئے ان چیزوں میں بڑی کشش تھی۔ یہاں جھیلوں اور ندیوں میں ٹراوٹ فیش بکثرت پائی جاتی تھی۔ اس مچھلی کے شکار پر اگرچہ پابندی تھی لیکن کلیم اپنے سیاحوں کے لئے متعلقہ محکمے کو معمولی سی فیس ادا کر کے لائسنس حاصل کر لیتا تھا۔

وادی گلگت میں غیر ملکی سیاحوں کے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز شاہراہ ریشم تھی۔ دنیا کی اس بلند ترین شاہراہ کو بلاشبہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہا جاسکتا تھا۔ آٹھ سو پانچ کلو میٹر لمبی یہ شاہراہ وادی گلگت میں سازن، پتن، بشام، چلاس، گلگت شہر اور ہنزہ کی خوبصورت وادی سے ہوتی ہوئی چین کی سرحد پر سولہ ہزار فٹ بلند قصبے خنجراب تک چلی گئی تھی۔ اس سے آگے چین کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ پاکستان آرمی اور چینی انجینئرز کے اشتراک سے یہ خوبصورت شاہراہ پندرہ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

یہی سب چیزیں کلیم جیسے لوگوں کی آمدنی بنی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا بزنس بڑی کامیابی سے چلا رہا تھا۔ سیزن میں سیاحوں کی آمد میں اضافہ ہو جاتا اور کلیم کو کبھی ہفتے میں دو اور کبھی تین سفاری فلائٹس کا بندوبست کرنا پڑتا۔

ندیم بھی ایک مرتبہ اپنے بھائی سے ملنے کے لئے گلگت گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو دوست بھی تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کلیم سے ملاقات ہو جائے گی اور پکنک بھی ہو جائے گی۔ اتفاق سے دو دن بعد سیاحوں کو راکا پوشی اور ناٹنگ پربت کی چوٹیوں کا نظارہ کرانے کے لئے سفاری فلائٹ جانے والی تھی۔ کلیم نے ندیم اور اس کے دوستوں کو بھی ساتھ لے لیا۔

ندیم کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے ان پیاری چوٹیوں کا

ندیم کا گھر بھی گھٹن اقبال ہی میں تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں تقریباً پندرہ منٹ میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک چھوٹی بہن بھی تھی جو کالج میں زیر تعلیم تھی۔ ندیم جب پونے نو بجے گھر سے نکلا تھا تو اس کے سارے گھر والے اپنے ایک اور عزیز کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ اور اب جو واپس آیا تو سب لوگ موجود تھے۔ لیکن ان سب کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی پریشانی دو چند ہو گئی۔

”کہاں غائب تھے تم؟“ ماں نے کہا۔

”آپ کو تو معلوم ہی تھا کہ مجھے اسفندیار کی شادی میں جانا ہے۔ لیکن آپ سب لوگ اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟“ ندیم نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا۔ حالانکہ ان کی پریشانی کی وجہ وہ کسی حد تک سمجھ چکا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں نے بھی خبریں سن لی ہوں اور یہ لوگ بھی کلیم کے لئے پریشان ہو رہے ہوں۔

”خبر سنیں تمہیں تم نے؟“ ماں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”گیارہ بجے آخری بیٹن سنا تھا۔ اس میں گلگت کے علاقے میں کسی چارٹرڈ سفاری فلائٹ کے لاپتہ ہونے کی خبر تھی۔ اب میں آپ کی پریشانی کی وجہ سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اس خبر میں ٹور آپریٹر ایجنسی یا جہاز کے مسافروں کا نام نہیں تھا۔ ممکن ہے وہ کسی دیگر ایجنسی کا چارٹر کیا ہوا طیارہ ہو۔ آپ لوگ کلیم بھائی کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”تم نے نو بجے والا خبر نامہ نہیں سنا؟“ اس مرتبہ ندیم کے والد نے کہا۔ ”اس بیٹن میں کلیم کی ٹور آپریٹر ایجنسی کا نام بھی تھا اور اس سفاری فلائٹ پر سوار مسافروں کے نام بھی نشر کئے گئے تھے۔ اس فہرست میں تمہارے بھائی کا نام بھی شامل ہے۔ اور پھر میں نے اسلام آباد کلیم کے دفتر فون کر کے اس کی تصدیق بھی کر لی ہے۔ وہ چارٹرڈ سفاری فلائٹ کلیم ہی کی ایجنسی کی تھی اور کلیم بھی ساتھ گیا تھا۔“

ندیم سناٹے میں آ گیا۔ اس نے ماں اور چھوٹی بہن کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں یکایک آنسو اُٹ آئے تھے۔ ندیم چند لمحے مہبوت سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر چھوٹی بہن شہناز کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شہناز بے اختیار ہو کر ندیم سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو چکے تھے۔ ندیم

کچھ دیر تک ان دونوں کو تسلی دیتا رہا۔ پھر کمرے کے کونے میں سٹینڈ پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھ کر اسلام آباد میں کلیم کے دفتر کا نمبر ملانے لگا۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی اور دفتر کے منیجر احمد کی آواز سنائی دی۔

”کراچی سے ندیم بول رہا ہوں احمد!“ ندیم نے کہا۔ ”میں ابھی گھر آیا ہوں تو مجھے سفاری فلائٹ کی گمشدگی کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ طیارے کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟ کوئی حادثہ یا کوئی اور بات؟“

”ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا سکا!“ احمد نے جواب دیا۔ ”سول ایوی ایشن اور قومی ایئر لائن کے متعلقہ حکام سے میرا مسلسل رابطہ قائم ہے۔ اگر خدا نخواستہ طیارے کو کوئی حادثہ پیش آیا ہو تا تو اب تک کہیں نہ کہیں سے کوئی اطلاع مل جاتی۔ اس کا مطلب ہے کہ طیارہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ممکن ہے موسم کی خرابی کی وجہ سے طیارہ راستہ بھٹک کر مقبوضہ کشمیر، چین یا افغانستان کی طرف نکل گیا ہو۔ ان علاقوں کے ایئر پورٹس سے بھی رابطہ قائم کر کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کسی فنی خرابی کی وجہ سے طیارے کو کسی میدانی علاقے میں کریش لینڈنگ کرنا پڑی ہو۔ اگر ایسا بھی ہوا ہے تو طیارے سے ابھی تک کوئی ریڈیائی رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ شمالی علاقہ جات میں جہاں جہاں ٹیلی فون یا وائر لیس کے ذرائع موجود ہیں وہاں وہاں طیارے کی گمشدگی کی اطلاع دے دی گئی ہے اور اگر کل صبح تک کچھ پتہ نہ چل سکا تو ہوائی جہازوں اور ٹیلی کاپڑوں کے ذریعے باقاعدہ تلاش شروع کر دی جائے گی۔ آپ لوگ دعا کیجئے کہ طیارہ کہیں اور اتر گیا ہو اور سب لوگ خیریت سے ہوں۔“

”جب سے طیارے کی گمشدگی کا سنا ہے دل سے یہی دعائیں نکل رہی ہیں۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”بہر حال! میں آدھے گھنٹے میں گھر سے نکل رہا ہوں۔ ایئر پورٹ سے جو بھی یہاں پہلی فلائٹ ملی اس سے اسلام آباد پہنچ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے سر.....“ احمد نے کہا۔ ”میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد گاڑی کو ایئر پورٹ بھیج دوں گا۔ کلیم صاحب کے ڈرائیور اصغر کو تو آپ جانتے ہیں نا؟ وہ ایئر پورٹ پر ہی رہے گا۔“

الاک کر کے ندیم کے بیٹھنے کے لئے کچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ندیم کے بیٹھنے کے بعد اس نے بیگ ڈیگی میں رکھا اور اسٹیزنگ کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے ابھی سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ اصغر بہت مناسب رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔

”پہلے گھر چلیں یا دفتر سر؟“ اصغر نے آب پارہ کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”احمد کہاں ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”وہ تو دفتر میں ہیں سر۔ رات بھر وہیں رہے ہیں۔“ اصغر نے جواب دیا۔

”تو پھر دفتر ہی چلو۔“ ندیم نے کہا۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولا۔

”طیارے کے بارے میں مزید کچھ معلوم ہوا؟“

”ابھی تک نہیں سر!“ اصغر نے جواب دیا۔ ”ایئر پورٹ پر معلومات کے لئے ایک خصوصی کاؤنٹر قائم کر دیا گیا ہے۔ احمد صاحب کا متعلقہ افسران سے براہ راست رابطہ قائم ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی حوصلہ افزا اطلاع نہیں ملی۔ گلگت والے دفتر سے بھی احمد صاحب مسلسل رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں سے بھی کوئی امید افزا اطلاع نہیں ملی۔ حیرت کی بات ہے کہ طیارہ کہاں غائب ہو گیا؟“

ندیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد سپر مارکیٹ کے علاقے میں واقع کلیم کے دفتر پہنچ گئے۔ احمد دفتر میں موجود تھا۔ اس کا چہرہ سنا ہوا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔

”ہاں ابھی! کیا صورت حال ہے؟“ ندیم نے احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تک تو طیارے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔“ احمد نے جواب دیا۔

چند لمبے خاموشی رہی۔ پھر احمد نے بتایا کہ ان کی سفاری فلائٹ ساٹھ سیاحوں کو لے کر معمول کے مطابق اسلام آباد سے گلگت روانہ ہوئی تھی۔ کلیم اس وقت گلگت میں تھا۔ گلگت میں تقریباً دو گھنٹے قیام کے بعد یہ فلائٹ سیاحوں کو راکا پوشتی کی چوٹیوں کا نظارہ کرانے کے لئے روانہ ہوئی تو کلیم بھی ساتھ ہی چلا گیا۔

سیاحوں کو راکا پوشتی کی چوٹیوں، وادی ہنزہ اور ان اطراف میں خوبصورت جھیلوں اور کلیشیرز کا فضائی نظارہ کرانے کے بعد فلائٹ بخیریت واپس آگئی۔ پروگرام کے مطابق اس سفاری فلائٹ کو اگلے روز گلگت ایئر پورٹ سے ٹیک آف کر کے ناٹکا پر بت کی چوٹیوں کے

”تھیک ہے۔ خدا حافظ!“ ندیم نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور پھر گھر والوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”خدا نخواستہ اگر طیارہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہو تا تو کسی نہ کسی ذریعے سے اب تک اس کی اطلاع مل چکی ہوتی۔ امکان ہے کہ طیارہ موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے راستہ بھٹک کر کسی پڑوسی ملک کے ایئر پورٹ پہنچ گیا ہے۔ تمام پڑوسی ممالک سے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔ بس ادعا کیجئے۔ طیارہ کہیں اتر گیا ہو اور سب لوگ خیریت سے ہوں۔ میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ آپ کو ٹیلی فون پر صورت حال سے آگاہ کرتا رہوں گا۔“

ندیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور الماری کھول کر چند جوڑے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں سفری بیگ میں رکھنے لگا۔ اس دوران اس نے ملازم لڑکے کو ٹیکسی لینے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اپنی تیاری مکمل کر کے وہ لاؤنج میں آگیا۔ جہاں اس کی بہن اور ماں باپ کھڑے تھے۔ ندیم انہیں تسلیاں دیتا رہا۔ اس دوران لڑکا ٹیکسی لے کر آگیا۔ ندیم نے گھر والوں کو خدا حافظ کہا اور بیگ اٹھا کر باہر آگیا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ماں اور بہن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ندیم نے ہاتھ ہلایا اور سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ایئر پورٹ پر پہنچتے ہی ندیم نے اسلام آباد جانے والی کسی بھی فلائٹ پر سیٹ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ صبح تین بجے کے بعد ایک فلائٹ پر ٹکٹ دے کر اسے ویننگ لسٹ پر رکھ لیا گیا۔ ویننگ لسٹ والوں کو عام طور پر سب سے آخر میں لاؤنج میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح لاؤنج میں پہنچ گیا اور متعلقہ افسر کو صورت حال سے آگاہ کر کے درخواست کی کہ جیسے بھی ممکن ہو اس فلائٹ پر اسے سیٹ دے دی جائے۔ آفیسر نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس معاملے میں اس کی مدد ضرور کرے گا اور ندیم کو اطمینان تو اس وقت ہوا جب بورڈنگ کارڈ اس کے ہاتھ میں آگیا۔

ندیم جب اسلام آباد ایئر پورٹ کے اریئول لاؤنج سے باہر نکلا تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔ کلیم کا ڈرائیور اصغر ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ ندیم کو دیکھتے ہی اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سفری بیگ لے لیا اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ میں گئے۔ سنے ماڈل کی ایک سفید ٹوٹو ٹاکار کے قریب وہ رک گئے۔ اصغر نے پہلے گاڑی ان



ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک فون پر باتیں کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں اس سرچ پارٹی میں پرائیویٹ سیکٹر سے فی الحال کسی کو شامل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر آج انہیں طیارے کی تلاش میں ناکامی ہوئی تو پھر وہ پرائیویٹ سیکٹر سے بھی مدد حاصل کریں گے۔“

”سب سے میں سب غیر ملکی تھے یا پاکستانی سیاح بھی شامل تھے؟“ ندیم نے پوچھا۔  
 ”ملے جلتے تھے۔“ احمد نے میز کی دراز میں سے فائل نکالتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے فائل کھولی اور ایک کاغذ پر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تین سیاح تو یورپین اور امریکی تھے۔ ان میں اٹھارہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ دو عورتوں اور دو مردوں کا تعلق ایران سے تھا۔ ایک جوڑا انڈونیشیا سے تھا۔ بارہ افراد جن میں خواتین، مرد اور تین بچے بھی شامل تھے پاکستانی تھے۔ ان میں سے ایک جوڑا کراچی سے آیا تھا اور باقی کا تعلق مختلف شہروں سے تھا۔ ان کے علاوہ جاپان، بنگلہ دیش، ترکی، سعودی عرب، آسٹریلیا، کینیڈا، تھائی لینڈ اور بعض دیگر ممالک کے سیاح شامل تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔“ احمد چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”طیارے کی گمشدگی کی خبر ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ ان لوگوں کے نام وغیرہ بھی نشر کئے جا چکے ہیں جو اس سفاری فلائٹ میں سفر کر رہے تھے۔ ان سیاحوں کے عزیزوں، دوستوں اور جاننے والوں کے فون آرہے ہیں۔ ہمارے پاس فی الحال انہیں بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ انہیں تسلی دیتے رہیں۔“

ندیم اس بات کا اندازہ پہلے ہی لگا چکا تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا ٹیلی فون کالز کا تانا بندا ہوا تھا۔ اندرون ملک کے علاوہ غیر ممالک سے بھی لا تعداد ٹیلی فون کالز آرہی تھیں۔ ان سب لوگوں کو تسلیاں دی جا رہی تھیں۔ امریکہ، کینیڈا، فرانس اور ترکی وغیرہ سے تو بعض لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود پاکستان آرہے ہیں۔ کراچی، لاہور اور فیصل آباد وغیرہ سے بھی کچھ لوگوں نے آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور ممکن ہے یہ لوگ آج ہی کسی وقت پہنچ جائیں۔

دس بجے احمد نے پھر متعلقہ حکام کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ طیارے روانہ ہو گئے ہیں اور تلاش کا کام شروع ہو چکا ہے۔

اوپر سے چکر لگاتے ہوئے اسلام آباد چلے جانا تھا۔ کلیم نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ بھی اس سفاری فلائٹ سے اسلام آباد آرہا ہے۔

سفاری فلائٹ نے گیارہ بجے گلگت ایئرپورٹ سے ٹیک آف کیا۔ اس کا رخ ناگاپربت کی طرف تھا۔ لیکن ٹیک آف کرنے کے چند رہ منٹ بعد طیارے کا کنٹرول ٹاور سے رابطہ ختم ہو گیا۔ ہوا بازی کا ایک اصول یہ ہے کہ کوئی جہاز کسی ایئرپورٹ سے ٹیک آف کرنے کے بعد جب تک اس ایئرپورٹ کی فضائی حدود میں رہتا ہے اس وقت تک اس کا رابطہ متعلقہ ایئرپورٹ سے قائم رہتا ہے۔ اور جب جہاز دوسرے ایئرپورٹ کی فضائی حدود میں داخل ہوتا ہے تو اس ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ قریب ترین ایئرپورٹ سکرو ہے۔ لیکن اس طیارے نے سکرو کنٹرول ٹاور سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا۔ اسلام آباد ایئرپورٹ سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہاں سے بھی یہی پتہ چلا کہ طیارہ اس ایئرپورٹ کی حدود میں بھی داخل نہیں ہوا۔

گلگت سے اسلام آباد ایک گھنٹے کا فضائی سفر ہے۔ لیکن اس سفاری فلائٹ کو ناگاپربت اور ارد گرد کے علاقوں کا چکر لگاتے ہوئے تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد اسلام آباد پہنچنا تھا۔ مگر جب طیارہ اسلام آباد بھی نہیں پہنچا تو اس نے ریڈیائی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ پڑوسی ممالک کے قریب ترین ایئرپورٹس سے بھی طیارے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔“

صبح آٹھ بجے انہوں نے ناشتہ دفتر ہی میں کیا۔ ناشتے کے بعد احمد نے فون پر متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کیا تو اسے بتایا گیا کہ دس بجے طیارے کی تلاش شروع کر دی جائے گی۔ تلاش کی اس مہم میں پی آئی اے کے طیاروں کے علاوہ فضائیہ کے طیاروں اور نیپلی کاپڑوں سے بھی مدد لی جائے گی۔ پڑوسی ممالک سے بھی درخواست کی گئی ہے کہ وہ اپنے طیاروں کے ذریعے سرحد کے قریبی پہاڑوں میں اس گم شدہ طیارے کی تلاش میں مدد کریں۔

”کیا مجھے تلاش میں جانے والے کسی جہاز یا نیپلی کاپڑ میں جگہ مل سکتی ہے؟“ ندیم نے احمد کی بات سننے کے بعد کہا۔

”معلوم کر لیتا ہوں۔ ویسے مشکل ہی لگتا ہے۔“ احمد نے کہا اور ایک بار پھر فون کا



قومی ایئر لائن اور پاک فضائیہ کے طیاروں اور پوما ہیلی کاپٹروں کے ذریعے تلاش کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن نتیجہ صفر ہی نکلا۔ دوسرے روز تلاش کا سلسلہ پھر جاری رہا۔ لیکن اس روز بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ تیسرے روز بھی موسم خراب ہونے کی وجہ سے تلاش کا کام جاری نہ رہ سکا۔ اس سے اگلے روز بھی موسم خراب ہی رہا۔ دودن کے وقفہ سے فضائی سرچ پارٹیاں دوبارہ روانہ ہوئیں تو تلاش کا دائرہ بڑھا دیا گیا۔ پڑوسی ممالک میں بھی تلاش کا کام جاری تھا۔ بعض علاقوں میں زمینی سرچ پارٹیاں بھی طیارے کی تلاش کا کام جاری رکھے ہوئے تھیں۔ اونچے پہاڑوں میں چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگوں تک بھی مختلف ذرائع سے اطلاع پہنچا دی گئی تھی اور وہ بھی اپنے طور پر طیارے کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔

طیارے کی تلاش تقریباً دس روز تک جاری رہی۔ لیکن اس کا کوئی سراغ تک نہیں ملا۔ سب ہی اس بات پر حیران تھے کہ طیارہ کہاں غائب ہو گیا۔ اگر کسی حادثے کا شکار ہوا ہو تا تو ہزاروں مربع میل کے علاقے میں تلاش کے دوران کہیں نہ کہیں اس کا ڈھانچہ ضرور ملتا یا کوئی ایسے آثار دکھائی دیتے جن سے پتہ چلتا کہ بد قسمت طیارہ یہاں گر کر تباہ ہوا ہے۔

تلاش کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ طیارے کی گمشدگی کے بارے میں ایک بار پھر مختلف باتیں سننے میں آرہی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ کسی فنی خرابی کی وجہ سے طیارہ اس طرح نیچے گر کر برس کے کسی بہت بڑے تودے میں دھنس کر ننگا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ برف نرم ہوتی ہے۔ لیکن وہ کوئی کھلونا تو نہیں تھا جو برف میں دھنس کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ دیو ہیکل جہاز تھا۔ اس کے برف میں دھنس جانے کو عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے تھے کہ طیارہ موسم کی خرابی کی وجہ سے راستہ بھٹک کر مقبوضہ کشمیر کی فضائی حدود میں چلا گیا تھا جہاں اسے بھارتی فضائیہ کے طیاروں نے مار گرایا تھا۔ لیکن اپنے اس جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے بھارتی فضائیہ کے طیارے بھی اس ”گمشدہ“ طیارے کی تلاش میں مدد دے رہے تھے۔

طیارے کے مسافروں کے بہت سارے رشتہ دار اور عزیز و اقارب اسلام آباد پہنچ چکے تھے۔ لیکن جب تلاش کا سلسلہ ختم ہو گیا تو بہت سے لوگ مایوس ہو کر واپس جا چکے

تھے۔ مگر..... کچھ لوگ اب بھی اسلام آباد میں موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یہ یقین تھا کہ اس بد قسمت گمشدہ طیارے پر سفر کرنے والے ان کے عزیز زندہ ہیں اور وہ اس امید پر بیٹھے ہوئے تھے کہ شاید کہیں سے کوئی اطلاع مل جائے۔ ندیم کو بھی نجانے کیوں یہ یقین تھا کہ اس کا بھائی اور طیارے کے دوسرے مسافر زندہ ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ طیارے میں کسی فنی خرابی کی وجہ سے پائلٹ نے کسی وادی میں کریش لینڈنگ کی کوشش کی ہوگی اور طیارہ کسی ایسی جگہ پر ہو گا جہاں سے اسے فضا سے نہیں دیکھا جاسکا ہوگا۔ ممکن ہے وہ دور دراز کا ایسا دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہو جہاں وہ لوگ پھنس کر رہ گئے ہوں اور بے یار و مددگار پڑے کسی کی مدد کا انتظار کر رہے ہوں۔

ندیم کی یہی سوچ تھی کہ اس نے خود طیارے اور اس کے مسافروں کو تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ احمد نے جب یہ سنا تو وہ سنائے میں آگیا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ احمد نے اسے گھورا۔ ”دنیا کے ان بلند ترین پہاڑوں میں جہاں کبھی انسان کے قدم نہیں پہنچے، تم طیارے کو تلاش کرنے جا رہے ہو۔ تم ان برف پوش پہاڑوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ راستے انتہائی دشوار گزار ہیں اور قدم قدم پر موت کا خطرہ ہے۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”میں آج ہی بد قسمت طیارے کے مسافروں کے ان عزیزوں سے بات کروں گا جو ابھی تک اسلام آباد میں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے دو چار آدمی ان میں سے بھی میرا ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔“

اور پھر اسی شام ندیم نے اسلام آباد میں اب تک مقیم طیارے کے رشتہ داروں کی مینگ طلب کر لی۔ یہ مینگ کلیم کے بنگلے میں بلائی گئی تھی۔ اس میں شریک ہونے والوں میں کینیڈا کا ایک جوڑا، ایک تزانہ کی رہنے والی عورت، ایک ترک عورت اور ایک مرد، تین جاپانی، دو فرانسیسی اور سات دیگر ممالک کے افراد شامل تھے۔ ندیم نے جب ان کے سامنے اپنا نقطہ نظر بیان کیا اور خود طیارے کی تلاش میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ لوگ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

”میں صرف یہ جانا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے کوئی میرا ساتھ دینا چاہتا ہے یا نہیں؟ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سوچ لیجئے کہ اس مہم میں قدم قدم پر موت کا سامنا ہو

گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ آ سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان برف پوش پہاڑوں میں کسی جگہ موت کے بھیانک ججزے میں پھنسے ہوئے ان لوگوں کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں جو زندگی کی آس لگائے بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں۔ رضا کارانہ طور پر جو اس مہم میں شریک ہونا چاہے وہ ہاتھ اٹھا دے۔“

چند لمحے سنا مارا۔ اس وسیع و عریض کمرے میں اس وقت تقریباً 35 افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن خاموشی اس قدر گہری تھی جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ وہ سب لوگ خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور پھر سب سے پہلے ہاتھ اٹھانے والی تنزانیہ کی مس کور ا تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے ہاتھ بھی اٹھنے لگے۔

☆

ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں خود ندیم تھا۔ جو غیر ملکی، گم شدہ طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش کی مہم میں شامل ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو مس کور ا تھی جس کا تعلق تنزانیہ سے تھا۔ مس کور ا بھائی تنزانیہ کے محکمہ سیاحت ہی سے وابستہ تھا۔ اور ایک وفد کے ساتھ سرکاری اور خیر سگالی کے دورے پر پاکستان آیا تھا لیکن وفد کے ساتھ واپس جانے کی بجائے وہ چند ہفتوں کے لئے یہیں رہ گیا۔ دنیا کی بلند ترین چوٹی کے ٹو، ننگا پربت اور راکا پوشی وغیرہ کے بارے میں اس نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ ان چوٹیوں کا فضائی نظارہ کرانے کے لئے سفاری فلائٹس چلتی ہیں تو اس نے کلیم کی ٹور آپریٹر ایجنسی کے ذریعے اس فلائٹ پر اپنے لئے سیٹ بک کروالی تھی۔

مس کور ا کو سی این این کی خبروں سے اس طیارے کی گمشدگی کا پتہ چلا تھا۔ اس سفاری فلائٹ کے مسافروں کی فہرست میں مس کور ا کے بھائی کا نام بھی شامل تھا۔ وہ چند روز تک ٹیلی فون کے ذریعے حکومت پاکستان کے متعلقہ شعبوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن جب کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تو اسلام آباد چلی آئی۔ اس دوران گمشدہ طیارے کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بالآخر جب سرکاری طور پر طیارے کی تلاش میں ناکامی کا اعلان کر دیا گیا تو اسے بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ اور اب ندیم نے جب طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش کے سلسلے میں اپنے عزائم کا اظہار کیا تو وہ بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئی۔

مس کور ا کی عمر 25، 26 سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ اگرچہ سیاہ فام تھی مگر اس کے چہرے کے نقوش بے حد پرکشش تھے۔ وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی اور عام طور پر اسکرٹ بلاؤز استعمال کرتی تھی۔ دو مہینے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک اس کے بھائی کا پتہ نہیں چل جاتا وہ واپس نہیں جائے گی۔ اسے

بھی ندیم کی طرح یقین تھا کہ اس کا بھائی مرا نہیں، زندہ ہے۔

دوسرے نمبر پر اس مہم میں شامل ہونے والی ایک فرانسیسی عورت مونیکا تھی۔ اس کا شوہر اس سفاری فلائٹ کے مسافروں میں شامل تھا۔ مونیکا بھی کئی روز پہلے اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر اسلام آباد گئی تھی۔ مونیکا تو اپنے شوہر کی تلاش کے سلسلے میں اس مہم میں شامل ہو گئی تھی لیکن اس کا دوست اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا اس لئے اس نے مہم میں شامل ہونے کی بجائے واپس جانے کو ترجیح دی تھی۔ مونیکا کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوئی اور مس کور کی طرح وہ بھی زیادہ ٹراسکرت بلاؤز ہی استعمال کرتی تھی جس سے اس کے جسم کے بیشتر حصے جھلکتے رہتے تھے۔

اس مہم کا تیسرا ممبر ریمینڈ تھا۔ وہ کینیڈا کے صوبے کیوبک کا رہنے والا تھا۔ اس کی بیوی کچھ عرصہ پہلے اپنے چند دوستوں کے ساتھ دنیا کی سیاحت پر نکلی تھی۔ ریمینڈ کو اپنی بیوی کا آخری خط پاکستان سے ملا تھا جو لاہور سے لکھا گیا تھا۔ ریمینڈ کی بیوی نے لاہور کے شالا مار باغ، بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، جہانگیر اور نور جہاں کے مقابر کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی عمارتوں کے بارے میں لکھا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ان تاریخی عمارتوں کے خوبصورت ویو کارڈز بھی بھیجے تھے اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دو تین روز میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد پہنچے گی جہاں سے وہ ایک سفاری فلائٹ کے ذریعے دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کا قریب سے فضائی نظارہ کرنے جائے گی۔ ریمینڈ کی بیوی نے کے ٹو اور ناٹکا پر بت کی چوٹیوں کے بارے میں بڑے جذباتی انداز میں اظہار خیال کیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے لاہور کی ایک ٹور آپریٹر ایجنسی کے ذریعے اسلام آباد سے سفاری فلائٹ پر سیٹ بک کروالی ہے۔ اس سفاری فلائٹ کا اہتمام اسلام آباد کی ایک پرائیویٹ ایجنسی کرتی ہے۔

یہ ریمینڈ کی بیوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا آخری خط تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد ریمینڈ نے بھی سی این این ہی کے توسط سے اس سفاری فلائٹ کی خبر سن لی تھی۔ اس کے تین چار روز بعد اسلام آباد سے اس کی بیوی کے ایک دوست کا فون بھی ملا تھا جس نے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ سرکاری طور پر گمشدہ طیارے کی تلاش جاری ہے لیکن ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا۔

ریمینڈ جب خود اسلام آباد پہنچا تو طیارے کی تلاش کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کیا تو اسے بتایا گیا کہ ایک دو روز میں سرکاری طور پر طیارے کی تلاش میں ناکامی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ حکومت سمجھتی ہے کہ طیارہ کسی ایسے علاقے میں گر کر تباہ ہو گیا ہے جہاں سے اسے تلاش کرنا ممکن نہیں رہا۔ حکومت بد قسمت طیارے کے مسافروں کے لواحقین کو معاوضے کی ادائیگی کا اعلان بھی کرنے والی ہے۔

ریمینڈ کو بھی بعض دوسرے لوگوں کی طرح یقین تھا کہ سفاری طیارہ تباہ نہیں ہوا۔ اس کے مسافر زندہ ہیں۔ اس کی بیوی بھی زندہ ہے۔ اس لئے جب ندیم نے اس مہم کا اعلان کیا تو وہ بھی اس میں شامل ہو گیا۔

ریمینڈ کی عمر 38 سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ ایک صحت مند اور طویل قامت آدمی تھا۔ کالج کے زمانے میں کبھی اسے کوہ پیما کی کا شوق رہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے علاقے میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سر کر تا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ یو کون چلا گیا تھا۔ یہ میکزی پیمازی سلسلہ تھا اور یہاں بلند ترین پہاڑی چوٹی دو ہزار سات سو اٹھاون میٹر بلند تھی جسے اس نے سر کیا۔ اس طرح اس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ وہ مونٹریال کوہ پیما کی کے ایک انٹرنیشنل کلب میں شامل ہو گیا۔ اس کلب کی مختلف ٹیموں کے ساتھ وہ مختلف ممالک میں پہاڑی چوٹیاں سر کرنے جاتا رہا۔ پھر ایک سال پہلے اسے اپنے کلب کی طرف سے اطلاع ملی کہ کلب کی ایک پانچ رکنی ٹیم پاکستان میں واقع دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹی کے ٹوسر کرنے کے لئے روانہ ہونے والی ہے۔ ریمینڈ کو بھی اس ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں مونٹریال پہنچ جائے۔ کیوبک مونٹریال سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہ ایک ہفتہ تو اسے تیاری کے لئے دیا گیا تھا۔ لیکن ریمینڈ کی بد قسمتی تھی کہ وہ ان دنوں بیمار تھا۔ ڈاکٹر نے اسے کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا اور ریمینڈ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اور اب قدرت نے اسے ایک اور موقع فراہم کیا تھا۔ کے ٹو یا ناٹکا پر بت کو سر کرنا نہ سہی البتہ وہ بھی اس کے قریب تو جاسکتا تھا بیوی کی تلاش کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کی ان عظیم ترین چوٹیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس لئے وہ بھی ندیم کی اس مہم میں شامل ہو گیا۔

اس ٹیم کی چوتھی ممبر جاپانی عورت تھی۔ اسے عورت کی بجائے لڑکی کہنا ہی مناسب ہو گا۔ کیونکہ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا باپ اس سفاری فلائٹ میں تھا۔ اس کے ساتھ اس کا منگیتر ٹوکیو سے یہاں آیا تھا لیکن اس نے اس مہم میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا تو ٹوکیو میں کاروبار کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

چیکو بے حد حسین لڑکی تھی۔ عام جاپانی لڑکیوں کی طرح اس کے رخسار تو کسی قدر ابھرے ہوئے تھے لیکن ناک چکی ہوئی نہیں تھی اور قد بھی عام جاپانی لڑکیوں کے مقابلے میں کسی قدر لمبا تھا۔ وہ سرمایہ دار باپ کی بیٹی تھی۔ اس نے اس مہم میں پچاس فیصد اخراجات کی بھی پیشکش کی تھی۔

اس ٹیم کا پانچواں ممبر ایک بھارتی باشندہ تھا۔ پانڈے جنوبی ہند کا رہنے والا تھا لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر سپائے میں گزرا تھا۔ وہ ایک کاروباری آدمی تھا اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں دنیا کے مختلف ممالک کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی مرتبہ پاکستان آچکا تھا۔ اس کے کچھ رشتہ دار کراچی میں تھے اور ایک خالہ راولپنڈی میں بھی رہائش پذیر تھی۔ اس کی بہن اور بہنوئی اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے دو ماہ پہلے پاکستان آئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ کراچی میں گزارنے کے بعد پندرہ روز پہلے راولپنڈی آئے تھے۔ چند روز تک وہ مری، ننھیال، بھورین اور کاغان وغیرہ کی سیر کرتے رہے۔ پھر گلگت اور ہنزہ وغیرہ کی سیر کا شوق چرایا۔ اور جب انہیں یہ پتہ چلا کہ راکا پوشی اور نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں کا فضائی نظارہ کروانے کے لئے سفاری فلائٹس بھی چلتی ہیں تو انہوں نے بھی کلیم کی ٹور آپریٹر ایجنسی کے ذریعے اس فلائٹ پر سیشن بک کروالی تھیں اور اس طرح طیارے کے ساتھ وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔

پانڈے ان دنوں دہلی میں تھا۔ اس نے بھارتی ٹیلی ویژن پر ایک پاکستانی طیارے کے لا پتہ ہونے کی خبر سنی تھی۔ لیکن اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن دوسرے روز راولپنڈی سے اس کی خالہ نے فون پر اطلاع دی کہ اس سفاری فلائٹ پر اس کے بہن اور بہنوئی بھی تھے۔ پانڈے چوتھے دن راولپنڈی پہنچ گیا۔ اسے پتہ چلا کہ تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن طیارے کی تلاش میں ناکامی کے اعلان کے ساتھ ہی وہ مایوس ہو گیا تھا۔ مگر

جب اسے پتہ چلا کہ ندیم غیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش کے سلسلے میں ایک مہم ترتیب دے رہا ہے تو وہ بھی اس مہم میں شریک ہو گیا۔

پانڈے کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا ایک صحت مند آدمی تھا۔ رنگت سانولی اور بال گھٹنگریالے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے بھی اس مہم کے اخراجات میں رضاکارانہ طور پر کچھ رقم دینے کی پیشکش کی تھی۔ اسے بھی مہم میں شامل کر لیا گیا تھا۔

ٹیم میں شامل ہونے والے باقی دو ممبر پاکستانی تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق لاہور سے تھا اور دوسرا فیصل آباد کا رہنے والا تھا۔ ان کے عزیز بھی اس سفاری فلائٹ پر سوار تھے۔ ان میں ایک کا نام محسن تھا۔ وہ لاہور کا رہنے والا تھا۔ دوسرا فیصل آباد کا رہنے والا راشد تھا۔ وہ دونوں جوان اور صحت مند تھے۔ مگر انہیں پہاڑوں پر چڑھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے عزیزوں کی تلاش کے لئے اس مہم میں شامل ہو گئے تھے کیونکہ انہیں بھی یقین تھا کہ ان کے عزیز زندہ ہیں اور پہاڑوں میں کسی جگہ پھنسے ہوئے ہیں۔

ٹیم مکمل ہو چکی تھی۔ اب روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریمینڈ کو کوہ پیما کی تجربہ تھا۔ اس لئے ایسی چیزوں کی خریداری اس کے سپرد کر دی گئی جو اونچے پہاڑوں پر سفر کے دوران کام آسکتی تھیں۔

کلیم کا آفس مینجر احمد بھی ایسی چیزوں کی خریداری میں مصروف تھا جو اس مہم میں کام آسکتی تھیں۔ ہر قسم کی خریداری مکمل کرنے کے بعد شمالی علاقہ جات کے نقشوں کے ذریعے ان علاقوں کا تعین کیا جانے لگا جہاں جہاز کی کریش لینڈنگ یا گرنے کے امکانات زیادہ تھے۔

اس مہم کے لئے ممبروں کے انتخاب ہوتے ہی ندیم نے حکومت سے مہم کی اجازت حاصل کرنے کے لئے متعلقہ محکمے کو درخواست دے دی تھی۔ محض سیاحت کے لئے کسی علاقے میں جانا اور بات تھی لیکن ایک خاص مقصد کے لئے مہم لے کر جانا دوسری بات تھی۔

اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے ندیم کو خاصی دشواریاں پیش آئیں۔ اسے کئی متعلقہ محکموں کے چکر لگانا پڑے اور بالآخر اسے اجازت نامہ مل ہی گیا۔

گلت شہر اور اس کے آس پاس قریبی علاقوں کی سیر کر سکتے تھے۔ انہیں گیسٹ ہاؤس کی ایک جیب اور گائیڈ بھی فراہم کر دیا گیا تھا۔

گلت..... پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ خوبصورت شہر دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ دریا پر لکڑی کے تختوں کا پل بنا ہوا ہے جسے لوہے کے موٹے موٹے اور مضبوط رسوں سے سہارا دیا گیا ہے۔ پل کے دونوں طرف پتھروں کے خوبصورت محرابی دروازے بنے ہوئے ہیں۔ گلت شہر کے لئے یہ پل شہر رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے دونوں محرابی دروازوں پر حفاظتی چوکیاں بھی قائم ہیں۔

دنیا کی عظیم ترین شاہراہ ریشم بھی گلت ہی سے ہو کر گزرتی ہے۔ ندیم کے غیر ملکی مہمان کچھ دیر شہر میں گھومتے رہے۔ پھر گائیڈ انہیں جیب میں بٹھا کر تاج مغل کی فتح کی یادگار دکھانے کے لئے لے گیا۔ یہ یادگار گلت شہر سے گیارہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ لیکن جیب پر یہ مختصر سا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوا۔ پہاڑی راستے خاصے دشوار گزار تھے۔ اس علاقے میں صرف ماہر اور محتاط ڈرائیور ہی جیب چلا سکتا تھا۔

اس علاقہ میں استعمال ہونے والی چیمپوں کی باڈی خاص طور پر تیار کی جاتی تھی اور سیشیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش نکل سکے۔ گائیڈ جیب میں بیٹھے ہوئے مہمانوں کو راستے میں آنے والے مختلف مقامات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ راستے میں پہاڑوں پر جگہ جگہ بدھ کارونگ تھیں اور گائیڈ انہیں بتا رہا تھا کہ ہزاروں سال پہلے یہ علاقہ بھی بدھ تہذیب کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ تاج مغل کی فتح کی یادگار تک پہنچنے کے لئے انہیں جیب سے اتر کر بہت دور تک پیدل چلنا پڑا۔ ترائے ہوئے پہاڑی پتھروں کی چوکور ٹاور کی شکل کی یہ یادگار تقریباً سات سو سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ موسم کے تغیرات اور امتداد زمانہ اگرچہ اس عمارت پر بھی اثر انداز ہوا تھا لیکن اسے زیادہ متاثر نہیں کر سکا تھا۔ ٹاور نما چوکور عمارت کی شان و شوکت اب بھی قائم تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک آس پاس کے پہاڑی علاقوں میں گھومتے رہے۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ ان کے چاروں طرف خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ واپسی کے سفر کے دوران انہوں نے ایک دو لو مڑیاں، جنگلی بلیاں اور مارخور بھی دیکھے تھے۔ گائیڈ نے انہیں بتایا کہ وادی گلت کے پہاڑوں میں بر فانی چیتے، مار کو پولو بھیڑیے اور ریچھ بھی بکثرت پائے

سارا سامان کئی روز پہلے ہی بھجوا دیا گیا اور پھر وہ لوگ بھی ایک روز ہوائی جہاز سے گلت پہنچ گئے۔ احمد بھی ان کے ساتھ تھا۔ صرف ایک گھنٹے کی پرواز تھی۔ ٹیم کے تمام ممبروں کو کلیم ہی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کی شان و شوکت دیکھ کر ندیم حیران رہ گیا۔ پہلی مرتبہ جب وہ یہاں آیا تھا تو یہ گیسٹ ہاؤس صرف ایک پرانی مکان نما عمارت میں قائم تھا۔ اس میں صرف چند کمرے تھے۔ لیکن پرانی عمارت کا اب نام و نشان تک نہیں تھا۔ سرسبز پہاڑی کے دامن میں تراشے ہوئے پہاڑی پتھروں سے تعمیر شدہ یہ گیسٹ ہاؤس وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ عمارتوں کے چار بلاک تھے جن کے وسط میں بہت ہی خوبصورت لان تھا جس کے وسط میں سنگ مرمر کا حوض تھا جس کے بیچ میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ ایک بلاک کے پیچھے سوسنگ پول بھی تھا۔ ایک عمارت کی چھت پر ڈش اینٹیاں بھی لگا ہوا تھا۔ ہر کمرے میں رنگین ٹی وی سیٹ اور ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ کمروں کا فرنیچر نہایت قیمتی، خوبصورت اور آرام دہ تھا۔ آسائش اور شان و شوکت میں یہ گیسٹ ہاؤس کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھا۔ اس میں اگرچہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی تمام تر سہولتیں موجود تھیں مگر محکمہ سیاحت اور دیگر متعلقہ محکمہ نے اسے ابھی تک فائیو اسٹار تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کلیم نے اس کے لئے کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اسے صرف اپنے بزنس سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنے مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ آسائش اور سہولتیں فراہم کرنے کی فکر میں رہتا تھا تا کہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ معاوضہ وصول کر سکے اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ یہ گلت کا سب سے بہترین گیسٹ ہاؤس تھا۔ کلیم کی چار ٹرڈ فلائٹ سے آنے والے سیاح تو ظاہر ہے یہیں ٹھہرتے تھے مگر قومی ایئر لائن کی فلائٹس، جیپوں اور دیگر ذرائع سے آنے والے بیشتر سیاح بھی اسی گیسٹ ہاؤس کا رخ کرتے تھے۔

گیسٹ ہاؤس کے مینجر عبدالقیوم کو ان کی آمد کی اطلاع ایک روز پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے مہمانوں کے لئے کمرے تیار کر رکھے تھے۔ کچھ دیر اپنے اپنے کمروں میں گزارنے کے بعد وہ سب میٹنگ ہال میں جمع ہو گئے اور ایک بار پھر میز پر نقشہ پھیلا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد غیر ملکی مہمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو

جاتے ہیں۔ خوش رنگ پرندوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

ایک جگہ ریمینڈ نے ڈرائیور کو جیپ روک لینے کو کہا۔ جیپ رکتے ہی وہ اچھل کر نیچے اتر آیا اور کیمبرہ سنبھال کر چند گز سامنے سڑک پر سے گزرنے والی خواتین کی تصویر کھینچنے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ تین قبائلی عورتیں تھیں جو اپنے علاقے کا مخصوص لباس پہنے بھیڑوں کے ایک گلے کو ہانکتی ہوئی چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی کی طرف جارہی تھیں۔ دو عورتوں نے اپنی اپنی گود میں بھیڑوں کے بچے اٹھار کھے تھے۔ ریمینڈ نے جیسے ہی کیمبرہ درست کیا، گائیڈ جیپ سے چھلانگ لگا کر دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”مسٹر ریمینڈ!“ گائیڈ اس کے کیمبرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ یورپ نہیں، پاکستان کا ایک پسماندہ علاقہ ہے۔ یہاں سیدھے سادھے اور بہت ہی سادہ لوح قبائل رہتے ہیں۔ یہ لوگ شہر کی رنگینیوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ بہت حساس اور غیور لوگ ہیں۔ کسی غیر مرد کا اپنی عورتوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ بعض اوقات ایسی باتوں پر یہاں قتل بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں درخواست کروں گا کہ اجازت کے بغیر آئندہ کسی عورت کی تصویر لینے کی کوشش مت کیجئے۔ پلیز!“

”سوری مسٹر گائیڈ!“ ریمینڈ نے کہا۔ ”مجھے یہاں کے رسم و رواج کا علم نہیں تھا۔ آئندہ کسی کو شکایت نہیں ہوگی۔“ اس نے کیمبرہ فولڈ کر کے کیس میں بند کر لیا۔

”وہیے یہ لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ اپنے دوستوں، ہمدردوں اور مہمانوں کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔“ گائیڈ نے بتایا۔

”اس کا مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔“ ریمینڈ نے کہا۔ ”جب ہم بازار کی سیر کر رہے تھے تو یہاں کا ہر شخص ہماری خدمت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی ہمیں قبوہ پیش کر رہا تھا، کوئی پھل کھلانا چاہتا تھا اور کوئی کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔“

وہ لوگ جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ شہر کی طرف چل پڑی۔ جب وہ لوگ گیٹ ہاؤس میں پہنچے تو پتہ چلا کہ ندیم اور احمد بعض مقامی لوگوں سے ملنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی تقریباً آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ ندیم نے بتایا کہ وہ کچھ ایسے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو بد قسمت طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش کے سلسلے میں ان کی مدد کو تیار ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ نو بجے یہاں پہنچ جائیں گے اور

پھر ان سے پروگرام طے کیا جائے گا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر میٹنگ ہال میں جمع تھے۔ اس وقت ان کے ساتھ شہر کے چند آدمیوں کے علاوہ گلگت ایئر پورٹ کا ایک ذمہ دار آفیسر بھی موجود تھا۔ ایک بار پھر میز پر نقشے پھیلائے گئے۔ ایک نقشہ ایسا بھی تھا جس میں گلگت، سکر دو اور اسلام آباد کے ہوائی راستوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ نقشہ ایئر پورٹ کا آفیسر لایا تھا۔ دوسرے نقشوں پر کئی جگہوں پر سرخ پینسل سے نشانات لگے ہوئے تھے۔ ان نقشوں کو دیکھ کر ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ آخر میں گلگت ایئر پورٹ کے آفیسر نے اپنے ساتھ لائے ہوئے نقشے پر ایک باریک سرخ لکیر پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ سرخ لکیر آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ ہوائی راستہ ہے جو سفاری فلائٹس کے لئے مخصوص ہے۔ اسلام آباد سے آنے والی قومی ایئر لائن کی عام فلائٹ وادی کاٹناں پر سے ہوتی ہوئی نانگا پربت سے خاصے فاصلے سے گزر کر گلگت پہنچتی ہے۔ اس عام فلائٹ کا روٹ یہ ہے۔“ اس نے سرخ رنگ کی ایک ایسی لکیر کی طرف اشارہ کیا جو اسلام آباد سے تقریباً سیدھی چلی گئی تھی۔ ”لیکن یہ وہ راستہ ہے۔“ اس نے بل کھاتی ہوئی سرخ لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سفاری فلائٹ کا روٹ ہے۔ یہ پرواز اسلام آباد سے ٹیک آف کر کے مظفر آباد کے اوپر سے گزر کر مقبوضہ کشمیر کی سرحد کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی ہوئی وادی وزارت کے اوپر سے گزر کر نانگا پربت کے گرد چکر لگا کر اس راستے سے گلگت آ جاتی ہے یا پروگرام کے مطابق سکر دو کی طرف چلی جاتی ہے۔ اگر یہ سفاری فلائٹ گلگت ایئر پورٹ سے ٹیک آف کرے تو جالبپور قصبے کی فضا میں دریائے سندھ عبور کر کے چھبیس ہزار چھ سو ساٹھ فٹ بلند نانگا پربت کے اوپر سے اور پہلو سے چکر لگا کر وزارت کی وادی سے گزر کر مقبوضہ کشمیر کی سرحد کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی ہوئی اسلام آباد کی طرف چلی جاتی ہے۔“ وہ آفیسر چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”گلگت سے ٹیک آف کرنے کے چند منٹ بعد سفاری فلائٹ کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے منقطع ہو گیا تھا۔ طیارے کی رفتار اور ٹائمنگ سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ طیارہ اس دوران نانگا پربت کے قریب پہنچ چکا ہو گا۔ اس نے چوٹی کے گرد پہلا چکر شروع کر دیا ہو گا۔ اگر آپ لوگ طیارے کی تلاش کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں تو اسٹور کو اپنا بیس بنائیے۔ یہ چھوٹی

قیم کیا۔ اور پھر دریائے انڈس کا پل عبور کر کے دانشمن کی طرف روانہ ہو گئے۔ گلگت سے رام گھاٹ تک انہوں نے شاہراہ ریشم پر سفر کیا تھا۔ دریا کا پل بھی بہت شاندار تھا لیکن دریا پار کرتے ہی انہوں نے شاہراہ ریشم چھوڑ دی۔ دشمن کی طرف جانے والی سڑک بہت ہی دشوار گزار اور نیم پختہ تھی۔ اس سڑک پر جیپ کی رفتار دس پندرہ میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں تھی۔ قدم قدم پر نہایت خطرناک موڑ اور ہزاروں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ ڈرائیور کی معمولی سی غلطی انہیں موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ بالآخر وہ لوگ استور پہنچ گئے۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ دریا کے کنارے پر واقع استور نامی یہ بستی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بالکل سامنے نانگا پربت کی برف میں ڈھکی ہوئی فلک بوس چوٹی نظر آرہی تھی۔ دنیا بھر سے کوہ پیما چوٹی کو سر کرنے یہاں آتے تھے۔ خوش نصیب تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے اور چوٹی پر اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتے۔ لیکن ایسے کوہ پیماؤں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی جو اس عظیم چوٹی کو سر کرنے کی حسرت دل میں لئے موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ چوٹی سر کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے والے بعض کوہ پیماؤں کی لاشیں تو مل جاتیں جبکہ بعض لوگ کسی گہرے کھڈ میں گر کر ختم ہو جاتے اور ان کی لاشیں لگانا بھی مشکل ہو جاتا۔ ان کے ڈھانچے اب بھی ان پہاڑوں میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں گے۔

استور نامی یہ گاؤں اگرچہ نانگا پربت کے دامن میں تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے برف پوش چوٹی سینکڑوں میل دور ہو۔ اگرچہ مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا لیکن موسم میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ چیکو، مس کورا، اور مس مونیکا کو زیادہ سردی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تینوں سکرٹ بلاؤز میں تھیں اور ظاہر ہے یہ لباس انہیں سردی سے نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ احمد کے مشورے پر انہوں نے اسلام آباد سے کچھ گرم کپڑے خرید لئے تھے۔

استور میں ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس بھی تھا جو ان دنوں خالی پڑا ہوا تھا۔ چار کمروں پر مشتمل وہ ریسٹ ہاؤس انہیں مل گیا۔ اور وہ دوسری جیپ سے سامان اتار کر ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں پہنچانے لگے۔ جیپ سے صرف ضرورت کا سامان اتارا گیا تھا کیونکہ ان کا ارادہ تھا کہ رات یہاں بسر کرنے کے بعد وہ آگے روانہ ہو جائیں گے اس لئے دوسرا

سی بستی نانگا پربت کے دامن میں واقع ہے۔ لیکن وہاں تک رسائی بہت مشکل ہو گی۔ جیپ آپ کو زیادہ سے زیادہ دریائے انڈس تک لے جائے گی۔ وہاں سے سڑک تو انڈس کے ساتھ ساتھ چیلان، سازن، جکوت، پتن، بشام اور مانسہرہ سے ہوتی ہوئی ایبٹ آباد کی طرف چلی جاتی ہے۔ لیکن آپ کو انڈس کے کنارے واقع رام گڑھ نامی بستی سے کسی اور سواری کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے! ہم یہی راستہ اختیار کریں گے۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ان میں کچھ دیر مزید صلاح مشورے ہوتے رہے۔ پھر میننگ ختم کر دی گئی۔

پروگرام کے مطابق انہیں ایک دن کے بعد روانہ ہونا تھا۔ ایک مقامی آدمی بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ گلگت میں شیناز بان بولی جاتی تھی اور مہم کے ممبران میں سے کوئی بھی شیناز بان نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے ایک مقامی باشندے کو ساتھ لے لیا گیا تھا۔ بڑے قصبوں اور شہروں میں تو اردو اور کسی حد تک انگریزی بھی سمجھ لی جاتی تھی۔ لیکن پہاڑوں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں میں شینا کے علاوہ بعض دیگر مقامی زبانیں بھی بولی جاتی تھیں۔ اردو کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ اس مقامی باشندے کو ساتھ لینے کا مقصد یہی تھا کہ مترجم کا کام دے سکے۔

دوسرا دن انہوں نے دیگر چھوٹی موٹی تیاریوں اور سیر و تفریح میں گزارا۔ رات کو پچھ پانچ بجے ہوئی رہی۔ اس سفر کے لئے دو جیپوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک جیپ میں سامان کے علاوہ تین آدمی اور مس کورا بھی بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ دوسری جیپ میں ندیم، ریمینڈ، مس مونیکا اور جاپانی لڑکی مس چیکو بیٹھی تھی۔

وہ لوگ صبح کی روشنی پھیلتے ہی اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔ گلگت سے چن گڑھ تک کا راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ ان کے دائیں طرف ہر اموش کی چوہیں ہزار تین سو فٹ بلند چوٹیاں تھیں جو برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بڑا دلکش منظر تھا۔ لیکن ریمینڈ پر تو عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ کوہ پیما تھا اور اب تک چھوٹی چھوٹی پہاڑی چوٹیوں تک ہی محدود رہا تھا۔ لیکر کسی بڑی چوٹی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس پر کچھ عجیب سی سنسنی طاری ہو رہی تھی۔

نبی سے ہوتے ہوئے وہ رام گھاٹ پہنچ گئے۔ دریائے انڈس کے کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کی آبادی چند سو نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں انہوں نے تقریباً ایک گھنٹہ



سامان جیب ہی میں رہنے دیا گیا تھا۔

انہیں دیکھ کر گاؤں کے بہت سے لوگ ریٹ ہاؤس کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان مرد بھی۔ نوجوانوں کی نظریں جیکو، مس مونیکا اور مس کوراکا طواف کر رہی تھیں۔ جبکہ بچے حیرت سے کبھی ان لوگوں کو اور کبھی چپوں اور ان میں لدے ہوئے سامان کو دیکھنے لگے۔

ندیم نے گاؤں کے ایک معتبر آدمی رؤف خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ رؤف کی عمر ستر سے کچھ اوپر ہی تھی۔ اس کی لمبی داڑھی اور سر کے بال ناگہا پر بت کی چوٹی پر جمی ہوئی برف کی طرح سفید تھے۔ لیکن صحت قابل رشک تھی۔

”آپ لوگوں نے اس طرف آکر غلطی کی ہے۔“ رؤف خان نے شیناز بان میں کہا۔ وہ اردو کے بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ استعمال کر رہا تھا جس سے اس کی بات کا مفہوم سمجھ میں آ رہا تھا۔ ”ناگہا پر بت کی چوٹی سر کرنے کے لئے یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ کوہ پیما میس عام طور پر مشرقی سمت میں بیس کیمپ قائم کرتی ہیں اور اسی طرف سے چوٹی کی طرف چڑھائی کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔“

”ہم یہاں چوٹی سر کرنے نہیں آئے۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”تقریباً ایک مہینے پہلے اس علاقے پر پرواز کے دوران ایک ہوائی جہاز لاپتہ ہو گیا تھا۔ ہم اس بد قسمت طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔“

”اوہ!“ رؤف خان کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس بد قسمت طیارے کو آخری مرتبہ اس چوٹی کے اوپر سے جنوب مشرق کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا تھا کہ وہ طیارہ کہیں غائب ہو گیا۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھ رہے ہیں کہ جہاز کہیں گر کر تباہ ہو گیا ہے اور اس کے مسافروں میں کوئی بھی زندہ نہیں بچا ہو گا۔ اگر کوئی بچ بھی گیا ہو گا تو ان پہاڑوں کے سناٹے، رات کے وقت سردی کی شدت یا جنگلی جانوروں نے اسے ختم کر دیا ہو گا۔ ان پہاڑوں میں برفانی ٹانگہ اور بہت سے دوسرے خونخوار جانور بکثرت پائے جاتے ہیں جو انسانوں کو چر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔“

”وہ جہاز کہیں گر کر تباہ نہیں ہوا۔“ ندیم نے کہا۔ ”اگر جہاز کہیں گرا ہو تا تو اس کا

ڈھانچہ کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا۔ دس دن تک فضا سے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں سے اسے تلاش کیا جاتا رہا ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ کسی فنی خرابی کی وجہ سے جہاز نے ان پہاڑوں میں کسی جگہ کریش لینڈنگ کی ہوگی اور وہ کسی ایسی جگہ پر کھڑا ہے جہاں سے اسے فضا سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ کسی بہت بڑی چٹان کے سائے میں یا کہیں گھنے درختوں میں۔ اس کے مسافر کسی ایسی جگہ پر پھنس گئے ہیں جہاں سے نہ تو وہ باہر نکل سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دیگر ذریعے سے بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ زندہ ہیں اور کسی جگہ پر پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم انہی کی تلاش میں نکلے ہیں۔“

”کئی روز پہلے ایک سرچ پارٹی اس طرف بھی آئی تھی۔ ہماری بستی کے چند نوجوان بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ لیکن وہ پارٹی دن بھر میں یہاں سے صرف پندرہ میل ہی کا فاصلہ طے کر پائی تھی۔ رات کو انہوں نے ایک چٹان کے دامن میں کیمپ لگا دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی طیارے کی تلاش میں آگے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن صبح سویرے ایک برفانی چیتے نے ان کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔ چیتا ایک خیمے میں گھس گیا تھا جس میں چار آدمی سو رہے تھے۔ چیتے نے چاروں آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ تین تو معمولی زخمی ہوئے تھے مگر چوتھے کو چیتا دبوچ کر خیمے سے باہر لے گیا۔ چیتا اپنے شکار کر گھیٹ کر پہاڑی میں کہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن شور کی آواز سن کر دوسرے خیموں میں سوئے ہوئے آدمی باہر نکل آئے۔ انہوں نے رائفلوں سے ہوئی فائرنگ شروع کر دی۔ برفانی چیتا اپنا شکار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لیکن وہ آدمی شدید زخمی ہوا تھا۔ چیتے نے اس کے جسم کو جگہ جگہ سے بری طرح ادھیڑ ڈالا تھا۔ سرچ پارٹی والے اپنے زخمی ساتھیوں کو لے کر بڑی مشکل سے یہاں تک آئے تھے۔ شدید زخمی ہونے والا شخص اب بھی گلگت کے ہسپتال میں داخل ہے۔“

”اوہ!“ ندیم نے بوڑھے کی بات سن کر کہا۔ ”لیکن ہم نے تو اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔“

”ہو سکتا ہے حکومت نے اس خبر کو دبا دیا ہو۔ بہر حال!“ بوڑھا رؤف کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”پہلے میں آپ لوگوں کے لئے کھانے وغیرہ کا بندوبست کروں اس کے بعد تفصیل سے باتیں کریں گے۔“

بھی ان کے ساتھ تھا۔ ریٹ ہاؤس میں آنے کے بعد ایک بار پھر طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش کے حوالے سے باتیں شروع ہو گئیں۔ رؤف خان انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ اپنی اس مہم کو یہیں پر ختم کر دیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ آگے انہیں قدم پر موت کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن ندیم نے بتایا کہ اس ٹیم میں شامل ہر ممبر کا کوئی نہ کوئی عزیز اس طیارے پر سوار تھا۔ اور یہ سب لوگ انہیں تلاش کرنے کا مقصد ساتھ ہی لے کر نکلے ہیں اور اپنے ارادے سے باز نہیں آسکتے۔

تو پھر بوڑھے رؤف نے کہا۔ ”یہاں سے آگے آپ لوگوں کو خچروں پر سفر کرنا ہوگا۔ جیپ یہاں سے آگے نہیں جاسکتی۔ اس بستی سے آپ کو چند خچر کرائے پر مل سکتے ہیں۔“ ”ٹھیک ہے!“ ندیم نے جواب دیا۔ ”خچروں کے علاوہ ہمیں تین چار مضبوط قسم کے نوجوانوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ ہم انہیں معقول معاوضہ دیں گے۔“

”سارا بندوبست ہو جائے گا۔“ رؤف خان نے کہا۔ ”لیکن کل کا دن تو آپ لوگوں کو یہیں گزارنا ہوگا۔ ایک تو میرا پوتا قابوس خان آپ کے ساتھ جائے گا۔ اسے بھی آپ کی طرح مہم جوئی کا بہت شوق ہے۔ البتہ دوسرے نوجوانوں کو راضی کرنا پڑے گا۔ بر فانی چیتے کے ہاتھوں سرچ پارٹی کے آدمیوں کے زخمی ہونے کے بعد سب لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی ان پہاڑوں کی طرف جانے کو تیار نہیں۔ انہیں آمادہ کرنا پڑے گا۔“ ”ٹھیک ہے!“ ندیم نے سر ہلایا۔ ”اگر کل کا دن یہیں گزارنا ہے تو پھر صبح ہی سارا پروگرام طے کیا جائے گا۔“

رؤف خان کچھ دیر اور وہاں بیٹھا رہا اور پھر ریٹ ہاؤس سے نکل کر بستی کی طرف چلا گیا۔ ندیم اور ریمینڈ کمرے میں بیٹھے تھے کہ چیکو دھڑ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ خیریت ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”مس مونیکا غائب ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔“ چیکو نے کہا۔

”کیا...؟“ ندیم اور ریمینڈ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ دونوں بدحواس ہو کر باہر کی طرف دوڑے۔

”ذرا ایک بات کا خیال رکھنا۔“ ندیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھیوں میں سے کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ بر فانی چیتے نے کسی سرچ پارٹی پر حملہ کیا تھا۔“

”مطمئن رہو! ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔“ بوڑھے رؤف نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ندیم بھی باہر آگیا۔ اس کے ساتھی برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چیکو، مس مونیکا اور مس کورانے گرم شالیں لپیٹ رکھی تھیں اور اس کے باوجود وہ سردی محسوس کر رہی تھیں۔ برآمدے کے سامنے ریٹ ہاؤس کے لان میں اب بھی بہت سے بچے اور نوجوان موجود تھے۔

شام کا اندھیرا اب کچھ گہرا ہو گیا تھا۔ برف میں ڈھکی ہوئی ناگ پربت کی چوٹی بڑا سنسنی خیز منظر پیش کر رہی تھی۔ ریمینڈ اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ساتھی ناگ پربت ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد رؤف خان نے آکر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ انہیں کھانا کھانے کے لئے رؤف خان کے گھر ہی جانا تھا۔ رؤف نے دو آدمی ان کے سامان کی دیکھ بھال کے لئے ریٹ ہاؤس میں چھوڑ دیئے اور ان لوگوں کو لے کر اپنے گھر چلا آیا۔ ایک بڑے کمرے میں بھڑکی اون کا ہاتھ سے بنا ہوا مندمہ بچھا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ کھانا اگرچہ جلدی میں تیار کیا گیا تھا لیکن بے حد لذیذ تھا۔ بھڑکا بھنا ہوا گوشت تو سب کو پسند آیا تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے زیادہ تر یہ گوشت ہی کھایا تھا۔ کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ریمینڈ کے لئے یہ انکشاف خاصا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ بوڑھا عبدالرؤف جوانی میں تین مرتبہ ناگ پربت سر کر چکا ہے۔ وہ غیر ملکی کوہ پیماؤں کی کئی جماعتوں میں مزدور کی حیثیت سے شامل رہا ہے اور تین مرتبہ اس نے چوٹی کو سر کیا ہے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے رؤف اچھی خاصی انگریزی بھی بولتا تھا۔ ریمینڈ کرید کرید کر اس سے اس کی مہمات کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اسے رؤف پر رشک آرہا تھا۔

کھانے کے بعد تھوے کا دور چلا اور پھر وہ لوگ ریٹ ہاؤس میں آگئے۔ رؤف خان

ہے۔ کسی زمانے میں یہ کیمین شکاریوں کے استعمال میں رہتا تھا۔ لیکن جب سے جانوروں کے شکار پر پابندی لگی ہے وہ کیمین ویران پڑا ہے۔ ممکن ہے لڑکی اس طرف نکل گئی ہو اور زر کے مارے اس ویران کیمین میں دبکی بیٹھی ہو۔“ رؤف خان نے شمالی سمت ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

☆

ریسٹ ہاؤس بستی سے قدرے فاصلے پر واقع تھا۔ جیکو اور مس کوراکور ریسٹ ہاؤس میں چھوڑ دیا گیا اور ندیم اور اس کے ساتھی ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف پھیل کر مس موزیکا کو تلاش کرنے لگے۔ ریسٹ ہاؤس بستی سے قدرے ہٹ کر واقع تھا۔ اس کی پشت پر پہاڑی ڈھلان تھی جہاں چنار، پائن، بید اور دیگر ہزاروں اقسام کے پودوں اور فلک بوس درختوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس سے آگے بلند پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

چاندنی رات تھی۔ نقرئی چاندنی میں ماحول بڑا پرسرار لگ رہا تھا۔ وہ لوگ چاروں طرف موزیکا کو پکارتے ہوئے اسے تلاش کر رہے تھے۔ پہلے تو ان لوگوں نے یہی سوچا تھا کہ ممکن ہے موزیکا کسی فطری ضرورت کے تحت ریسٹ ہاؤس سے نکل کر قریب ہی کہیں گئی ہو۔ لیکن جب اس کا کچھ پتہ نہیں چلا تو بستی میں رؤف خان کو اطلاع کر دی گئی۔ ان واحد میں یہ خبر پوری بستی میں پھیل گئی کہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کی ایک ساتھی عورت غائب ہو گئی ہے۔ تمام بستی والے اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

ندیم کو نجانے یہ شبہ کیوں تھا کہ مس موزیکا کو برفانی چیتا تو اٹھا کر نہیں لے گیا۔ اس نے جب رؤف خان کے سامنے اپنے اس شبہ کا اظہار کیا تو اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”نہیں! اس علاقے میں برفانی چیتے ضرور ہیں۔ لیکن وہ اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔ بستی سے میلوں دور ہی رہتے ہیں۔“

”تو پھر.... موزیکا کہاں غائب ہو سکتی ہے؟ کیا بستی کا کوئی آدمی....“

”نہیں۔“ رؤف خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہماری بستی میں ایسا کوئی بھی آدمی نہیں ہے جو ایسی کمینگی کا اظہار کر سکے۔ ممکن ہے وہ لڑکی ریسٹ ہاؤس سے نکل کر راستہ بھٹک کر کسی طرف نکل گئی ہو۔ بستی کے سب نوجوان اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مل جائے گی۔“

رؤف خان کے پاس لائین تھی۔ دوسرے ہاتھ میں لاشی تھی۔ اس کا پوتا قابوس اور پانڈے بھی ندیم کے ساتھ تھے۔ قابوس کی عمر اکیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند، طویل قامت اور گھرو جوان تھا۔ اس نے ایک آٹومینک راٹفل اٹھا رکھی تھی۔ ”یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ان چٹانوں کے پیچھے لکڑی کا ایک کیمین بنا ہوا

دیکھا تھا۔“

”یہ آدم خان کون ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”یہ گوڈا کارہنے والا ہے۔ بڑا بد معاش آدمی ہے۔ یہ جب بھی کسی بستی میں جاتا ہے وہاں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔ ہمیں یہ پتہ چلانا ہے کہ یہ یہاں کیوں چھپا ہوا ہے۔ اب مجھے شک ہو رہا ہے کہ فرنگی لڑکی کو اغوا کر کے آدم خان نے اسے یہاں تو نہیں چھپا رکھا۔ اس کے دھندے کچھ اسی قسم کے ہیں۔ یہ کسی ایک علاقے سے عورتوں کو اغوا کر کے دور دراز کے علاقوں میں لے جا کر بیچ دیتا ہے۔ ہمیں محتاط ہو کر آگے بڑھنا چاہئے۔ قابوس! تم دائیں طرف سے جاؤ۔ تم دونوں ادھر ادھر سے نکلو۔ اور میں اس طرف سے جاتا ہوں۔“ رؤف نے کہا۔

آدم خان اب کھڑکی کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ وہ چاروں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ اس کیمین کا دروازہ دوسری طرف تھا اور یہ کھڑکی عقبی سمت میں تھی۔ قابوس دائیں طرف سے جا رہا تھا، ندیم کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا اور پانڈے بائیں طرف سے ہو کر کیمین کے سامنے کے رخ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوڑھا رؤف بھی ہوئی لائین ہاتھ میں لٹکائے ندیم کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

پانڈے سب سے پہلے کیمین کے سامنے والے رخ پر پہنچ گیا۔ ندیم کھڑکی کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اسے چونک جانا پڑا۔ کیمین کے گرد آلود فرش پر موزیکا پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور چہرے پر خوف و کرب کے طے جلے تاثرات تھے۔

کمرے میں لائین جل رہی تھی اور ایک آدمی دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ وہ آدم خان تھا۔ دوسری طرف کوئی آہٹ سن کر آدم خان چونک گیا۔ اس نے جیب سے پستول نکالا اور دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

آدم خان نے گولی چلا دی۔ لیکن پانڈے بچ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ندیم کھڑکی پر چڑھ کر کمرے میں کود گیا۔ اس نے سب سے پہلے موزیکا کو کھولا۔ موزیکا خوف اور سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ندیم نے اپنا کوٹ اتار کر اسے پہنا دیا اور دروازے کی طرف دوڑا اور کیمین سے باہر آتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”چلو... اس طرف بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ ندیم بولا۔

وہ چاروں اس چٹان کی طرف چلنے لگے۔ وہ چٹان ایک میل سے بھی زیادہ فاصلے پر تھی۔ وہ جیسے ہی چٹان کے دوسری طرف پہنچے ٹھٹھک کر رک گئے۔ تقریباً سو گز دور لکڑی کا وہ کیمین تھا جس کی ایک کھڑکی میں مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ چاندنی میں دیرانے میں یہ کیمین عجیب پر اسرار سا تاثر دے رہا تھا۔ رؤف خان نے یکدم اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لائین بچھا دی۔

”کیمین میں روشنی ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہاں کوئی موجود ہے۔“ رؤف خان کیمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن کون ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو دن میں بھی کسی کو اس طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“

”ہو سکتا ہے بستی ہی کا کوئی آدمی ہو۔“ ندیم نے سرگوشی کی۔

”بستی کے کسی آدمی کو گھر سے دور اس کیمین میں رات گزارنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے۔“ رؤف خان نے کہا۔ ”ہمیں اس طرح کیمین کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ کیمین میں جو بھی ہے اسے کوئی شبہ نہ ہو سکے۔“

وہ چاروں بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لے کر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ کیمین سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر وہ رُک گئے۔ ان سب کی نظریں کیمین کی روشن کھڑکی پر مرکوز تھیں۔ اچانک ایک آدمی کو کھڑکی میں دیکھ کر رؤف خان بری طرح چونک گیا۔ وہ لمبا ترنگا آدمی کھڑکی سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا اور کمرے کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ کیمین میں غالباً لائین جل رہی تھی۔

”یہ تو آدم خان ہے بابا۔“ قابوس نے رؤف کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”مگر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اسے شام کو تو میں نے بستی کے ایک چائے خانے میں بیٹھے ہوئے

میں نے منہ سے آواز نکالی تو مجھے گولی مار دے گا۔ وہ مجھے یہاں لے آیا اور باندھ کر یہاں ڈال دیا۔“

”شکر کرو تمہاری جان بچ گئی اور ہمارا بھرم رہ گیا۔ ورنہ ہم پوری وادی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ بہر حال اب واپس چلو۔“ رؤف خان نے اپنی بھیجی ہوئی لائین جلائی اور کمرے میں پڑی ہوئی دوسری لائین اٹھا کر قابوس خان کے حوالے کر دی اور وہ لوگ جس سے نکل کر بستی کی طرف چلے گئے۔

راستے میں انہیں دو آدمی مل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ لوگ بھی موزیکا ہی کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ ہی پلٹ گئے۔ ریٹ ہاؤس میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ موزیکا کی بازیابی پر ان سب نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دو آدمی رؤف خان کے ساتھ ریٹ ہاؤس ہی میں رہ گئے تھے۔

موزیکا، مس کور اور جیکو کے سونے کا انتظام ایک ہی کمرے میں کیا گیا تھا۔ وہ تینوں اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ انہوں نے دروازہ اور کھڑکیاں اندر سے اچھی طرح بند کر لی تھیں۔

رؤف خان وغیرہ ریٹ ہاؤس کے بڑے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ”میں نے شام کو آدم خان کو تمہارے ساتھ ایک چائے خانے میں بیٹھے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“ رؤف کے ایک ساتھی نے پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

پانڈے کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولا۔ ”ریٹ ہاؤس میں سامان اتروانے کے بعد میں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بستی کے بازار میں چلا گیا تھا۔ یہ شخص مجھے بازار ہی میں ملا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ ہم کوہ پیابیں یا محض سیر و تفریح کے لئے اس طرف آئے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم گمشدہ طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش میں نکلے ہیں۔ وہ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتا رہا اور قبوہ پانے کے لئے ایک چائے خانے میں لے گیا۔ میں اسے اس کی مہمان نوازی سمجھا تھا لیکن مجھے کیا علم تھا کہ مجھ سے کرید کرید کر سوالات کیوں کر رہا تھا۔“

کیبن کے سامنے تقریباً بیس پچیس فٹ چوڑی ہموار جگہ تھی اور اس کے آگے عمودی ڈھان تھی جس کے دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرا کھڈ تھا۔ پانڈے اور آدم خان بالکل کنارے پر ایک دور سے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ندیم تیزی سے ان کی طرف دوڑا۔ وہ ابھی چند فٹ دور ہی تھا کہ پانڈے نے آدم خان کو اپنے اوپر سے کھڈ کی طرف اچھال دیا۔ آدم خان ہوا میں اڑتا ہوا سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں گرنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری چیخ بڑی خوفناک تھی۔ اس دوران ندیم دوڑ کر پانڈے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانڈے کو گرفت میں نہ لے لیتا تو گہرے کھڈ کی تہہ میں پہنچ چکا ہوتا۔

پانڈے بری طرح کانپ رہا تھا۔ بوڑھا رؤف اور قابوس خان بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ چاروں کیبن کے اندر آ گئے۔ ندیم کا کوٹ پہنے ہونے کے باوجود موزیکا سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ رؤف خان نے اپنی گرم شال اس پر ڈال دی۔ یہ دراصل بھیڑ کی اون کا ہنا ہوا ڈھسہ تھا۔ اس سے موزیکا کی سردی کچھ کم ہوئی۔

”تم ٹھیک ہو موزیکا؟ اس بد معاش نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟“ ندیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ اگر تم لوگ نہ آتے تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔“ موزیکا نے جواب دیا۔ خوف کی شدت سے وہ ایک بار پھر کانپ کر رہ گئی تھی۔ ”اسے اپنے ایک ساتھی کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا ساتھی جیسے ہی یہاں پہنچے گا، مجھے قتل کر کے کھڈ میں پھینک دیا جائے گا۔“

”اب تو وہ خود کھڈ کی تہہ میں پہنچ چکا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔“ بوڑھے رؤف خان نے کہا۔

”لیکن تم اس کے ساتھ یہاں تک کیسے آ گئیں؟“ ندیم نے پوچھا۔ ”میں شہتی ہوئی ریٹ ہاؤس کے گیٹ تک آئی تھی۔ یہ شخص وہاں کھڑا تھا۔ اس نے کہا کہ بستی کی ایک عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ غیر مردوں کے سامنے نہیں آنا چاہتی اور ریٹ ہاؤس کے پچھلی طرف کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ جیسے ہی ریٹ ہاؤس کے پچھلی طرف پہنچی اس نے جیب سے پستول نکال لیا اور دھمکی دی کہ اگر

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ ٹیم کا ہر ممبر اپنے وجود میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اب تک جیپوں پر سفر کرتے اور ایک طرح سے پلنگ مناتے ہوئے آئے تھے۔ لیکن اب اصل مہم شروع ہونے والی تھی۔ ٹیم کے بعض ممبروں پر تو اس قدر سنسنی طاری تھی کہ انہیں رات کے آخری پہر تک نیند نہیں آ سکی۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ اپنے ان عزیزوں کی تلاش میں نکلے تھے جن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ بھی تھے یا حادثے کا شکار ہو کر مر چکے تھے۔ لیکن مہم میں حصہ لے کر یہ لوگ اپنی زندگیوں کو ضرور داؤ پر لگائے ہوئے تھے۔ قدم قدم پر موت کا سامنا ہو سکتا تھا۔ بر فانی چیتوں کے بارے میں سب نے سن لیا تھا۔ ندیم نے تو آخری مرتبہ ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی واپس جانا چاہے تو اب بھی جاسکتا ہے۔ لیکن کسی نے کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ان سب کے حوصلے بلند تھے۔ جیکو، مونیکا اور مس کورا تو مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پر جوش نظر آرہی تھیں۔

رات کو دیر سے سونے کے باوجود طلوع آفتاب سے پہلے سب لوگ جاگ گئے۔ چودہ نچر تھے۔ ایک پر جھولداریاں، سلیپنگ بیگز، ان کا ذاتی سامان اور راستے میں کام آنے والا سامان لد اہوا تھا۔ جبکہ دوسرے نچر پر خوراک کا ذخیرہ لد اہوا تھا۔ ڈبوں میں محفوظ خوراک کا ذخیرہ ان سب کے لئے ایک ماہ کے لئے کافی تھا۔ اس کے علاوہ آنا وغیرہ بھی لے لیا گیا تھا۔ باقی بارہ نچر سواری کے لئے تھے۔ دونوں جیپیں بوڑھے رؤف کی نگرانی میں ریست ہاؤس میں چھوڑ دی گئیں۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ قافلہ انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے آگے قابوس خان کا نچر تھا۔ اس کے بعد ندیم پھر محسن، اس کے بعد مس کورا، پھر جیکو، مونیکا، پانڈے، راشد اور آخر میں بار برداری والے اور سب سے پیچھے اختیار گل وغیرہ کے نچر تھے۔

تقریباً دس میل تک انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ پہاڑوں کے درمیان بل کھاتا ہوا تنگ سارا ستہ تھا جس پر نچروں کو چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ لیکن ان کی رفتار بہت سست تھی۔ قابوس خان ان پہاڑوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ اور طے ہو گیا اور وہ لوگ اس جگہ

”آئندہ محتاط رہنا۔ کسی اجنبی پر اس طرح اعتماد نہیں کر لینا چاہئے۔“ رؤف خان نے کہا۔

رؤف خان تو اپنے گھر واپس چلا گیا لیکن اس کے دونوں آدمی مہمانوں کی حفاظت کے خیال سے ریست ہاؤس ہی میں رہ گئے۔ حالانکہ اب کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ دونوں رانفلئیں سنبھالے رات بھر پہرہ دیتے رہے۔

حالانکہ وہ لوگ رات کو دیر سے سوئے تھے۔ لیکن صبح جلد ہی بیدار ہو گئے۔ ناگہاں رات پر طلوع آفتاب کا منظر بڑا دلنریب تھا۔ دھوپ کی کرنیں برف پر چمک رہی تھیں اور برف کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ سیاہ شیشوں والا چشمہ لگائے بغیر چوٹی کی طرف دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ان نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا جنہیں ندیم اپنی اس مہم میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ چار نوجوان منتخب کئے گئے تھے۔ ان میں ایک تو رؤف خان کا پوتا قابوس خان تھا۔ دوسرا اختیار گل جس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ پچھلے سال برطانیہ کے کوہ پیماؤں کی ایک ٹیم کے ساتھ رہ چکا تھا جو دنیا کی سب سے بلند چوٹی کے ٹوکو سر کرنا چاہتے تھے لیکن چوٹی کے آدھے راستے میں ٹیم کے لیڈر کی موت کی وجہ سے یہ مہم ناکام ہو گئی تھی۔ تیسرا گلریز تھا جس کی عمر پچیس چھپیس کے لگ بھگ تھی۔ اسے بھی برف پوش پہاڑوں پر سفر کرنے کا تجربہ تھا۔ اور چوتھا شروز تھا۔ یہ بھی دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سفر کرنے کا خاصا تجربہ رکھتا تھا۔

معتول تعداد میں نچر بھی خرید لئے گئے۔ اپنی حفاظت کے لئے ندیم نے اگرچہ پتول اور ریو الورد وغیرہ بھی گلگت سے خرید لئے تھے لیکن رؤف خان نے بتایا کہ انہیں راستے میں بر فانی چیتوں اور دوسرے خونخوار قسم کے جانوروں سے بھی واسطہ پڑے گا۔ ان سے نمٹنے کے لئے اگر وہ چاہیں تو انہیں بستی سے چند اچھی آٹومیک رانفلئیں بھی معتول قیمت پر مل سکتی ہیں۔

ندیم نے چار رانفلئیں خرید لیں جن میں سے ایک تو اس نے خود اپنے پاس رکھی، ایک رینڈ کوڈے دی گئی۔ تیسری محسن کے حوالے کر دی گئی اور چوتھی پانڈے کو دے دی گئی۔ قابوس وغیرہ کے پاس رانفلئیں موجود تھیں۔

نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور پھر منہ دھونے لگا۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے پیچھے دیکھا۔ وہ جھپک رہی تھی۔

جیکو بھی اس کے قریب ہی ندی کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے بھی منہ دھویا اور جی بھر کر پانی پیا۔ وہ دونوں کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے تھے پھر پتھر کے اوپر سے گھوم کر اپنے مایہیوں کی طرف آگئے۔ قابوس اور اس کے ساتھی ایک چٹان نما پتھر کے ساتھ خیمے گاڑ رہے تھے۔ یہ سبز رنگ کے پیراشوٹ کے کپڑے کے بنے ہوئے خیمے تھے جو وزن میں تو بہت ہلکے تھے لیکن ہوائے مکمل طور پر بچاؤ کر سکتے تھے۔

ندیم ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جیکو اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ دفعۃً ندیم ایک جگہ رُک گیا۔ پتھروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سیاہ دھبے سے نظر آرہے تھے۔ وہ جھک کر ان دھبوں کا جائزہ لینے لگا۔ دھبے بالکل سیاہ نہیں تھے بلکہ ان کی رنگت ڈارک میرون تھی۔ اس نے انگلی سے ایک دھبے کو چھو کر دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے رؤف خان کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔

یہ خون کے دھبے تھے اور پہلے آنے والی سرچ پارٹی کے ان آدمیوں کا خون تھا جنہیں برفانی چیتے نے زخمی کیا تھا۔ ندیم نے مڑ کر دیکھا۔ جیکو بھی جھکی ہوئی ایک پتھر پر خون کے دھبے کو انگلی سے چھو کر دیکھ رہی تھی۔

”بلڈ!“ جیکو کے لہجے میں عجیب سی سنسنی تھی۔

”ہاں! رؤف خان نے بتایا تھا کہ ان پہاڑوں میں برفانی چیتے بھی ہوتے ہیں۔ چند روز پہلے ایک چیتے نے حملہ کر کے یہاں کچھ آدمیوں کو زخمی کر دیا تھا۔ یہ دھبے شاید انہی کے خون کے ہیں۔“ ندیم نے بتایا۔

”شیر اور چیتے کے منہ کو انسانی خون لگ جائے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔“ جیکو نے کہا۔ اس کے لہجے میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس رائفلیں موجود ہیں۔ چیتا یا کوئی اور جنگلی جانور ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ ندیم نے جواب دیا۔

وہ ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آگئے اور ندیم کام کا جائزہ لینے لگا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے خیمے گاڑے جا چکے تھے۔ وہ تعداد میں بارہ تھے اور صرف تین خیمے

پہنچ گئے جہاں پہلے کسی سرچ پارٹی نے کیمپ لگایا تھا۔ ایک جگہ پر کونکے اور راکھ اور جلی ہوئی لکڑیاں نظر آرہی تھیں۔ یہاں دو تین پتھر بھی اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے اس جگہ کھانا پکایا گیا ہو۔

”آگے راستہ بہت دشوار ہے۔ اس لئے ہمیں اسی جگہ کیمپ لگانا ہو گا۔ رات یہاں بسر کرنے کے بعد صبح آگے روانہ ہوں گے۔“ قابوس نے کہتے ہوئے اپنا خچر روک لیا۔

ندیم اپنے خچر پر بیٹھا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا میدان پتھروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک پتھر کے عقب سے سرسراہٹ کی سی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی جھرنابہہ رہا ہو۔ اس پاس کچھ پودے بھی نظر آرہے تھے۔ ایسی جھاڑیاں بکثرت تھیں جن پر رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔

اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ ندیم کچھ اور فاصلہ طے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پہاڑوں میں شام جلدی ہو جاتی تھی۔ اگر وہ آگے چلتے رہے تو ممکن ہے شام کا اندھیرا پھیلنے پر انہیں پڑاؤ کے لئے کوئی مناسب جگہ نہ مل سکے۔ اس لئے اس نے قابوس کے مشورے پر عمل کرنا ہی مناسب سمجھا اور کیمپ لگانے کا حکم دے دیا۔

تمام لوگ خچروں سے اتر آئے۔ خچروں کو پودوں کی شاخوں سے باندھ دیا گیا۔ قابوس اور اس کے ساتھی ایک خچر سے سامان اتار کر خیمے نصب کرنے لگے۔ اور ندیم اور اس کے ساتھی ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ خچروں پر سفر کا یہ ان سب کا پہلا تجربہ تھا۔ ناگوں میں شدید کھچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ خواتین کی حالت تو کچھ زیادہ ہی ابتر تھی۔ وہ تینوں ایک طرف زمین پر لیٹ گئی تھیں۔

ندیم ٹہلتا ہوا اس بڑے پتھر کے پیچھے چلا گیا جہاں سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا خیال درست نکلا۔ وہ پتھروں سے پھونکنے والا پانی کا چشمہ تھا۔ چشمے سے نکلنے والا شفاف پانی پتھروں میں اچھلتا ہوا ایک چھوٹی سی ندی کی صورت میں مخالف سمت کی ڈھلان پر بہہ رہا تھا۔ اس ندی کا پانی دو ڈھائی فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ پانی اس قدر شفاف تھا کہ اس کی تہہ میں چھوٹے چھوٹے پتھر بھی چمکتے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔

ندیم ندی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہ بے حد ٹھنڈا تھا۔ اس نے چلا بھر کر ایک گھونٹ پیا۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی آب حیات کی طرح فرحت بخش محسوس ہوا۔ اس



لگائے گئے تھے۔ ایک خیمہ موزیکا، مس کور اور مچیکو کے لئے مخصوص تھا۔ ایک ندیم اور اس کے مرد ساتھیوں کے لئے اور تیسرا خیمہ قابوس خان اور اس کے ساتھیوں کے لئے تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے ہی کا رہا میڈلیپ جلا لئے گئے اور لکڑیاں جمع کر کے پتھروں کا چولہا بنا کر کھانا پکانے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ یہ لوگ اچھی خاصی مقدار میں دبنے کا خشک گوشت ساتھ لے کر آئے تھے۔ اعتبار گل کھانا بھی بہت اچھا پکا لیتا تھا اس لئے ہم کے دوران یہ ذمہ داری بھی اس کے سپرد کر دی گئی۔

آٹھ بجے کے لگ بھگ کھانا تیار ہو گیا۔ دسترخوان پر سب نے اکٹھے ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پھر قبوے کا دور چلا۔ قابوس اور اس کے ساتھیوں نے خیموں سے ذرا ہٹ کر لکڑیوں کا انبار جمع کر کے الاؤ روشن کر دیا تھا۔ اس الاؤ کے دو فائدے تھے۔ آگ کی روشنی سے جنگلی جانوروں کو دور رکھا جاسکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی سردی سے بھی بچا جاسکتا تھا۔

شام ہوتے ہی سردی بڑھ گئی تھی۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی اور اس طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا جسم میں ٹھٹھرن سی پیدا کر رہی تھی۔ دن بھر خچروں کے سفر نے انہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ تینوں لڑکیاں تو کھانا کھاتے ہی اپنے خیمے میں سلپنگ بیگز میں گھس کر سو گئی تھیں۔ دس بجے کے لگ بھگ محسن اور راشد بھی خیمے میں جا کر سو گئے۔ ندیم اور ریمینڈ، قابوس اور اختیار گل کے ساتھ آگ کے الاؤ کے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جبکہ گلریز اور شرواز کندھوں پر رانٹھلیں لٹکائے پہرے پر تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ رات کا تمام مرد باری باری پہرہ دیں گے۔ پہلے پہر کی ذمہ داری قابوس اور اس کے ساتھیوں نے سنبھال لی تھی۔

دس بجے کے لگ بھگ ندیم اور ریمینڈ بھی خیمے میں جا کر سو گئے۔ تھکن نے انہیں بھندہال کر دیا تھا۔ وہ بھی سلپنگ بیگز میں گھستے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

صبح ناشتے کے بعد سامان خچروں پر لاداجانے لگا تو ندیم، ریمینڈ اور قابوس نقشے لے کر بیٹھ گئے۔ یہ وہ نقشہ تھا جس پر سفاری فلاٹ کے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ کچھ دیکھ کر آپس میں مشورے کرتے رہے۔ پھر قافلہ آگے چل پڑا۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے راستہ دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی تو وہ کسی کھلی وادی

میں پہنچ جاتے اور کبھی انہیں نہایت تنگ سی دراڑوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ان کی رفتار بہت سست تھی۔ دو پہر تک وہ صرف چند میل کا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے۔ پہاڑی چوٹیاں تو برف سے ڈھکی ہوئی تھیں تاہم نشیبی چٹانوں اور ڈھلوانوں پر بھی کہیں کہیں برف جمی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ جس راستے سے گزر رہے تھے وہ ایک عمودی چٹان کے دامن میں ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی۔ یہ پٹی تقریباً پانچ فٹ چوڑی ہوگی۔ اس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ وہ سب خچروں سے اتر گئے تھے۔

یہ تنگ سارا راستہ تقریباً پچاس گز طویل تھا۔ اس سے آگے ایک مسطح میدان تھا لیکن اس تنگ سے کارنس نما راستے سے خچروں پر بیٹھ کر گزرنا خود کشی کے مترادف تھا۔ اگر کوئی خچر راستے میں بدک گیا تو سوار سمیت ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں گر سکتا تھا اور ایک پگڈنڈی پر لڑھکنے کے بعد ظاہر ہے موت کے دامن ہی میں پناہ مل سکتی تھی۔ لہذا طے یہ پایا کہ قابوس اور اس کے ساتھی پہلے خچروں کو لے جائیں اور اس کے بعد باقی لوگ پیدل ہی یہ راستہ طے کریں گے۔

قابوس اور اعتبار گل وغیرہ پہلے خوراک کے ذخیرے، سامان والے اور دوسرے خچروں کو لے گئے۔ دو اور پھیروں میں آٹھ اور خچر اس پل صراط کے اس پار پہنچ گئے۔ دو خچر رہ گئے تھے۔ اب یہ طے پایا کہ قابوس اور گلریز ان خچروں کو لے کر آگے آگے چلتے رہیں اور ان کے پیچھے یہ لوگ پیدل چلتے ہوئے آئیں گے۔ آخری خچر نے تقریباً دس گز کا فاصلہ چھوڑ کر یہ لوگ بھی اس راستے پر چل پڑے۔ سب سے آگے ندیم تھا۔ اس نے اپنے ساتھ مچیکو کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ تھے اور سب نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ وہ لوگ چٹان سے چپک کر چل رہے تھے۔ نیچے گہرائی کی طرف دیکھتے ہوئے مچیکو کو چکر آنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ندیم کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے چٹان سے چپک کر چلتی رہی۔ ان کے پیچھے آنے والے بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے۔ ریمینڈ کو اگرچہ کوہ پیما کی اچھا خاصا تجربہ تھا لیکن یہاں اس کے بھی پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ ایک طرف مس کور اور دوسری طرف محسن کا ہاتھ پکڑے چٹان سے چپکا ہوا چل رہا تھا۔

تھے۔ اور بالآخر خدا خدا کر کے یہ خوفناک راستہ ختم ہو گیا اور وہ کشادہ جگہ پر پہنچ گئے۔  
یہ بلند پہاڑوں میں گھرا ہوا سطح میدان تھا جو ان کے سامنے تقریباً ایک میل تک پھیلا  
ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر آگے  
بڑھنے کی تیاری کرنے لگے۔ کھڈ میں گرنے والا خنجر جھیکو کا تھا۔ ایک خنجر کم ہو جانے سے  
مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ جھیکو ندیم کے پیچھے اس کے خنجر پر بیٹھ  
گئی۔ وہ خاصا جاندار خنجر تھا۔ دونوں کا بوجھ اٹھائے آسانی سے چلتا رہا۔

ان کا رخ شمالی پہاڑ کی طرف تھا۔ تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک  
تنگ سے درے میں داخل ہو گئے۔ اس درے میں شاید کبھی دھوپ کی کرنیں نہیں پہنچی  
تھیں۔ کیونکہ درے میں برف جمی ہوئی تھی۔ درے میں داخل ہوتے ہی انہیں احساس  
ہوا جیسے سرد جہنم میں پہنچ گئے ہوں۔ رخ بستہ ہوا کے تیز جھونکے ان کے جسموں سے ٹکرا  
رہے تھے۔ اور گرم کپڑے پہنے ہونے کے باوجود وہ لوگ ٹھنڈی محسوس کر رہے تھے۔

درہ تقریباً تیس گز طویل تھا۔ دوسری طرف آتے ہی انہوں نے اطمینان کا سانس  
لیا۔ اب ان کے سامنے نشیب میں تاحہ نگاہ ایک خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی۔ جس  
میں چنار، پائن اور دیگر درختوں کی بھی بہتات نظر آرہی تھی۔ وادی تک پہنچنے کا کوئی  
باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر خنچروں سے اتر گئے اور محتاط انداز میں نشیب میں  
اترنے لگے۔

وادی بے حد خوبصورت تھی۔ اسے بلاشبہ قدرت کا ایک حسین شاہکار کہا جاسکتا تھا۔  
خنچروں سے پھونٹے ہوئے جیشے، گنگنائی ہوئی ندیاں اور فضا میں خوشبو بکھیرتے ہوئے  
خوش رنگ پھول۔ یہ وادی صدیوں سے یونہی حسن بکھیر رہی تھی۔ مگر قدم قدم پر بکھرا ہوا  
یہ قدرتی حسن دیکھنے کے لئے کبھی کبھار ہی کوئی انسان بھٹک کر اس طرف آنکلتا تھا۔

چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی جھیل کے سامنے پہنچ گئے۔ جھیل  
کے آس پاس پائن کے درختوں کے بہتات تھی۔ جھیل کے کنارے پر گلاب کھلے ہوئے  
تھے جن سے فضا مہک رہی تھی۔

جھیل کے کنارے ایک مناسب جگہ دیکھ کر انہوں نے کیمپ لگا دیا۔ اتنی خوبصورت  
جھیل دیکھ کر سب ہی لوگ دن بھر کی تھکن بھول گئے تھے۔ جھیل کا نیلگوں پانی کسی

وقعہ وہ خنجر کے نہہنانے کی آوازیں کر چوک گئے۔ ندیم نے آگے دیکھا۔ دونوں میں  
سے آگے والا خنجر کسی وجہ سے بدک گیا تھا۔ وہ نہہناتا ہوا زور زور سے اگلے سم زمین پر مار  
رہا تھا۔ اس کے اس طرح پیر مارنے سے چھوٹے چھوٹے پتھر اکھڑا کھڑا کھڈ میں لڑھک  
رہے تھے۔

اس خنجر کی لگام گلریز کے ہاتھ میں تھی۔ وہ لگام کو کھینچ کر پکڑا کرتے ہوئے خنجر کو سنبھالنے  
کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن خنجر ایک دم اچھلا اور پھر پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اگلے پیروں  
میں چلانے لگا۔

قابوس خان چٹان کے ساتھ چپکا کھڑا اپنے خنجر کو پکڑا رہا تھا۔ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر  
ان دونوں میں سے کوئی خنجر مڑ کر پیچھے بھاگا تو ان سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں  
گی۔ ان سب کے پیروں پر ہوا یاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ لوگ اس راستے کے تقریباً دو  
میں تھے۔ دوسرے خنجر کے بھی بدکنے کی صورت میں چار پانچ فٹ چوڑے راستے پر پناؤ  
کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

بدک ہوا اگلا خنجر چند سیکنڈ تک اگلے پیر ہوا میں چلاتا رہا اور ایک بار پھر زور زور سے  
زمین پر سم مارنے لگا۔ اس طرح اس کی پوزیشن بھی کسی حد تک بدل گئی تھی۔ پوزیشن  
بدلنے کے ساتھ ہی اس نے اگلا ایک پیر زور سے زمین پر مارا تو کنارے کا ایک تقریباً ڈیڑھ  
دو فٹ چوڑا پتھر اپنی جگہ سے اکھڑ گیا۔ پتھر اکھڑتے ہی خنجر بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ  
سکا۔ وہ بری طرح نہہنار ہاتھ اور کسی جگہ پیر جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”گلریز!“ قابوس چیخا۔ ”اس کی لگام چھوڑ دو۔“  
گلریز نے لگام چھوڑ دی۔ خنجر کے پیروں کے نیچے کنارے کے کچھ اور پتھر اکھڑے۔  
خنجر عمودی ڈھان پر لڑھکتا ہوا ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں جا گرا۔ تینوں لڑکیوں کے  
سے خوفناک چیخیں نکل گئیں۔ اس خوفناک منظر نے مردوں کے دل بھی دہلا دیے تھے  
مگر یہ غنیمت تھا کہ دوسرا خنجر اپنی جگہ پر پرسکون حالت میں کھڑا تھا۔

جس جگہ سے پتھر لڑھکے تھے وہاں سے راستہ کچھ اور تنگ ہو گیا تھا۔ وہ لوگ بہت  
انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ اس حادثے نے ان سب کو بری طرح دہشت زدہ کر دیا  
ان کے جسم پسینے میں شرابور تھے اور وہ ایک ایک انچ سرکتے ہوئے فاصلہ طے کر رہے

ہوئی خشک لکڑیاں ایک جگہ انبار کی صورت میں جمع کر کے انہیں آگ لگادی گئی۔ جھیل کی وجہ سے یہاں سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔

”جنگلی جانور پانی پینے کے لئے جھیل پر آتے رہتے ہیں۔ ان میں ریچھ، مارخور، لومڑیاں، بھیڑیے، جنگلی بلیاں اور برفانی چیتے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ خطرناک جانور زیادہ تر رات کے وقت ہی جھیل پر آتے ہیں۔ برفانی چیتے، ریچھ اور بھیڑیے ہمارے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں رات کو پہرے پر دو کی بجائے چار آدمی مقرر کرنے ہوں گے۔ دو میرے آدمی ہوں گے ان کے ساتھ دو آدمی آپ کے شامل ہو جائیں گے۔ آدھی رات کے بعد ڈیوٹی بدل جائے گی۔ دوسری شفٹ میں بھی دو ہم ہوں گے اور دو آپ کے آدمی۔“ قابوس نے کہا۔

”ٹھیک ہے! پہلی شفٹ میں پانڈے اور محسن تمہارے آدمیوں کا ساتھ دیں گے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ چاروں آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تنکھن اور نیند سے ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ انہیں بار بار جھانپناں آرہی تھیں۔ ان کے چاروں طرف خوفناک سناٹا تھا۔ کبھی کبھار اس سناٹے میں کسی جانور کی آواز سنائی دیتی تو وہ چونک جاتے۔ کبھی کبھار ان میں سے کوئی اٹھ کر آس پاس کا چکر لگالیتا اور پھر الاؤ کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ وہ اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دن بھر خچروں کی سواری اور پیدل سفر نے انہیں بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ اور بالآخر باری باری وہ سب اوٹکھٹے گئے۔

محسن ایک پتھر سے نیک لگائے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ رائفل اس کے کندھے سے نکی ہوئی تھی۔ دفعۃً محسن نیند کی جھونک میں ایک طرف جھک گیا۔ اس کے کندھے سے نکی ہوئی رائفل نیچے گری تو اس کی آواز سن کر محسن کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ پر آنکھیں مارتا رہا۔ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پانڈے اور گلریز پتھروں سے بند لگائے اونگھ رہے تھے۔ لیکن شروز وہاں نہیں تھا۔ محسن نے سوچا کہ شاید وہ کمپ کے دگرد پتھر لگانے گیا ہے۔ اس نے آگ کی روشنی میں گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بجے

خوبصورت انگوٹھی میں گننے کی طرح چمک رہا تھا۔

جھیل کے شفاف پانی میں ٹراؤٹ مچھلیوں کے جھنڈ کے جھنڈ تیرتے ہوئے نظر رہے تھے لیکن ان کے سامان میں مچھلی کے شکار کا سامان شامل نہیں تھا۔

”تم لوگ رات کے کھانے میں مچھلی کھانا چاہتے ہو؟ بہت لذیذ ہوتی ہے یہ ٹراؤٹ فش!“ قابوس نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن فشنگ راڈ یا ایسی کوئی چیز تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ مچھلی کیسے پکڑیں گے؟“ ندیم نے کہا۔

”یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ قابوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ چند منٹ میں تمہارے سامنے مچھلیوں کا ڈھیر لگا دوں گا۔“

قابوس درختوں کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں تقریباً دو گز لمبی ایک لکڑی تھی اور وہ چاقو سے لکڑی کا ایک سر تراش رہا تھا۔ لکڑی کے سرے کو نوک دار گولائی میں تراشنے کے بعد اس نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور لمبی لکڑی کو بھالے کی طرح پکڑ کر جھیل کے کنارے پر آگیا۔

لا تعد اور ٹراؤٹ مچھلیاں جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ پانی کی سطح سے تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ نیچے تیر رہی تھیں۔ قابوس لکڑی ہاتھ میں لئے ایک مچھلی پر نظریں جمائے رہا پھر اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ لکڑی کا نوک دار سر پانی کی سطح کو چیرتا ہوا اندر چلا گیا اور جب لکڑی پانی سے باہر آئی تو اس میں ایک مچھلی بھی پروٹی ہوئی تھی۔

قابوس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے دوسروں کی طرف دیکھا۔ پھر مچھلی لکڑی کا نوک سے نکال کر گھاس پر پھینک دی اور دوبارہ جھیل میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کو تانے لگا یہ مچھلی کے شکار کا قدیم طریقہ تھا۔ ان پہاڑوں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنے والے لوگ قریبی دریاؤں اور جھیلوں سے اسی طرح مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ قابوس واقعی چند منٹ میں اس لکڑی کی مدد سے اتنی مچھلیاں شکار کر لیں کہ وہ سب شکم سیر ہو کھا سکتے تھے۔ یہ مچھلیاں اعتبار میں نئے دیکھتے ہوئے کونکوں پر اپنے طریقے سے بھونیں سب مزے لے لے کر کھانے لگے۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ کاربائیڈ لمپ روشن کر دیئے گئے اور آس پاس سے جمع

اتنی دور نکل آیا تھا۔ بر فانی چیتا شاید گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے شروز پر حملہ کر دیا اور پہلے ہی حملے میں اس کا زرخرہ اُدھڑ دیا۔ اس کے نوکیلے پنوں سے چہرے پر بھی گہری خراشیں آ گئیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چیتا لاش کو مزید کوئی نقصان پہنچائے بغیر کیسے چاہا گیا؟ شروز کی رائفل بھی لاش کے قریب ہی جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ ایک آدمی نے رائفل اٹھائی اور کچھ نے مل کر شروز کی لاش اٹھالی اور اسے کیپ میں لے آئے۔ مچیکو وغیرہ کو بھی شروز کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ ان تینوں کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے تھے۔ شاید وہ بچھتا رہی تھیں کہ اس مہم میں شامل ہو کر انہوں نے اپنی زندگیاں خطرے میں کیوں ڈالی تھیں۔ سب سے پہلے موزیکا کو اغوا کیا گیا۔ پھر ایک خنجر حادثے کا شکار ہو گیا اور اب ان کا ایک ساتھی شروز کسی خونخوار جنگی درندے کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ کل کو کسی اور کی باری آ سکتی تھی۔ بہر حال چیکو کے خیال میں مہم کی ابتدا اچھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ گمشدہ طیارے کے مسافروں کی تلاش میں نکلے تھے اور اب خود موت کے حصار میں پھنس گئے تھے۔ وہ رات بھر جاگتے رہے ایک لاش کی موجودگی میں کسی کو نیند آ ہی کیسے سکتی تھی۔ موت کا خوف سب کے ذہنوں پر طاری تھا۔ انجانی موت..... ویران پہاڑوں میں کسی بھی روپ میں آ سکتی تھی۔

صبح طلوع آفتاب سے پہلے شروز کو جھیل کے کنارے دفن کر دیا گیا۔ اس کے لئے فاتحہ پڑھی گئی اور غالباً یہ شروز کی قبر پر پہلی اور آخری فاتحہ خوانی تھی۔ ان کے بعد کون اُدھڑ آئے گا اور کون فاتحہ پڑھے گا۔ ممکن ہے چند روز بعد بارش سے اس کی قبر کا نشان ہی مٹ جائے اور بعد میں آنے والوں کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ یہاں کوئی قبر بھی تھی۔

سورج طلوع ہونے کے بعد جب ان کے جسموں میں دھوپ سے کچھ حرارت پیدا ہوئی تو وہ آگے روانہ ہو گئے۔ انہیں جھیل کے اوپر سے ایک طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا۔ جھیل کے دوسری طرف ایک بار پھر چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ وہ مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سطح میدان اچانک ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس سے آگے بالکل عمودی ڈھلان تھی۔ تقریباً نوے درجے زاویے کے اس ڈھلان سے اترنا ممکن نہیں تھا۔ یہ ڈھلان تقریباً سو فٹ گہری تھی اور دوسری طرف تین سو فٹ کے فاصلے پر دوسری چٹان تھی۔ دونوں چٹانوں کے بیچوں

تھے۔ دوسری شفٹ والوں کو ایک بجے جگانا تھا۔ محسن نے چند منٹ شروز کا انتظار کیا۔ پھر پانڈے اور گلریز کو جگانے لگا۔ پانڈے نے توفور آبی آنکھ کھول دی مگر گلریز کو جگانے کے لئے جھنجھوڑنا پڑا۔ "شروز غائب ہے۔" محسن نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔ "کیا؟" گلریز اچھل پڑا۔ اس کی نیند غائب ہو گئی۔

وہ کیپ کے آس پاس گھوم پھر کر شروز کو آوازیں دینے لگے مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسرے لوگ بھی اٹھ گئے اور شروز کی تلاش شروع ہو گئی۔ کبھی کبھی جنگلی جانوروں کی آوازیں ان پر دہشت سی طاری کر دیتیں۔

دو آدمیوں کو لڑکیوں اور کیپ کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا گیا اور باقی ادھر ادھر پھیل کر شروز کو تلاش کرنے لگے۔ ندیم اور قابوس ایک ساتھ تھے۔ کیپ سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر شروز انہیں جھاڑیوں میں پڑا ہوا مل گیا۔ مگر اسے دیکھ کر ندیم کا راجھل کر حلق میں آ گیا۔

شروز مر چکا تھا۔ اس کا زرخرہ اُدھڑا ہوا تھا اور اس کے آس پاس جھاڑیوں میں خوکھرا ہوا تھا۔

☆

سب لوگ وہاں پہنچ گئے تھے اور پھٹی پھٹی سی نظروں سے شروز کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ سب کے چہروں پر دہشت نمایاں تھی۔ قابوس کی حالت تو کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ پلک جھپکے بغیر جھاڑیوں میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا زرخرہ اُدھڑا تھا۔ چہرے پر گہری خراشیں تھیں۔ اور ایک آنکھ کا ڈیلا حلقے سے نکل کر رخسار پر لگا ہوا تھا۔ اُدھڑا ہوا زرخرہ اور چہرے کی گہری خراشوں کو دیکھ کر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ : خونخوار جنگی درندے کا کام ہے۔ سب کے ذہن میں بیک وقت بر فانی چیتے کا خیال آ رہا تھا۔ لیکن ندیم کو حیرت تھی کہ اگر چیتے نے شروز پر حملہ کیا تھا تو اس کا زرخرہ اُدھڑا ہوا چہرے پر نوکیلے پنوں سے خراشیں ڈالنے پر ہی اکتفا کیوں کیا تھا؟ چیتے کو تو اس کا پور اُدھڑا ڈالنا چاہئے تھا۔ جبکہ چہرے اور گردن کے علاوہ جسم کے کسی اور حصے پر خراش نہیں آئی تھی۔ ندیم کے ذہن میں ایک اور خیال ابھر آیا۔ شروز غالباً غلطی سے کیم

بچہ ایک بہت بڑے نالے کی صورت میں پانی بہہ رہا تھا۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف ابھی پوری طرح پگھلنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جب برف پگھلتی ہوگی تو یہ نالہ دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہوگا۔ لیکن ان کے سامنے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس تقریباً تین سو فٹ چوڑے اور سو فٹ گہرے کھڈ کو عبور کس طرح کیا جائے۔ دائیں بائیں دور دور تک ڈھان پر اترنے کے لئے کوئی پگھنڈی یا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں دائیں طرف چلنا چاہئے۔ شاید نیچے اترنے کا کوئی راستہ مل جائے۔“ قابوس نے کہا۔

”کسی طرف تو جانا ہی پڑے گا۔“ ندیم نے جواب دیا۔ وہ چٹان کے کنارے کے ساتھ ساتھ دائیں طرف چلنے لگے۔ تقریباً تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں رسوں کا ایک پل نظر آ گیا۔ یہ پل تقریباً چار فٹ چوڑا تھا۔ رسوں کے جال پر لکڑی کے تختے بچے ہوئے تھے۔ دونوں اطراف بھی حفاظتی ریلنگ کی طرح رسوں کے جال بنے ہوئے تھے۔ ممکن ہے یہ پل کسی زمانے میں باقاعدہ گزرگاہ رہا ہو۔ لیکن اب اس کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ عرصے سے استعمال نہیں ہوا اور اس کی دیکھ بھال بھی نہیں ہو رہی تھی۔ رستے بہت خستہ حالت میں نظر آ رہے تھے اور لکڑی کے بعض تختے بھی بہت خستہ حالت میں دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن بہر حال انہیں اسی پل پر سے دو تین سو فٹ طویل ڈھلوان عبور کرنا تھا جو ان دونوں چٹانوں کے درمیان حائل تھا۔

”یہ پل خاصا کمزور نظر آ رہا ہے۔ ہمیں ایک ایک کر کے جانا ہوگا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے یہ زیادہ وزن برداشت نہ کر سکے۔“ ندیم نے پل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! سب سے پہلے میں جاتا ہوں۔“ اعتبار گل نے کہا۔

اعتبار گل نے خوراک کے ذخیرے والے خچر کی لگام اپنے خچر کی کانٹھی سے باندھ لی اور اپنے خچر کی لگام پکڑ کر پل پر قدم رکھ دیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا اس کے اور خچروں کے بوجھ سے پل ہلنے لگا تھا۔ اعتبار گل اپنے خچر کی لگام پکڑے بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ باقی سب لوگ کنارے پر کھڑے سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔

اعتبار گل نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اب گلریز بھی دو خچروں کو لے کر پل پر آیا اور وہ بھی پل کے تختوں پر بہت محتاط انداز میں چلنے لگا۔ اس کے نصف راستے تک پہنچنے تک اعتبار گل دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے دونوں خچر جھاڑیوں سے باندھ دیئے تھے اور اب واپس آ رہا تھا۔ جب وہ گلریز کے قریب پہنچا تو ایک سائیز کار سا پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ بتانے لگا۔

اب قابوس بھی دو خچروں کو لے کر پل پر چڑھ گیا تھا۔ اس دور ان اعتبار گل واپس آ گیا تھا اور مزید دو خچروں کو لے کر چلا گیا۔ دوسری طرف سے گلریز بھی اپنے خچر چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔

تمام خچر پار پہنچائے جا چکے تھے۔ اب ندیم کے ساتھی ایک ایک کر کے پل پر چلنے لگے۔ وہ سائیز کے رسوں کو پکڑ کر بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ آخر میں ندیم اور جیکو پل پر چڑھے تھے۔ ان سے آگے محسن تھا جو تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر تھا اور باقی ساتھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس سے آگے چل رہے تھے۔

جیکو اور ندیم پل کے وسط میں پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں کے بوجھ سے پل یوں ہل رہا تھا کہ باقاعدہ جھولا جھلایا جا رہا ہو۔ کئی موقعوں پر جیکو کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں بھی نکل آئیں۔ ایسی ڈری ڈری چیخیں ندیم نے آگے جانے والی موزیکا اور مس کورا کے منہ سے سنی تھیں۔

پل کے بعض تختے ٹوٹے ہوئے اور بعض بہت ہی خستہ تھے۔ ندیم کو حیرت تھی کہ بوس اور اس کے ساتھی اس خستہ پل پر سے خچروں کو کیسے لے گئے تھے۔

وہ بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ساتھی پل کے دوسرے سرے پر پہنچنے والے تھے جبکہ جیکو اور ندیم ابھی آدھے راستے میں تھے۔ ندیم نے جیکو کی طرف

کے جال میں لپیٹ لیا تھا۔ اس نے کچھ اور آگے جھک کر چیکو کا دوسرا ہاتھ بھی گرفت میں لے لیا اور اسے اوپر کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اسے اپنے مقصد میں معمولی سی کامیابی بھی نہیں ہو سکی۔ تیز ہوا پل کو بری طرح جھلارہی تھی اور اس کے ساتھ ہی چیکو بھی جھول رہی تھی۔ ندیم کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر چیکو اس کی گرفت سے نکل گئی تو تقریباً سو فٹ نیچے پتھروں پر گر کر اس کی ہڈیوں کا سرمہ بھی نہیں ملے گا۔

پل کے تختوں پر کسی کے دوڑنے کی آواز سن کر ندیم نے گردن گھما کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی تمام تر توجہ چیکو کی طرف مبذول کر دی۔ پسینے کی وجہ سے چیکو کی کانیاں اس کے ہاتھوں سے پھل رہی تھیں۔ وہ اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بالآخر ایک کان کی ندیم کے ہاتھ سے نکل گئی۔ چیکو کو ہلکا سا جھکا لگا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ اس کی دوسری کان کی بھی ندیم کے ہاتھ سے آہستہ آہستہ پھسل رہی تھی۔ ندیم گرفت جمائے رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے۔

پل کے تختوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز قریب پہنچ گئی۔ وہ قابوس اور محسن تھے جو اپنی زندگیوں کی پرواہ کئے بغیر اس خطرناک پل پر دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ ان کے دوڑنے سے معلق پل مزید ہلکورے لے رہا تھا۔

بالآخر وہ دونوں قریب پہنچ گئے۔ محسن اور قابوس آٹنے سامنے تختوں پر لیٹ گئے۔ ندیم کا ہاتھ چیکو کی کان کی پر سے پھسلتا ہوا ہتھیلی پر آ گیا تھا۔ اب انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ اس طرح تھام رکھا تھا جیسے مصافحہ کر رہے ہوں۔ لیکن دونوں کی ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں اور لمحہ بہ لمحہ گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ چیکو اس کے ہاتھ سے نکل جاتی محسن نے نیچے جھک کر بڑی پھرتی سے چیکو کی کان کی تھام لی۔ دوسری طرف سے قابوس نے بھی جھک کر چیکو کی دوسری کان کی تھام لی۔ ندیم نے چیکو کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔

محسن اور قابوس چیکو کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنے لگے۔ تختوں کے نیچے رسوں کے ٹوٹے ہوئے جال سے اسے بڑی مشکل سے کسی حد تک اوپر کھینچ لیا گیا۔ چیکو کے کندھے جیسے ہی

دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔  
”ذرا خیال سے آنا چیکو! آگے دو تختے ٹوٹے ہوئے ہیں۔“ ندیم نے چیکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ ساتھ رہو۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ چیکو نے کہا۔  
”ڈرو نہیں! سب لوگ خیریت سے کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔ آہستہ آہستہ چلتی رہو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

آگے دو تختے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے رسوں کے جال کی دو تین رسیاں بھی ٹوٹ کر نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ تختے ایک ایک فٹ چوڑے تھے۔ دو تختوں کے ٹوٹنے سے تقریباً دو فٹ کا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ ندیم نے اگلے تختے پر قدم رکھا۔ پھر چیکو کو سہارا دینے کے لئے ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے سائیڈ کے رسے کو پکڑ رکھا تھا۔

چیکو نے ندیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک پیر آگے بڑھا دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ پیر اگلے تختے پر رکھتی پل نے ہلکا سا ہلکورہ لیا۔ چیکو کا توازن بگڑ گیا اور اس کا پیر تختے کی بجائے خلا میں پڑا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ ندیم نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ چیکو کے لڑکھڑانے سے پل زور زور سے ہلکورے لینے لگا تھا۔ اس کا دوسرا پیر بھی تختے سے پھسل گیا اور پل کے ٹوٹے ہوئے تختوں کے خلا میں اترنے لگی۔ اگر ندیم حواس قابو میں رکھتے ہوئے اس کی کان کی نہ پکڑ لیتا تو چیکو یقیناً موت کے اس خلا میں غائب ہو چکی ہوتی۔

ندیم تختوں پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مضبوطی سے چیکو کی کان کی تھام رکھی تھی اور چیکو پل سے نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ ان دونوں کی جدوجہد اور تیز ہوا سے پل بڑی تیزی سے جھول رہا تھا۔ چیکو نے نیچے دیکھا۔ تقریباً سو فٹ نیچے پتھروں میں پانی بہہ رہا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اس کی روح فنا ہو گئی کہ اگر وہ نیچے گر گئی تو اس کا کیا ہو گا۔

ندیم کے ہاتھ میں پسینہ آ رہا تھا اور چیکو کی کان کی اس کی گرفت سے پھسل رہی تھی۔ تختوں پر سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ سبارے کے لئے اس نے اپنا ایک پیر سائیڈ کے رسوں

”ٹھیک ہے۔“ قابوس بولا۔ ”کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر ہم آگے روانہ ہوں گے تاکہ شام ہونے سے پہلے کیمپ لگانے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر لی جائے۔“  
وہ تقریباً ایک گھنٹہ وہاں رکے رہے۔ اور پھر یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ اگر وہ لوگ دریا مشرق کی طرف رخ کر لیتے تو ایک پہاڑی درہ عبور کر کے دوپت نامی گاؤں میں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن ان کا رخ قدرے جنوب کی طرف تھا۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس طرح بھی انہیں ایک تنگ سے درے سے گزرنا پڑا۔ درے کے دوسری طرف نکلنے ہی ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک بلند چوٹی ان کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان وہ ایک تنگ سی وادی تھی جس کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ رہی ہوگی۔ یہ تنگ سی وادی تاحد نگاہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس جگہ دھوپ نہ ہونے کے باوجود ان کی آنکھیں برف کی چمک سے خیرہ ہوتی جا رہی تھیں۔ تیز ہوا ان کے جسموں میں کپکپی سی پیدا کر رہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے ہم ان پہاڑوں میں آکر پھنس گئے ہیں۔ اس درہ نمادادی سے نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔“ ندیم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اس طرف چلتے رہنا چاہئے۔ اس طرف سامنے والے پہاڑ میں ایک خم سا نظر آرہا ہے۔ ممکن ہے اس جگہ دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ ہو۔“ محسن نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے۔ کسی طرف تو جانا ہی ہوگا۔ ندیم نے کہتے ہوئے خچر کو ہانک دیا۔ قافلہ ایک بار پھر چل پڑا۔ وہ اس وقت تقریباً سات ہزار میٹر کی بلندی پر سفر کر رہے تھے۔ سردی کی شدت سے ان کی روح فنا ہو رہی تھی اور وہ جلد سے جلد اس سرد جہنم سے نکل جانا چاہتے تھے۔

بالآخر انہیں اس وادی سے نکلنے کا ایک راستہ مل ہی گیا۔ وہ دراصل پہاڑ میں ایک تنگ سی دراڑ تھی۔ دراڑ اتنی تنگ تھی کہ ایک خچر اس میں بمشکل چل سکتا تھا۔

”اب مجھے یاد آگیا۔“ قابوس دراڑ کے سامنے رک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔ رسوں والا پل عبور کرنے کے بعد اگر ہم مشرق کی طرف مڑ جاتے تو دوپت نامی گاؤں تک پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سے ہم کیل کی طرف نکل کر کشمیر کی

تختوں سے اوپر آئے ندیم نے جھک کر اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال دیئے اور ہانہوں کے حلقے میں لے کر اسے کھینچتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے جھکنے لگا۔ محسن اور قابوس بھی جھیکو کو اوپر کھینچ رہے تھے۔ بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ ندیم ایک جھینکے سے پشت کے بل تختوں پر گر گیا۔ وہ چونکہ جھیکو کو اپنی ہانہوں کے حلقے میں لئے ہوئے تھا اس لئے وہ بھی ندیم کے سینے پر ڈھیر ہو گئی۔

ندیم گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس کا جسم اپنے میں تر تھا۔ حواس کسی قدر بحال ہونے کے بعد اسے اپنے سینے پر جھیکو کے نرم اور گداز بوجھ کا احساس ہوا۔

جھیکو بے ہوش ہو چکی تھی۔ قابوس اور محسن نے جھیکو کو ندیم کے سینے پر سے اتار اور وہ دونوں اسے اٹھا کر تیزی سے کنارے کی طرف چلنے لگے۔ معلق پل ان کے پیروں کے نیچے جھول رہا تھا مگر وہ تیزی سے چلتے رہے۔ ندیم ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

کنارے پر پہنچ کر جھیکو کو زمین پر لٹا دیا گیا۔ جاوید نے اپنی بیلٹ میں اڑی ہوئی پانی کی بوتل اتاری اور اس کا ڈھکنا کھول کر جھیکو کے منہ پر پانی کے چھینے دیئے لگا۔

جھیکو تقریباً پانچ منٹ بعد ہوش میں آسکی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ موت کے منہ سے لوٹ کر آئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مس کو رانے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جھیکو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”تمہیں ندیم کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہاری زندگی بچائی ہے۔ اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ قابوس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

جھیکو نے عجیب سی نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھا۔ پھر سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ ”مم..... میں آگے نہیں جاسکتی..... تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔“

”تو پھر واپسی کے لئے وہی راستہ ہے۔“ قابوس نے رسوں کے معلق پل کی طرف اشارہ کیا۔

”نن..... نہیں.....“ جھیکو چیخی۔ میں موت کے اس راستے سے واپس نہیں جاؤں گی۔“



ایک دم رک گیا۔ اس نے نارنج کی روشنی میں دیکھا تو وہ برف تھی جو نیچے گر کر بکھر گئی تھی۔ قابوس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اوپر سے جہاں دونوں چٹانیں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی نظر آرہی تھیں برف کے چھوٹے چھوٹے تودے گر رہے تھے۔

”اے..... واپس چلو..... جلدی..... اوپر سے برف کے تودے گر رہے ہیں۔“ قابوس چیخا۔

خوف کی شدت سے سب کی بری حالت ہو گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ جس جگہ وہ لوگ موجود تھے وہاں پر دراڑ اتنی کشادہ تھی کہ خچروں کو آسانی سے موڑا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے ندیم نے خچر موڑا اور اس کے بعد دوسرے لوگ اپنے اپنے خچر موڑ کر تیزی سے واپس چلنے لگے۔ برف کے تودے مسلسل گر رہے تھے۔ چند ہی منٹ میں دراڑ کا وہ راستہ برف سے بند ہو گیا۔

ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے پہاڑ کا یہ سنگلاخ سینہ ان سب کا مقبرہ بننے والا ہو۔ وہ بدحواسی میں اصل دراڑ کی بجائے دوسری دراڑ میں مڑ گیا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے پیچھے ہی اس دراڑ میں مڑے تھے اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس طرف مڑ گئے تھے۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک موڑ گھومتے ہی وہ روشنی میں آ گئے۔ اس طرح اچانک پہاڑ کے سینے سے باہر آ جانے پر انہیں حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی۔

ان کے سامنے ایک اور وادی تھی۔ تاحد نگاہ برف کا فرش بچھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں سے برف پکھل چکی تھی اور وہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں نظر آرہی تھیں۔

”ہم لوگ کسی غلط سمت میں تو نہیں جا رہے.....؟“ محسن نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان دونوں کے خچر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

”سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہمیں کسی خاص مقررہ جگہ پر نہیں پہنچنا۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ہم گمشدہ طیارے کی تلاش میں نکلے ہیں۔ اور سفاری فلائٹس کا فضائی روٹ یہی ہے۔ اگر طیارہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے تو اس کا ڈھانچہ انہی پہاڑوں میں کسی جگہ پر ہو سکتا ہے۔ اور اگر کریش لینڈنگ کی ہے تو ایسی ہی کوئی وادی اس مقصد کے لئے کام آ سکتی ہے۔

سرحد کے ساتھ ساتھ جاسکتے تھے۔“

”تو کیا خیال ہے واپس چلیں؟“ ندیم نے کہا۔

”نہیں.....!“ قابوس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس دراڑ سے نکل کر ہم پہاڑی کے دوسری طرف سے بھی کیل کی طرف جاسکتے ہیں۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ دراڑ ہمیں پہاڑ کے دوسری طرف پہنچا دے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس پہاڑ کے اندر ہی کہیں گم ہو جائیں۔“ اس مرتبہ محسن نے کہا۔

”پہاڑوں میں ایسی دراڑوں عام طور پر آدھار ہوتی ہیں۔ اگر کہیں آگے جانے کا راستہ نہ ملا تو ہم واپس آ جائیں گے۔“ قابوس نے کہا۔ ”میں آگے چلتا ہوں آپ لوگ میرے پیچھے آئیے۔“

خچر پر سوار ہو کر اس تنگ سی دراڑ میں چلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ لوگ خچروں سے اتر گئے۔ سب سے پہلے قابوس ہی اپنے خچر کی لگام پکڑ کر دراڑ میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے محسن، پانڈے اور راشد تھے۔ پھر تینوں لڑکیاں اور آخر میں اعتبار گل، گلریز اور پھر ندیم تھا۔

ندیم سب سے آخر میں دراڑ میں داخل ہوا تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ زمین پر تو یہ دراڑ چار ہاڑھے چار فٹ چوڑی تھی۔ لیکن اوپر سے دونوں چٹانیں آپس میں تقریباً ملی ہوئی تھیں۔ بہت بلندی پر روشنی کی ایک باریک سی لکیر نظر آرہی تھی۔

دراڑ میں گہری تاریکی تھی۔ سب سے آگے قابوس نے نارنج جلا لی تھی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی نار چیں جلا لی تھیں۔ تاریکی کی وجہ سے خچر بار بار ہنہارہے تھے۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دراڑ دائیں طرف مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سامنے بہت دور روشنی کا ایک ننھا سا نقطہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دراصل اس دراڑ سے نکلنے کا راستہ تھا جو اس جگہ سے بہت دور تھا۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک اور دراڑ بائیں طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ مگر وہ لوگ سیدھے روشنی کے نقطے کی طرف بڑھتے رہے۔

قابوس سب سے آگے تھا۔ دفعۃً کوئی چیز اس سے چند گز آگے زمین پر گری۔ قابوس

ہوئی گولی اس جانور کی کھوپڑی میں لگی اور وہ منہ سے عجیب سی آوازیں نکالتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔  
راشد کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔  
اسے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں دو منٹ لگ گئے۔ گلریش کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف  
نہیں تھی۔ لیکن اس نے بھی جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا تھا اور اب وہ نارنج کی روشنی میں  
اس جانور کا بڑبڑاہ لے رہا تھا۔

وہ چرخ تھا۔ شکاری کتے کی طرح بہت دبا پتلا لیکن قد میں اس سے کچھ اونچا۔ اس کی  
پتلی پتلی ٹانگیں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں۔ دانت لمبے اور نوکیلے اور اگلے پنچوں کے ناخن  
بھی نوکیلے اور بے حد خطرناک تھے۔

”چرخ ان پہاڑوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ بھیڑیے سے زیادہ خطرناک ہوتا  
ہے۔ بے حد تیز رفتار جانور ہے اور اپنے برابر کے جانور کو تو ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔“ گلریش  
نے بتایا۔

فارک کی آواز سن کر ان کے ساتھی بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک  
اس چرخ اور دوسرے جانوروں کے بارے میں تبصرے کرتے رہے۔ پھر مردہ چرخ کو اٹھا  
کر دور پھینک دیا گیا اور وہ لوگ غار میں گھس کر نارچوں کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے لگے  
غار کافی کشادہ تھا۔ ایک کونے میں راکھ، کونے اور ادھ جلی لکڑیاں دیکھ کر ندیم کو یہ  
سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان سے پہلے بھی کچھ لوگ غار کو اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ ادھ جلی  
لکڑیوں پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھے بہت عرصہ پہلے  
یہاں آئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ چند مہینے یا سال دو سال پہلے کی بات ہو۔ مہربند  
خوراک کے کچھ خالی ڈبے بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔

ندیم کے خیال میں یہ غار شب ب سری کے لئے محفوظ تھا۔ اس لئے اس نے رات اسی  
غار میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ خوراک کے خالی ڈبے اٹھا کر باہر پھینک دیئے گئے اور باہر  
سے جھاڑیوں کی شاخیں توڑ کر غار کی صفائی شروع کر دی گئی۔

باہر ابھی دن کی روشنی باقی تھی لیکن غار میں تاریکی تھی۔ اس لئے پہلے کار بائینڈ لیمپے  
روشن کئے گئے اور پھر خچروں سے سامان اتار کر اندر لایا جانے لگا۔ خیمے وغیرہ نہیں کھیلے  
گئے البتہ سلپنگ بیگز، گرم کمپڑے اور دیگر ضروری سامان وغیرہ کھول لیا تھا۔

تم یہ پہاڑ دیکھ چکے ہو۔ بعض جگہیں تو ایسی ہیں کہ ایک طیارہ تو کیا کئی طیارے بھی کھڑے  
ہوں تو انہیں فضا سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ چٹانوں کے قدرتی سائبان طیارے جیسی چیز کو  
فضا میں پرواز کرنے والے ہوا باز کی جگہوں سے اوچھل رکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی طیارہ  
یہاں اتنی نیچی پرواز نہیں کر سکتا کہ ان چٹانوں کے سائے میں بھی کچھ دیکھا جاسکے۔“  
”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اپنا سفر کسی بھی سمت میں جاری رکھنا چاہئے۔“ محسن نے  
کہا۔

”ہاں.....! طیارے کے حادثے یا کریش لینڈنگ کی امکانی جگہ کو پیش نظر رکھتے  
ہوئے ہم کسی بھی طرف جاسکتے ہیں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

ان کا سفر جاری رہا۔ خچروں پر سواری سے سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ اعتبار گل نے  
اونچی آواز میں شینا زبان کا ایک گیت شروع کر دیا۔ قابوس اور گلریش بھی اس کی لے میں  
لے ملانے لگے۔ ان کے اس گیت سے دوسروں کی بوریٹ کسی حد تک کم ہو گئی۔ ان کی  
آواز وادی میں بازگشت سی پیدا کر رہی تھی۔

شام سے کچھ پہلے وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جسے دیکھ کر ہی ان کی ساری تھکن دور ہو  
گئی۔ وہ بلندی سے گرتا ہوا آبشار تھا۔ جس جگہ آبشار کا پانی گر رہا تھا وہاں ایک چھوٹی سی  
جھیل بن گئی تھی اور اس سے آگے پانی ایک بہت بڑی ندی کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ پانی  
بہت تیز رفتار اور ندی کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ اس تیز رفتار ندی کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔  
یہاں پائن کے درختوں کی بہتات تھی اور ندی کے آس پاس خوش رنگ پھول کھلے  
ہوئے تھے۔ کانٹے اور جھاڑیوں کی بھی بہتات تھی۔ انہیں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی  
جہاں کیمپ لگایا جاسکتا۔

چٹانوں کے آس پاس گھومتے ہوئے گلریش کو ایک پہاڑی غار نظر آگیا۔ اس وقت راشد  
اس کے ساتھ تھا۔ یہ غار کسی خونخوار جنگلی جانور کا مسکن بھی ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ بڑی  
احتیاط سے غار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جاوید نے رائفل تان رکھی تھی اور گلریش کے ہاتھ  
میں نارنج تھی۔ غار کے اندر تاریکی تھی اور دہانے کے سامنے لا تعداد جھاڑیاں تھیں۔ وہ  
جیسے ہی جھاڑیوں کے قریب سے گزرے جھاڑیوں میں چھپے ہوئے کسی جانور نے ان پر  
چھلانگ لگا دی۔ راشد نے غیر ارادی طور پر رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا۔ بدحواسی میں چلائی

دن کا بیشتر حصہ آرام کرتے ہوئے گزارا۔ مرد تو پھر بھی باہر گھومتے رہے لیکن چیکو، مونیکا اور مس کوراندھال سی اپنی جگہوں پر پڑی رہیں۔ چار بجے کے بگ بھگ وہ تینوں غار سے باہر نکلیں۔ قدرت کی نیرنگیاں ان کے سامنے تھیں۔ کل معلق پل پر سے گرنے والے واقعہ کے بعد چیکو کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت خوف سا جھلکتا رہتا تھا۔ لیکن آج ان بھر آرام کرنے اور قدرت کا یہ حسن دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ تینوں مصلحتی ہوئیں ندی کے کنارے پر آگئیں۔ ندی بہت گہری تھی اور پانی شفاف تھا۔ کنارے کے قریب پانی کے نیچے پتھر بھی چمکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کورانے کنارے پر بیٹھ کر چلو بھر پانی پیا۔ پانی میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پانی پینے لگیں۔ چیکو اور مونیکا بھی اس کی تقلید کر رہی تھیں۔ پھر وہ تینوں پانی میں پیر لٹا کر بیٹھ گئیں۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے صبح کی ساری تھکن پیروں کے راستے نکل رہی ہو۔

”دیکھو! ندی کے کنارے پر کتنے حسین پھول کھلے ہوئے ہیں۔ آؤ زرا ندی کے ساتھ ساتھ آگے چلتے ہیں۔“ یہ تجویز مونیکا نے پیش کی تھی۔ وہ تینوں اٹھ کر ندی کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

جنگلی گلاب اور دیگر کئی اقسام کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ بلندی کی طرف پائن اور چنار کے درخت بھی تھے جو پہاڑ کی بلندی کی طرف بتدریج گنجان ہوتے چلے گئے تھے۔

وہ تینوں ایک جگہ رک گئیں۔ یہاں ندی میں ایک کٹاؤ سا تھا جو تقریباً دس گز اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طرح یہاں ایک چھوٹی سی کھاڑی بن گئی تھی جس کا پانی پرسکون تھا۔ شفاف پانی میں ٹراؤٹ فش تیرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہاں پانی زیادہ گہرا بھی نہیں تھا۔ کھاڑی کے آس پاس اور دور دور تک قد آدم گنجان جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مس کورا نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ راشد اور پاندے غار کے سامنے پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے جبکہ ان کے دوسرے ساتھی آبشار کی طرف گھوم رہے تھے۔ غار اگرچہ بلندی پر تھا مگر کھاڑی کے کنارے اونچی جھاڑیوں کی وجہ سے انہیں وہاں سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

”نبانے کو دل چاہ رہا ہے۔ کیا خیال ہے تم لوگوں کا؟“ مس کورانے ایک بار پھر محتاط

چیکو رات کے تجربے کو وہ نہیں بھولے تھے۔ شہروز کی موت انہیں یاد تھی۔ اسے کسی جنگلی جانور نے ہلاک کر دیا تھا اور پہرہ دینے والے باقی تین آدمی آرام سے سوتے رہ گئے تھے۔ اس لئے آج یہ طے کیا گیا کہ دو دو آدمی مل کر دو دو گھنٹے غار کے دہانے پر پہرہ داری کی ذیوئی دیں گے۔ اس طرح سب کو آرام کا موقع مل جائے گا۔ کھانے کے بعد باقی لوگ تو جلد ہی سو گئے البتہ محسن اور قابوس غار کے دہانے پر رائفلیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ شدید سردی سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنے جسموں پر گرم کپڑے لپیٹ رکھے تھے اور گردن اور چہروں پر بھی موٹے مفلر لپیٹے ہوئے تھے۔ دو گھنٹے پورے ہونے پر انہوں نے پاندے اور گلریز کو جگا دیا اور خود غار میں جا کر سو گئے۔ اس طرح دو دو گھنٹے ذیویاں بدلتے ہوئے رات بیت گئی۔ اس رات کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

تین چار روز کے سفر سے وہ سب لوگ بری طرح تھک گئے تھے۔ چیکو، مس کورا اور مونیکا کی تو بری حالت ہو رہی تھی۔ اس لئے طے یہ پایا کہ آج کا دن مکمل طور پر آرام کا جائے۔ دوسری رات بھی اس غار میں گزاری جائے اور اس سے اگلے روز سفر دوبارہ شروع کر دیا جائے۔

صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد قابوس اور محسن رائفلیں اٹھا کر آبشار کے قریب ندی پر چلا گئے اور جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ وقفہ وقفہ سے مختلف جانور ندی پر پانی پینے کے لئے آرہے تھے۔ اس علاقے میں پہاڑی بکرے جنہیں مارخور کہا جاتا ہے بکثرت پائے جاتے تھے۔ ان کا گوشت بہت لذیذ ہوتا تھا۔ قابوس کو ان پہاڑی بکروں ہی کا انتظار تھا۔ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد پانچ چھ مارخوروں کا ایک گروہ ندی کے کنارے پر آگیا۔ مارخور پانی پی کر جیسے ہی جھاڑیوں کے پتے کھانے لگے قابوس اور محسن نے بیک وقت رائفلیں چلا دیں۔ ان کی گولیاں ضائع نہیں گئیں۔ دو بکرے گرا تڑپنے لگے۔ جبکہ باقی بھاگ گئے۔

قابوس اور محسن جھاڑیوں سے نکل کر گرے ہوئے بکروں کی طرف دوڑے۔ قابوس نے جیب سے شکاری چاقو نکال لیا اور تکبیر پڑھتے ہوئے باری باری دونوں کے گلوں چاقو چلا دیا۔

مڑ کے جھاڑیوں میں بلندی کی طرف دوڑنے لگا۔ مس کو رہا تھ پیر چلا تے ہوئے بری طرح چیخ رہی تھی۔ جھیکو اور مونیکا پانی سے نکل آئیں اور وہ دونوں چیختی ہوئیں غار کی طرف دوڑنے لگیں۔ ان کی چیخیں وادی میں بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔

ان کی چیخوں کی آواز سن کر سب سے پہلے غار کے سامنے بیٹھے ہوئے پانڈے اور محسن ایسے کران کی طرف دوڑے۔ پھر آبشار کی طرف سے گریز اور قابوس وغیرہ بھی ان کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے۔

جھیکو اور مونیکا بدستور چیختی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھیں۔ ان پر اس قدر شدید خوف طاری تھا کہ انہوں نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کئی مرتبہ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر گری تھیں جس سے ان کے جسموں پر ہلکی ہلکی خراشیں آگئی تھیں مگر وہ اس طرح دوڑتی رہیں جیسے موت ان کا تعاقب کر رہی ہو۔

سب سے پہلے محسن اور پانڈے ان کے قریب پہنچے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر وہ دونوں بری طرح چونک گئے۔ مگر ان دونوں میں سے کسی کو بھی اپنی بے لباسی کا احساس نہیں تھا۔ وہ دونوں اب بھی بری طرح چیخ رہی تھیں۔

محسن کے بار بار پوچھنے پر بھی ان دونوں کے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں نکل سکی جس سے کچھ مفہوم واضح ہو سکتا۔

جھیکو اور مونیکا جھک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھیں اور دونوں کے منہ سے کف جاری تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ میلوں دور سے بھاگتی چلی آ رہی ہوں۔ اس دوران ندیم وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ اعتبار گل اور قابوس نے روایتی انداز میں اپنے کندھوں پر گرم شالیں ڈال رکھی تھیں۔ انہوں نے شالیں اپنے کندھوں سے اتار کر جھیکو اور مونیکا پر ڈال دیں۔

”اب بتاؤ! کیا ہوا؟ اور مس کور کہاں ہے؟“ ندیم نے جھیکو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ریچھ.....“ جھیکو نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل بیلا ہو رہا تھا۔ ”وہ ریچھ مس کور کو اٹھا کر لے گیا۔“

”کیا.....؟“ ندیم کے ساتھ دوسرے بھی اچھل پڑے۔ ”تفصیل بتاؤ! یہ سب کیسے

نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر سوالیہ نگاہوں سے جھیکو اور مونیکا کی طرف دیکھنے لگی۔

”پانی بہت ٹھنڈا ہے۔“ جھیکو نے جواب دیا۔

”ساری تھکن اتر جائے گی۔ یوں بھی گلگت سے روانہ ہونے کے بعد اب تک نہانے کا موقع نہیں مل سکا۔ چلو! تم لوگ بھی آؤ۔“ مس کور اکبتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف ہٹ کر کھڑے ہو کر لباس اتارنے لگی۔

ان تینوں کا تعلق ان ممالک سے تھا جہاں معاشرے میں عریانی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ان تینوں نے جینز، شرٹس اور جریاں پہن رکھی تھیں۔ مس کور اکسیاہ بدن ہلکی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر جھیکو اور مونیکا کی طرف دیکھا۔ پھر پانی میں چھلانگ لگا دی۔

پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ایک لمحہ کو تو مس کور اکپکا کر رہ گئی۔ لیکن پھر کسی ماہر پیراک کی طرح تیرنے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی مونیکا اور جھیکو نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔ تینوں تیرتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اچھالتی اور ٹراوٹ مچھلیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔

مس کور اب سردی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ کافی دیر سے پانی میں تھی۔ وہ پانی سے نکل کر جھاڑیوں کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کے سیاہ بدن پر پانی کی بوندیں پھسل رہی تھیں۔

جھیکو اور مونیکا پانی میں ایک دوسرے پر چھینٹے اچھال رہی تھیں۔ مونیکا نے جھاڑیوں کے قریب کھڑی ہوئی مس کور کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اسے سینے میں سانے رکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مس کور اکے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں میں بھور۔

بالوں والا ایک ریچھ دبے قدموں مس کور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”کورا..... بھاگو..... ریچھ.....“ مونیکا خوفزدہ لہجے میں چیخی۔

مس کور انے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ صرف چار قدم کے فاصلے پر ریچھ کو دیکھ کر اس منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے پانی کی طرف دوڑ لگانا چاہی مگر بھاری بھر کم ریچھ اس زیادہ پھر تیزا ثابت ہوا۔ اس نے لپک کر مس کور کو اپنی ہانہوں کے حلقے میں دبوچ لیا

سے جسم میں سنسنی کی ایک لہریں دوڑ گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مس کورا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی ہوگی چنانچہ ریچھ نے پنچے مار کر زخمی کر دیا ہو گا۔

☆

ہوا.....؟ ریچھ مس کورا کو لے کر کس طرف گیا ہے؟“

”ہم وہاں کھاڑی میں نہا رہی تھیں۔“ اس مرتبہ مونیکا نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔  
”مس کورا ہم سے پہلے پانی سے باہر آگئی۔ وہ لباس پہننا چاہتی تھی کہ قد آدم جھاڑیوں میں سے اچانک ہی ایک بھورے بالوں والے ریچھ نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے اٹھا کر جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔“

”ریچھ کس طرف گیا ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”ادھر..... بلندی پر..... پائن کے جنگل کی طرف۔“ مونیکا نے اس طرف اشارہ کیا جدھر ریچھ مس کورا کو لے گیا تھا۔

”ریچھ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ دو تین آدمی میرے ساتھ چلو..... جلدی کرو۔“ ندیم نے چیخ کر کہا۔

رائفل اس وقت صرف محسن کے پاس تھی۔ اعتبار گل دوڑ کر غار سے تین رائفلیں اٹھا لیا اور ایک رائفل ندیم اور ایک قابوس کو دے دی گئی۔

”تم لوگ غار میں چلو۔ ہم مس کورا کی تلاش میں جا رہے ہیں۔“ ندیم نے کہا اور محسن قابوس اور اعتبار گل کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

وہ جھاڑیوں میں اس طرف دوڑنے لگے جس طرف ریچھ گیا تھا۔ وادی کا یہ حصہ طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک دھوپ میں رہتا تھا۔ بیشتر برف پگھل چکی تھی۔ البتہ کہیں کہیں اب بھی برف موجود تھی۔ وہ کچھ دور تک دوڑتے رہے۔ پھر جیسے ہی چڑھائی شروع ہوئی ان کی رفتار کم ہو گئی۔ ان کا رخ بلندی پر پائن کے جنگل کی طرف تھا۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے درختوں کا سلسلہ گنجان ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں کے سائے میں کہیں کہیں برف بھی جمی ہوئی تھی۔ وہ بدستور بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ ندیم اور محسن عام زندگی میں اس طرح چڑھائی چڑھنے کے عادی نہیں تھے۔ ان کا سانس پھولنے لگا۔

غار سے تقریباً پون میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ یکایک رک گئے۔ برف اور پتھروں پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ تازہ خون تھا۔ خون کے یہ دھبے دیکھ کر ندیم

جھاڑیاں کچھ دلی ہوئی سی نظر آرہی تھیں۔

”میرا خیال ہے وہ ریچھ اس غار میں ہے۔ ان جھاڑیوں میں بظاہر آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا مگر ہمیں غار کے دہانے تک ہر صورت میں پہنچنا ہے۔ محسن! تم دائیں طرف سے آگے بڑھو اور اعتبار گل! تم بائیں طرف سے۔ میں اور قابوس سامنے کی جھاڑیوں میں راستہ بناتے ہوئے جائیں گے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر ریچھ مس کوراکے بہت قریب ہو تو گولی مت چلانا ایسی صورت میں یہ کوشش کی جائے کہ کسی طرح ریچھ کو پہلے مس کوراسے دور ہٹایا جائے اور اس کے بعد اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جائے۔“ ندیم نے انہیں ریچھ سے نبرد آزما ہونے کی حکمت عملی سمجھاتے ہوئے کہا۔

اعتبار گل بائیں طرف بڑھنے لگا۔ ندیم اور قابوس وہیں کھڑے رہے۔ غار کا دہانہ ان کے بالکل سامنے تھا۔ محسن بڑے محتاط انداز میں دائیں طرف بڑا رہا تھا۔ جھاڑیوں کی خشک شاخیں ان کے پیروں کے نیچے دب کر چرچرا رہی تھیں۔ وہ تقریباً پندرہ قدم کا فاصلہ طے کر کے رک گیا۔ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس سے صرف چار قدم کے فاصلے پر بھورے بالوں والا ایک خوفناک ریچھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے ریچھ غالباً جھاڑیوں میں بیٹھا ہوا تھا اور کسی موقع کی تاک میں تھا اور اب موقع ملنے ہی وہ جھاڑیوں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

محسن پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ دماغ میں تیز سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ بچپن سے اپنے شہر کی گلیوں میں ریچھ کے تماشے دیکھتا آیا تھا۔ کئی مرتبہ ریچھ کو چھوا بھی تھا۔ مگر اس وقت بھورے ریچھ کو اچانک ہی اپنے سامنے دیکھ کر اس پر دہشت سی طاری ہو گئی تھی کیونکہ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ یہی ریچھ ان کی ایک ساتھی کو اٹھا لیا تھا۔

ریچھ ایک بھیاں موت کی صورت میں محسن کے سامنے کھڑا تھا۔ محسن کچھ دیر تک تو دہشت زدہ رہا۔ لیکن پھر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے رائفل سیدھی کرنے لگا۔ لیکن ریچھ اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر محسن کے سینے پر ہاتھ مارا۔ محسن کو یوں لگا جیسے اس کے سینے پر وزنی تھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ اسے پسلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ رائفل اس کے

مس کوراکور ریچھ نے بچے مار کر زخمی کر دیا ہو گیا ممکن ہے وہ اپنے آپ کو ریچھ کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہو اور ریچھ نے اسے دوبارہ پکڑنے کے چکر میں زخمی کر دیا ہو۔ بہر حال یہ خون مس کوراکے علاوہ کسی اور کا بھی ہو سکتا تھا کیونکہ یہ تو سوچنا ہی حماقت تھا کہ مس کورانے ریچھ کو زخمی کر دیا ہو گا۔ مس کوراکے زندگی بہر حال خطرے میں تھی اور جلد سے جلد اس کی مدد کو پہنچنا ضروری تھا۔

”پوری دادی میں ریچھ بکثرت پائے جاتے ہیں۔“ اعتبار گل نے کہا۔ ”سیاہ ریچھ عام طور پر انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اگر وہ کسی انسان کو دیکھ بھی لے تو کتر اگر گزر جاتا ہے۔ البتہ بھورے بالوں والا ریچھ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ یہ ریچھ بہت کم تعداد میں پائے جاتے ہیں لیکن ریچھ چیر پھاڑ نہیں کرتا۔ وہ اپنے دشمن خصوصاً انسانوں کو بانہوں کے حلقے میں لے کر اس قدر قوت سے بھینچتا ہے کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ سانس گھٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ خون کے یہ دھبے ظاہر کرتے ہیں کہ مس کوراکے زخمی ہو چکی ہے۔ ممکن ہے وہ ریچھ نہ ہو بلکہ کوئی اور درندہ ہو اور جیکو وغیرہ اسے ریچھ سمجھی ہوں۔“

”بہر حال وہ کوئی سا بھی درندہ ہو۔ اس تک جلد سے جلد پہنچنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو ہمارے بچنے سے پہلے وہ درندہ مس کوراکو ختم ہی کر ڈالے۔“ ندیم نے کہا اور وہ تیز تیز قدموں سے آگے چلنے لگے۔

انہیں کئی جگہ خون کے دھبے نظر آئے تھے اور خون کے یہ دھبے ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک بار پھر رک گئے۔ خون کے دھبے ایک تنگ سے غار کے دہانے تک انہیں لے آئے تھے۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی غار اس ریچھ یا درندے کا مسکن ہے۔ غار کے سامنے گنجان اور قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ کانٹے دار جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ غار تک پہنچنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ ایک جگہ سے

میرے سینے پر آن گری ہو۔“

”قابوس! تم محسن کو سنبھالو ہم غار کے اندر جا رہے ہیں۔“ ندیم نے کہا اور اعتبار گل کو اشارہ کرتا ہوا جھاڑیوں میں الجھتا ہوا غار کی طرف بڑھنے لگا۔

”بوشیاری سے.....! غار کے اندر کوئی اور ریچھ بھی ہو سکتا۔“ قابوس نے چیخ کر انہیں خبردار کیا۔ اس نے اپنی اور محسن کی رائفل کندھوں پر لٹکائی اور محسن کو سہارا دے کر جھاڑیوں سے دور نکال لے گیا۔

ندیم اور اعتبار گل رائفلیں سنبھالے بہت احتیاط سے جھاڑیوں میں چلتے ہوئے غار کی طرف بڑھتے رہے۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر وہ رک گئے۔

غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لیکن غار کے آخری حصے میں کسی حد تک اندھیرا تھا اور ان میں سے کسی کے پاس نارنج نہیں تھی۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ غار بظاہر خالی لگتا تھا۔ لیکن غار کی پیچلی دیوار کے قریب کوئی چیز دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ اس جگہ اندھیرے کے باوجود ان دونوں نے اسے پہچان لیا۔

وہ مس کورا تھی جو غار کی چٹان کے قریب بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ندیم نے قریب پہنچ کر ایک دو مرتبہ مس کورا کو آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ ندیم نے جھک کر مس کورا کے جسم کو چھوا لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا۔ وہ انگلیوں کی چپ چاپاٹ سے اندھیرے میں بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس کا ہاتھ خون سے تر ہو گیا تھا۔

”اعتبار گل.....!“ ندیم نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ ”مس کورا زخمی اور بے ہوش ہے۔ اسے اٹھا کر باہر لے چلو۔“

ان دونوں نے مل کر کورا کو اٹھایا اور اسے غار سے باہر لے آئے۔ غار کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آتے ہی مس کورا کو دیکھ کر ندیم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اعتبار گل کے جسم میں بھی سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے مس کورا کو زمین پر لٹا دیا۔ ندیم مس کورا کا جائزہ لینے لگا۔

مس کورا کے جسم کا گوشت بری طرح ادھڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے دانتوں سے بھنبھوڑا گیا ہو۔ چہرے اور گردن پر بے شمار گہری خراشیں تھیں جن سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔

ہاتھ سے گر گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پشت کے بل دور جھاڑیوں میں جا گرا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پسلیاں اندر دھنس گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سامنے کھڑی ہوئی موت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔

ریچھ اس سے صرف چار قدم کے فاصلے پر کھڑا دھاڑتا ہوا دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹ رہا تھا۔

ندیم اور قابوس پہلے محسن کی چیخ اور پھر ریچھ کے دھاڑنے کی آوازیں سن کر اچھل پڑے۔ وہ تیزی سے اس طرف دوڑے۔ اعتبار گل بھی دوڑتا ہوا اس طرف آگیا تھا۔ اور پھر ان کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ بے حد خوفناک تھا۔ محسن پشت کے بل جھاڑیوں میں پڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ دبا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے اور خوفناک ریچھ سینہ پینٹا اور دھاڑتا ہوا محسن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”محسن.....!“ قابوس چیخا۔ ”اپنی جگہ سے مت ہلنا۔“

ریچھ ان کی آواز سن کر ان کی طرف مڑ گیا اور دھاڑتا سینہ کو پیٹتا ہوا ان کی طرف بڑھنے لگا۔

”فائر.....!“ ندیم چیخا۔ ”گولی چلاؤ۔“

تینوں رائفلیں بیک وقت دھاڑیں اور ان کی طرف بڑھتے ہوئے ریچھ کے سینے اور پیٹ میں کئی سوراخ ہو گئے۔ اس کے جسم سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ مگر ریچھ بڑا جاندار تھا۔ کئی گولیاں کھانے کے باوجود ان کی طرف بڑھتا رہا۔ اعتبار گل نے ایک بار پھر رائفل کا ٹرائیگر بادیایا۔ اس مرتبہ گولی ریچھ کی پیشانی میں لگی۔ وہ لڑکھڑایا اور دھاڑتا ہوا جھاڑیوں میں ڈھیر ہو گیا۔ کتنی دیر تک اس کے منہ سے عجیب و غریب سی آوازیں نکلتی رہیں اور بالآخر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

قابوس نے دوڑ کر جھاڑیوں میں گرے ہوئے محسن کو اٹھایا۔ محسن کو سینے پر ریچھ کے ہاتھ کی ضرب کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

”تکلیف زیادہ تو نہیں.....؟“ قابوس نے اس کا سینہ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”تکلیف تو ہے۔“ محسن کراہا۔ اس ظالم کا ہاتھ تھا کہ چٹان۔ لگتا تھا جیسے کوئی چٹان ہی



ضرورت پڑتی ہے۔

ندیم اور موزیکا کے علاوہ تمام لوگوں کو غار سے باہر نکال دیا گیا۔ پانی گرم کر کے پہلے مس کوراکے زخموں کو صاف کیا گیا۔ زخم خاصے گہرے اور خوفناک قسم کے تھے۔ ڈریسنگ کرتے ہوئے بھی ریمینڈ کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور موزیکا کے تو باقاعدہ آنسو بہہ رہے تھے۔

”بہت زیادہ خون ضائع ہو چکا ہے۔ زخم بھی بہت گہرے ہیں۔ اس معمولی ڈریسنگ سے ہمیں زیادہ توقعات وابستہ نہیں رکھنی چاہئیں۔“ ریمینڈ نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”نہیں نہیں! ایسا نہ کہو ریمینڈ!“ موزیکا جلدی سے بول اٹھی۔

”حقیقت سے منہ موڑنا اپنے آپ کو بے وقوف بنانے کے مترادف ہو گا۔ اگر یہ زندہ فنگائی تو یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہو گا۔“ ریمینڈ نے کہا۔

مس کوراکے ڈریسنگ کے بعد اسے دو کمبل اوڑھادیے گئے اور غار میں آگ روشن کر دی گئی۔ گزشتہ رات بھی انہوں نے غار میں آگ جلائی تھی اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ غار میں ذرا سا بھی دھواں نہیں بھرا تھا۔ غار کی چھت میں غالباً ایسی پتلی پتلی دراڑیں تھیں جن کے ذریعے دھواں باہر نکل رہا تھا۔

مس کوراکے حالت دیکھ کر سب ہی کے دل بوجھل ہو گئے تھے..... اعتبار گل کھانا وغیرہ پکانے کی تیاری کرنے لگا لیکن سب ہی نے اسے کھانا تیار کرنے سے منع کر دیا۔ کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ قابوس نے صبح جو پہاڑی بکرا بٹکار کیا تھا وہ دوپہر کو کھایا گیا تھا۔ بکرے کا بھنا ہوا کچھ گوشت ابھی باقی تھا اس وقت بھی وہی گوشت تھوڑا تھوڑا کھالیا گیا اور اس کے ساتھ قبوہ بنالیا گیا تھا۔

دورات بھرا گھٹتے جا گئے رہے۔ دودو آدمی باری باری غار کے دہانے پر پہرہ دیتے رہے۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ سب کی نظریں مس کوراکے پر جمی ہوئی تھیں۔ رات بیتی جا رہی تھی مگر مس کوراکے حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس پر گہری بے ہوشی طاری تھی۔

مچ پانچ بجے کے لگ بھگ کراہنے کی ہلکی سی آواز سن کر موزیکا چونک گئی۔ وہ مس کوراکے

مس کوراکے کیسے فام ہونے کے باوجود دلکش نقوش کی مالک تھی مگر خراشوں سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ پیٹ پر بھی گہری اور لمبی لمبی خراشیں تھیں۔

مس کوراکے آنکھیں بند تھیں اور اس کے سینے کا بہت ہلکا سا زیر و بم بتا رہا تھا کہ اس میں زندگی کی رفق موجود ہے۔ ندیم نے اسے دو تین مرتبہ پکارا مگر کوراکے کوئی جواب نہیں دیا۔ ندیم اور اعتبار گل نے بڑی احتیاط سے کوراکے کو پلٹ کر دیکھا۔ اس کی پشت بھی بردہ طرح ادھڑی ہوئی تھی جیسے نوکیلے ناخنوں سے نوچا گیا ہو۔ اسے جس جگہ لٹایا گیا تھا وہ خور سے تر ہو چکی تھی۔

قابوس اور محسن بھی وہاں پہنچ گئے۔ کوراکے کی حالت دیکھ کر محسن کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ندیم نے اپنا کوٹ اتار کر کوراکے جسم پر ڈال دیا اور وہ چاروں اسے بڑی احتیاط سے اٹھا کر ڈھلان اترنے لگے۔

وہ اپنے کیمپ والے غار تک کا فاصلہ ایک گھنٹے سے پہلے طے نہیں کر سکے تھے۔ ان کے تمام ساتھی غار کے سامنے جمع تھے۔ انہیں دیکھ کر راشد اور گلریز دوڑتے ہوئے قریب آ گئے۔

مس کوراکے غار کے اندر لے جا کر زمین پر بچھے ہوئے نرم گدے پر لٹا دیا۔ خون تو سب ہی نے دیکھ لیا تھا۔ مگر موزیکا نے آگے بڑھ کر جیسے ہی مس کوراکے جسم پر سے کوٹ ہٹایا اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اگر قریب کھڑا ہوا راشد جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

ان میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ مگر ریمینڈ نے فرسٹ ایڈ کی باقاعدہ تربیت لے رکھی تھی۔ سب جانتے تھے کہ یہ فرسٹ ایڈ کا کیس نہیں ہے۔ کوراکے کو ہسپتال لے جانے کی شدید ضرورت تھی جہاں اسے ہر طرح سے طبی امداد فراہم کی جاتی۔ وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ شدید زخموں اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مس کوراکے زندہ بچنا مشکل ہے۔ مگر دل کی تسلی کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

ریمینڈ نے فرسٹ ایڈ بکس نکال لیا۔ تمام ادویات راوپلنڈی اور اسلام آباد سے ریمینڈ کی مرضی کے مطابق اور خاص مقدار میں خریدی گئی تھیں۔ وہ کوہ پیما کی مختلف مہمات میں حصہ لے چکا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ اس قسم کی مہمات میں کس قسم کی ادویات کی

کے قریب ہی جسم پر کھیل پھینک دیا۔ من پر پڑی تھی۔ غار میں چونکہ رات بھر آگ جلتی تھی جس سے اندر زیادہ سردی نہیں تھی اور اس لئے بعض لوگوں نے اپنے سلیپنگ بگ نہیں کھولے تھے۔

کراہنے کی آواز سن کر مونیکا نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر فوراً ہی مس کورا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مس کورا بولے بولے کراہتے ہوئے سر ہٹ رہی تھی۔

”کورا..... مس کورا..... کیسی ہو تم.....؟“ مونیکا نے اس پر جھکتے ہوئے نرم ہاتھ میں کہا۔

”موت..... موت..... وہ..... وہ میرا..... پیچھا کر رہی ہے.....“ مس کورا نے گھبراہٹ میں کہا۔

”نہیں! ہم نے تمہیں موت کے منہ سے نکال لیا ہے۔ تم معمولی زخمی ہو اور یہ زخم اس سے بچنے کے لئے پوری قوت سے دھلان پر دوڑی جا رہی تھی۔ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔“ مونیکا نے کہتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

مس کورا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ کراہت تھی۔ ندیم وغیرہ بھی مونیکا کی آواز سن کر اٹھ گئے تھے۔ وہ سب مس کورا کے گرد جمع ہو گئے اور اسے تسلیاں دینے لگے کہ یہ معمولی زخم ہیں اور وہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔

”ہم نے اس ریچھ کو مار دیا ہے۔“ محسن نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ایسا کرتے ہوئے ہوش ہو گئی۔

اس کے سینے میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی تھی اور اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلی تھی۔ رات کو اس کے سینے پر مالش وغیرہ لگائی گئی تھی جس سے اسے خاصا سکون ملا تھا لیکن اس وقت آگے جھکنے سے سینے میں اچانک ہی درد جاگ اٹھا تھا۔

”محسن.....!“ ریمینڈ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سہارا دیتے ہوئے کہا۔ ”تم مکمل اوڑھ کر لیٹ جاؤ۔ اگر سینے پر ہو الگ گئی تو تکلیف بڑھ جائے گی۔“

محسن کچھ دیر تک سینہ سہلاتا رہا اور پھر مکمل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اس کے سینے کا درد بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔

انتظار گل نے موقع سے فائدہ اٹاتے ہوئے قبوہ بنالیا۔ اس وقت وہ لوگ واقعی اس کی طلب محسوس کر رہے تھے مس کورا ابھی کسی نہ کسی طرح سہارا دے کر بٹھادیا گیا اور ایک

آپ قبوہ اسے بھی پلا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد مس کورا اس قابل ہو سکی کہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی کچھ تفصیل بتا سکے۔ اگرچہ بولنے سے اسے تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ رک رک کر بتا رہی تھی۔

”بیچھ مجھے اٹھا کر بھاگا تو کچھ دیر تک تو میں اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے ہاتھ پیر چلاتی رہی۔ پھر خوف کی شدت سے بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو میں برف پر پڑی تھی اور ریچھ میرے قریب کھڑا دھاڑتا ہوا اپنا سینہ پیٹ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دھلان کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ریچھ کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر وہ بھی میرے پیچھے بھاگا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا رخ کس طرف تھا لیکن موت میرے تعاقب میں تھی اور میں اس سے بچنے کے لئے پوری قوت سے دھلان پر دوڑی جا رہی تھی۔

دفعۃً پتھروں پر میرا پیر پٹ گیا۔ میں لڑکھڑا کر گری۔ اس طرح گرنے سے میرے منے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مگر موت کو اپنے سر پر دیکھ کر میں اٹھ کر دوبارہ بھاگی لیکن اس تیرہ چند قدم تک ہی دوڑی تھی کہ ریچھ نے مجھے دبوچ لیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس نے کیلے پنچوں سے میری پشت کو بری طرح نوچ ڈالا۔ میں تکلیف اور خوف سے بری طرح زاری تھی۔ ریچھ مجھے اٹھا کر ایک بار پھر بلندی کی طرف چلنے لگا اور میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔

دوبارہ ہوش میں آئی تو میں نے اپنے آپ کو ایک غار میں پایا۔ میری پشت پر گہری زخموں سے خون رس رہا تھا اور میں بہت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ریچھ غار میں نہیں تھا۔ میں اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی غار کے دہانے کی طرف مارا تہ بٹاتی ہوئی ایک طرف دوڑنے لگی۔ لیکن اچانک ہی ریچھ جھاڑیوں سے نکل کر

میرے سامنے آگیا۔ اس نے مجھے اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ میں نے ایک بار پھر اٹھ کر گئے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ بھی ریچھ نے مجھے چند قدم سے زیادہ دور نہیں جانے دیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے اٹھا کر پھینک دیا اور میرے اوپر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کا ایک میرے جسم کے ایک طرف تھا اور دوسرا پیر دوسری طرف۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ وہ کچھ تک اس طرح کھڑا سینہ کو بلی کر تار مارا اور دھاڑتا رہا۔ پھر وہ میرے اوپر جھک کر میرے

تھا۔

مس کورا کا انتقال دوپہر کے وقت ہوا تھا۔ اسے آبشار کے قریب ندی کے کنارے دفن کر دیا گیا۔ چیکو اور مونیکا نے آس پاس کے پودوں سے پھول توڑ کر قبر پر پھولوں کا انبار لگا دیا تھا۔

دورات بھی انہوں نے غار ہی میں گزاری تھی اور پھر صبح سویرے وہ روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔

ان چھ دنوں کے دوران وہ ندی کے کنارے دور دور تک کا جائزہ لے چکے تھے۔ اس منہ زور ندی میں میلوں دور تک کوئی بھی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے اسے پار کیا جاسکتا۔ مسلسل ڈھلان ہونے کی وجہ سے پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور اس قدر تیز رفتار پانی میں ندی عبور کرنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ البتہ آبشار کے نیچے اوپر سے گرتے ہوئے پانی کی چادر کے پیچھے پہاڑ کی کھوہ میں ایک ایسا تنگ ساراستہ موجود تھا جس سے دوسری طرف پہنچا جاسکتا تھا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ روانہ ہو گئے۔ آگے بڑھنے سے پہلے انہوں نے مس کورا کی قبر پر کچھ اور پھول ڈال دیئے تھے۔ یہ مس کورا کے لئے ان کا آخری نذرانہ عقیدت تھا۔

آبشار کے پانی کی دبیز چادر کے پیچھے بھی پانی کا ایک بہت بڑا اور گہرا سالتاب سا بنا ہوا تھا۔ یہ تالاب پہاڑ کی کھوہ کے اندر تک چلا گیا تھا۔ تالاب اور پہاڑی دیوار کے ساتھ تقریباً سات آٹھ فٹ چوڑی ایک پٹی سی تھی۔ پہاڑ کے سینے سے رسنے والا پانی اس پٹی پر بھی بہہ رہا تھا لیکن اس پانی کی وجہ سے پٹی پر سے گزرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ پٹی کھوہ کے کافی اندر تھی۔ سامنے پانی کی چادر ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اندھیرا تھا۔ وہ سب خجروں پر سوار تھے اور سب ہی نے نارچیں روشن کر رکھی تھیں۔ اس پٹی پر سے گزرتے ہوئے ان سب پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ ان کے اوپر پہاڑ کی چھت پر سے بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ آبشار کے گرنے سے شور اس قدر زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

جسم کو خونخوار پنوں سے نوچنے لگا۔ وہ شاید پاگل ہو گیا تھا۔ میں بری طرح چیخ رہی تھی میرے چپٹنے سے شاید اس کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر موقع پا کر بھاگے کوشش کی مگر اس نے پھر مجھے دبوچ لیا اور مجھے بار بار پٹخ رہا تھا اور خونخوار پنوں میں بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد..... اب ہوش آیا ہے۔“

مس کورا کی آواز میں نقاہت تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مونیکا نے ایک دوسرے سے پکارا مگر مس کورا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا۔

مس کورا پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔

دن نکل آیا تھا۔ سامنے وادی میں دھوپ پھیلنے لگی۔ برف پر چمکتی ہوئی دھوپ آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ جب غار سے باہر آتے تو آنکھوں پر سیاہ شیشوں والا لگا لیتے۔

مس کورا کی وجہ سے وہ آج بھی آگے روانہ نہیں ہو سکے۔ وہ مسلسل بے ہوش ہو رہی تھی۔ ہوش میں ہوتی بھی تو اس قدر شدید زخمی حالت میں اسے ساتھ لے کر سفر کرنا ممکن تھا۔

اس سے اگلا دن بھی اسی طرح بیت گیا۔ اس دوران مس کورا دوسرے چند لمحوں لئے ہوش میں آئی تھی اس کے بعد پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ تین چار روز گزر گئے حالت میں کسی قسم کی بہتری کے آثار دکھائی نہیں دیئے اس کے برعکس گزرنے والے لمحے کے ساتھ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ مسلسل بے ہوش تھی۔

اس دوران ندیم اور اس کے ساتھی دودو کی ٹولیوں میں گھوم پھر کر آس پاس پہاڑوں کا جائزہ لیتے رہے کہ شاید ان اطراف میں گمشدہ طیارے کا کوئی سراغ ملے لیکن اس معاملہ میں بھی انہیں کوئی کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

چھٹے روز مس کورا مر گئی۔ وہ مسلسل چھ روز تک جان کنی کی کیفیت میں مبتلا رہی۔ مس کورا کی موت کا افسوس سب ہی کو ہوا تھا۔ مگر یہ اطمینان بھی ہوا کہ اسے زندہ اس کرب سے نجات مل گئی تھی جس نے اس کی زندگی کو موت سے زیادہ بھیانک

گیا تھا اور اب فالٹو نچر اسے مل گیا تھا۔

دو پہر تک ان کا سفر جاری رہا۔ دو پہر دو بجے وہ لوگ کھانا کھانے کے لئے کچھ دیر کے لئے ایک جگہ رکے اور پھر آگے روانہ ہو گئے۔ پانچ بجے کے قریب پہاڑوں کے سائے گہرے ہو گئے تھے انہوں نے پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی مناسب جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ اس وقت ایک چٹان کے دامن میں تھے۔

اعتبار گل نے چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ کوئی غار ہے۔ اس غار میں رات گزارنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

غار تقریباً سو فٹ کی بلندی پر تھا اور ایک کشادہ راستہ وہاں تک چلا گیا تھا۔

”چلو! دیکھ لیتے ہیں۔“ ندیم نے کہا۔

سب نے اپنے نچروں کے رخ غار کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیے۔ غار کے سامنے ایک بہت کشادہ چوڑا سا تھا۔ پتھروں میں جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ وہ نچروں سے اتر گئے۔

ندیم، گلریز اور قابوس غار میں داخل ہو گئے۔ باقی لوگ باہر ہی رک گئے تھے لیکن پھر کچھ سوچ کر جیکو بھی ان کے پیچھے ہی غار میں داخل ہو گئی۔

غار کافی کشادہ تھا اور اندر غالباً دو در تک چلا گیا تھا۔ قابوس اور گلریز نے رائفلیں تان رکھی تھیں اور ندیم نارچ روشن کئے ہوئے تھا۔ یہ غار کسی درندے کا مسکن بھی ہو سکتا تھا اس لئے وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

غار کے فرش پر خشک جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں اور چھت سے زمین تک جا بجا مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ قابوس اور گلریز اپنی رائفلوں سے جالے ہٹاتے جا رہے تھے۔ جیکو ان سے تقریباً دس قدم پیچھے تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی نارچ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے ایک شاخ اٹھا رکھی تھی جس سے وہ مکڑیوں کے جالے ہٹاتی جا رہی تھی۔ وہ ندیم وغیرہ سے قدرے بائیں طرف ہٹ کر چل رہی تھی۔

ایک جگہ مکڑیوں کا ڈھیر سا جمع تھا۔ جیکو جالے ہٹاتی ہوئی جیسے ہی مکڑیوں کے اس ڈھیر کے قریب پہنچی اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔ مکڑیوں کے ڈھیر پر ایک انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ ٹکا ہوا تھا۔ دہشت زدہ انداز میں چیختے ہوئے پیچھے ہٹنے کی کوشش میں جیکو کا

اس سفر کے دوران جب پہلا نچر پہاڑ پر سے گر کر ہلاک ہوا تو ایک نچر کم ہو گیا تو ان جیکو ندیم کے ساتھ سفر کرتی رہی تھی۔ پچھلے پڑاؤ میں شرواز کی پر اسرار ہلاکت کے نہ اس کا نچر جیکو کو مل گیا تھا اور اب مس کوراک کی موت کے بعد ایک نچر فالٹو ہو گیا تھا جسے سامان والے ایک نچر کے پیچھے باندھ دیا گیا تھا۔

پہاڑ کی کھوہ میں چٹانی دیوار اور پانی کے گہرے تالاب کے درمیان اس کشادہ پٹی پر، ایک لائن میں چل رہے تھے۔ محسن کا نچر تیسرے نمبر پر تھا۔ نجبانے اسے کیا سوچا کہ ندیم کے نچر سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس پتھریلی پٹی پر تالاب والی سائیڈ پر تھا۔ دقت نچر کا اگلا پیر پھسل گیا۔ محسن نے نچر کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور نچر گہرے پانی میں گر گیا۔ محسن بھی نچر کے ساتھ ہی تالاب میں گر گیا۔

یہ غنیمت تھا کہ محسن کے پیر رکاب میں نہیں تھے۔ پانی میں گرتے ہی اس نے نچر پر چھلانگ لگا دی تھی اور پتھریلی پٹی کے کنارے پر گرفت جمانے کی کوشش کرنے لگا مگر کنارے کے پتھر بہت چکنے تھے اور اس کے ہاتھ بار بار پھسل رہے تھے۔

نچر بری طرح تھنہا رہا تھا۔ وہ پانی میں تیرتا ہوا مسلسل آبشار کی طرف جا رہا تھا اور بالآخر وہ اوپر سے گرتے ہوئے آبشار کے نیچے پہنچ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پانی میں غائب ہو گیا۔ پانی محسن کو بھی آبشار کی طرف دھکیل رہا تھا اور وہ قریب رہتے ہوئے پتھروں گرفت جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نچر کا انجام وہ دیکھ چکا تھا اور اپنا انجام سوچ کر بھی اس دہشت سی طاری ہو رہی تھی۔ اگر وہ تیرنا نہ جانتا ہوتا تو اب تک وہ بھی نچر کے ساتھ آبشار کے نیچے پہنچ چکا ہوتا اور اس کی لاش تیز رفتار ندی میں کہیں بہہ رہی ہوتی۔

ندیم اور گلریز نے فوراً ہی اپنے نچروں سے چھلانگ لگا دی۔ اس پٹی پر بھی پانچ چھ پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے نیچے چکنے پتھر تھے۔ نچر سے چھلانگ لگاتے ہی گلریز کا پیر پٹ گیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا اور اس سے پہلے کہ وہ بھی تالاب میں جا کر تاندیم نے لپک کر اسے سنبھال لیا اور پھر ان دونوں نے بڑی مشکل سے محسن کو پانی میں سے نکالا تھا۔

کتنی دیر تک ٹھنڈے پانی میں رہنے سے محسن کا سارا جسم سن ہو رہا تھا اور وہ سردی کا پٹنے لگا تھا۔ آبشار کے دوسری طرف پہنچ کر محسن کی وجہ سے انہیں تقریباً ایک گھنٹہ پڑا۔ محسن کی حالت سنبھلی تو وہ ایک بار پھر آگے روانہ ہو گئے۔ محسن والا نچر تو ندی میں

چکا ہے جہاں اس کے بلے کو فضا سے بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے تمام مسافر ختم ہو چکے ہوں گے۔ ہمیں اپنے عزیزوں کو مردہ تصور کر کے صبر کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن ہم ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مردوں کی تلاش میں ہم مزید دو جانیں ضائع کر چکے ہیں۔ اب آگے پتہ نہیں کیا ہو گا.....؟ مجھے تو آبادی سے سینکڑوں میل دور اس ویرانے سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ لگتا ہے ہم زندگی بھر اس سرد جہنم میں بھٹکتے رہیں گے اور برف سے ڈھکے ہوئے انہی پہاڑوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے یا درندوں کا شکار ہو جائیں گے۔ “محسن خاموش ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آرہی تھی۔

”اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں مسر محسن.....!“ مونیکا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو واپسی کا بھی کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو کہ ہم زندگی بھر اس سرد جہنم میں بھٹکتے رہیں گے۔“ محسن کی باتوں سے مونیکا بھی مایوسی کا شکار ہو رہی تھی۔ ان کے باقی ساتھی غار کے اندر تھے۔ ندیم وغیرہ غار میں گھوم پھر کر اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ غار کافی کشادہ تھا اور پہاڑ کے اندر بہت دور تک چلا گیا تھا۔

تقریباً بیس گز آگے بڑھنے کے بعد انہیں دو اور ڈھانچے نظر آئے۔ ان میں ایک تو انسانی ڈھانچہ تھا اور دوسرا کسی گھوڑے یا خنجر کا۔ انسانی ڈھانچہ پہلو کے بل پڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ کی کلائی کی ہڈی میں چار موٹی موٹی طلائی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک انگلی میں انگوٹھی بھی تھی۔ سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھی کا نگینہ نارنج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ گردن کی ہڈی کے قریب بھی سونے کا ایک نیپلس پڑا ہوا تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ان لوگوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کسی عورت کا ڈھانچہ تھا۔

ڈھانچے کا جائزہ لینے کے بعد ندیم لمحے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر معنی خیز نگاہوں سے قابوس کی طرف دیکھنے لگا۔ قابوس اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا جس کا مطلب تھا کہ انہیں ان زیورات کو چھوٹا بھی نہیں چاہئے۔

وہ اس عورت کے ڈھانچے کو چھوڑ کر کچھ دیر تک گھوڑے یا خنجر کے ڈھانچے کو دیکھتے رہے۔ پھر غار میں مزید آگے بڑھنے لگے۔ دفعۃً ندیم کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے مڑ کر عورت کے ڈھانچے کی طرف دیکھا اور پھر معنی خیز انداز میں سر ہلادیا۔

پیر ایک لکڑی سے ٹکرا گیا۔ انسانی ڈھانچہ اپنی جگہ سے لڑھک کر چمکیو پر اس طرح گرا جیسے اس سے معافتہ کر رہا ہو۔

چمکیو بری طرح چیخ رہی تھی۔ غار اس کی دہشت ناک چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ندیم وغیرہ مڑ کر تیزی سے اس کی طرف دوڑے اور پھر چمکیو کو ایک انسانی ڈھانچے کے نیچے دبے دیکھ کر ندیم کے منہ سے بھی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

صورتحال بڑی مضحکہ خیز تھی اور تشویشناک بھی۔ مضحکہ خیز اس لئے کہ چمکیو زمین پر پڑی تھی اور اس کے اوپر ڈھانچہ اس طرح گرا تھا جیسے اس نے اپنے دشمن کو شیعے میں کس رکھا ہو اور چمکیو بہت ہی خوفناک انداز میں مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر غار کے باہر کھڑے ہوئے ان کے دوسرے ساتھی بھی دوڑتے ہوئے اندر آگئے تھے انہوں نے رائفلیں اس طرح تان رکھی تھیں جیسے کسی کو دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دیں گے۔

ندیم اور قابوس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چمکیو کے اوپر سے ڈھانچہ اٹھانا چاہا تو ڈھانچے کی بیشتر ہڈیاں الگ الگ ہو کر بکھر گئیں۔ اس کی کھوپڑی تو پہلے ہی گر کر الگ ہو چکی تھی اور چمکیو سے چند فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔

انہوں نے ڈھانچے کی ہڈیاں اٹھا کر ایک طرف پھینک دیں اور ندیم چمکیو کو اٹھانے کے لئے جیسے ہی جھکا چمکیو چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ اس نے اس زور سے بھینچا تھا کہ ندیم کو اپنے سینے کی ہڈیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ دھان پان سی لڑکی تھی اور غالباً خوف کی شدت سے اس میں بے پناہ طاقت آگئی تھی۔ ندیم نے بڑی مشکل سے چمکیو کو اپنے آپ سے الگ کیا۔ مونیکا نے آگے بڑھ کر چمکیو کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اسے سہارا دے کر غار سے باہر نلے آئی۔ خوف کی شدت سے چمکیو کا جسم ابھی تک ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ محسن بھی باہر موجود تھا۔ وہ غار کے اندر نہیں گیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر چمکیو نے رُک رُک کر خوفزدہ لہجے میں ڈھانچے کے بارے میں بتایا۔

”اب میں سوچ رہا ہوں کہ شاید اس مہم پر آکر ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔“ محسن نے ندیم سے لہجے میں کہا۔ ”حکومت اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اس گمشدہ طیارے کو تلاش نہ کر سکی۔ وہ بد قسمت طیارہ پہاڑوں میں کسی ایسی جگہ گر کر تباہ“

چیکو پر گرنے والا ڈھانچہ کسی مرد کا تھا اور یہ دوسرا ڈھانچہ کسی عورت کا تھا۔ یہ دونوں شاید ان پہاڑوں میں بھٹک کر ان کی طرح رات گزارنے کے لئے اس غار میں ٹھہرے ہوں گے اور کسی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی اور ان کے ساتھ ہی گھوڑا یا خیر بھی مر گیا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ ان کے لباس کہاں تھے.....؟ کیا مرنے سے پہلے انہوں نے لباس اتار دیئے تھے؟ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر کیوں تھے.....؟ ندیم کا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس غار میں ٹھہرنے والے صرف وہی دونوں تھے۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس گھوڑے یا خیر اور ان دونوں کو کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو گا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ لیکن وہ بے لباس کیوں تھے.....؟ نجانے ندیم کو یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی بھی ضرور رہا ہو گا اور عین ممکن ہے وہ تیسرا آدمی ان دونوں کا دشمن ہو اور انہیں قتل کر کے ان کے لباس بھی اتار لے گیا۔

یہی سوچتا ہوا وہ مزید آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر ایک جگہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ ایک چبوترہ سا تھا جس پر کچھ چیزیں پڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہ لوگ نارچوں کی روشنی میں ان چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔

☆

وہ ایک عورت اور ایک مرد کے کپڑے تھے جن پر گرد جمی ہوئی تھی۔ ندیم ان کپڑوں کو اٹھا کر جھاڑنے لگا۔ گرد صاف ہونے کے بعد کپڑوں کی اصل ہیئت سامنے آگئی لیکن وہ کپڑے بہت بوسیدہ ہو چکے تھے اور غالباً کئی برسوں سے یہاں پڑے تھے۔ ان کپڑوں کی تراش اور بناوٹ ظاہر کرتی تھی کہ یہ انہی پہاڑی علاقوں میں ہی استعمال ہوتے تھے۔ سیاہ مخمل کی ایک اونچی ٹوپی بھی تھی نیچے سے جس کے کنارے کسی قدر اوپر کو خم کھائے ہوئے تھے۔ سیاہ مخمل پر سفید دھاگے سے ٹوپی کے سامنے کے رخ پر ایک پھول کڑھا ہوا تھا۔

عورت کے ڈھانچے کے ساتھ پڑے ہوئے زیورات کی بناوٹ اور یہ کپڑے دیکھ کر ندیم کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان دونوں کا تعلق انہی پہاڑوں میں آباد کسی بستی سے تھا۔ لیکن وہ اس غار میں کیسے آئے اور ان کی موت کیسے واقع ہوئی اور وہ دونوں بے لباس کیوں تھے؟ یہ ایک ایسا معمہ تھا جو فی الحال حل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

”ان کپڑوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں انہی پہاڑوں میں واقع کسی بستی کے رہنے والے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چند میل کے اطراف میں کوئی بستی موجود ہے۔“ ندیم نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں!“ قابوس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مخمل کی یہ لمبی سی ٹوپی دیکھ رہے ہو؟“ اس نے ٹوپی اٹھالی۔ ”یہ ٹوپی بھی عورت ہی کے لباس کا ایک حصہ ہے اور یہ لباس اور خصوصاً یہ ٹوپی وادی گلگت، ہنزہ یا وزارت کے علاقوں میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کی لمبی اور اونچی ٹوپیاں وادی لداخ کی رہنے والی عورتیں پہنتی ہیں۔

”وادی لداخ!“ ندیم اچھل پڑا۔ لداخ کا نام سن کر اس کے قریب کھڑے ہوئے پانڈے کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ ”لیکن لداخ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ان دونوں کا تعلق اگر لداخ سے تھا تو یہ یہاں تک کیسے پہنچے اور اس غار میں

اور یہ کو برا جانے کب سے اسی کے لباس میں بیسرا کئے ہوئے تھا۔ قابوس نے محتاط انداز میں ایک بار پھر رائفل کی نال سے ڈھانچے کے لباس کو جھاڑا۔ اس مرتبہ زیادہ گرداڑی اور ڈھانچہ بھی لڑھک کر ایک طرف گر گیا۔

ڈھانچے کے جسم پر سیاہ کوٹ تھا جو ڈھانچے کے گرنے سے سامنے سے کھل گیا تھا۔ کوٹ کی انرونی جیب سے کچھ کاغذات جھانکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ندیم نے جھک کر بڑے محتاط انداز میں وہ کاغذات باہر کھینچ لئے۔ ان کاغذات میں چار انچ چوڑا اور سات انچ لمبا خاکی رنگ کا ایک لفافہ بھی تھا۔ اس میں بھی کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ ندیم نے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی تو کچھ بھارتی کرنسی نوٹ بھی برآمد ہوئے۔

نارچ کی روشنی میں خاکی لفافے پر اوپر والے کونے میں بھارتی پرچم ترنگا چھپا ہوا تھا۔ یہ لفافہ اور بھارتی کرنسی نوٹ دیکھ کر پانڈے اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مگر شاید ان دونوں میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

دفعۃً بائیں طرف پھنکار سن کر ندیم نے نارچ کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اس طرف ایک اور کوبرا اچھن پھیلائے پھنکار رہا تھا۔ قابوس نے فائر کر کے اس کی بھی کھوپڑی اڑا دی۔

”جلدی نکلو یہاں سے ورنہ کچھ عرصے بعد آنے والوں کو یہاں ہمارے بھی ڈھانچے پڑے ہوئے ملیں گے۔“ قابوس نے اشارہ کیا۔

ندیم نے بھارتی کرنسی نوٹ، کاغذات اور براؤن رنگ کا وہ پھولا ہوا لفافہ پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا اور وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے غار سے باہر آگئے۔

”اندر فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟“ راشد نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہم غار کے اندر سانپوں کا شکار کھیل رہے تھے۔“ قابوس نے جواب دیا۔ ”کیمپ لگانے کے لئے ہمیں کسی اور جگہ کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ اس طرف چلو۔“ اس نے ڈھلان کی طرف اشارہ کیا۔

اور بالآخر تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے ایک چھوٹی سی گنگناتی بوٹی ندی کے کنارے کیمپ لگا دیا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر تک الاؤ کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر دو

ان کی موت کیسے واقع ہوئی؟“

”یہ معمر حل کرنا شاید ہمارے لئے ممکن نہ ہو۔ اور ہمیں اس میں الجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس غار میں رات بسر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ غار رہائش کے لئے مناسب نہیں ہے۔ ہمیں کوئی اور جگہ تلاش کرنا ہوگی۔“ قابوس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کیمپ لگانے کے لئے کوئی اور جگہ تلاش کر لیں گے۔ مگر اس غار کا ذرا تفصیل سے معائنہ تو کر لیں۔“ ندیم نے کہا۔

غار میں اب ندیم کے ساتھ قابوس اور پانڈے ہی رہ گئے تھے۔ اعتبار گل، مگریر اور راشد باہر چلے گئے تھے۔ ندیم آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً بیس گز مزید آگے جانے کے بعد ندیم ٹھٹھک کر رُک گیا۔ یہاں غار قدرے تنگ ہو کر بائیں طرف مڑ گیا اور موڑ گھومتے ہی نارچ کی روشنی میں جو چیز نظر آئی تھی اسے دیکھتے ہی ندیم کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پانڈے اور قابوس کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر پورا مردانہ لباس تھا۔ پیروں میں جوتے بھی تھے۔ البتہ اونٹنی ٹوپی اس کے بائیں طرف زمین پر پڑی تھی۔ ٹوپی اور لباس پر گرد کی جہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر دل پر عجیب سی دہشت طاری ہو رہی تھی۔ اس ڈھانچے کے بیٹھنے کے طریقے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جیسے کسی تکلیف کی وجہ سے وہ چٹان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور پھر بیٹھے ہی بیٹھے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

ڈھانچہ پوری طرح نارچ کی روشنی میں تھا۔ قابوس نے ایک قدم آگے بڑھ کر رائفل کی نال سے ڈھانچے کا لباس جھاڑا۔ لباس پر جمی ہوئی گرداڑی اور اس کے ساتھ ہی ان تینوں کو بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ ایک سیاہ کوبرا اچھنکارتا ہوا ڈھانچے کے لباس سے نکل کر باہر آ گیا تھا اور اب خوفناک پھن پھیلائے بار بار زبان باہر نکال رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سیاہ کوبرا کسی پر حملہ کرتا قابوس نے اس کے پھن کو رائفل کی گولی سے اڑا دیا۔

گولی کی آواز غار میں گونج کر رہ گئی۔ اب اس ڈھانچے کی موت کی وجہ ندیم کی سمجھ میں آگئی۔ اسے اسی سانپ نے ڈسا ہوگا

ندیم نے کہا۔ ”تم لوگوں کو شاید یاد ہو گا کہ کئی سال پہلے بھارت نے اسرائیل کے ساتھ مل کر کہوٹہ میں پاکستان کے ایٹمی پلانٹ کی تباہی کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کارروائی میں حصہ لینے کے لئے کیل کانٹوں سے لیس بھارت کے جیٹو اڑیا رے سرینگر کے ہوائی اڈے پر پہنچ چکے تھے۔ ان طیاروں کے پائلٹ اسرائیلی تھے۔ وہ طیاروں میں بیٹھے سگنل کا انتظار کر رہے تھے لیکن عین اوقات پر پاکستان کو بھارت اور اسرائیل کی سازش کا پتہ چل گیا۔ بھارت کو بھی اطلاع مل گئی کہ پاک فضائیہ کے شاہین جیٹو اڑیا روں کا استقبال کرنے کے لئے اپنی فضاؤں میں محو پرواز ہیں۔ اس لئے بھارت نے اپنے اس منصوبے پر عمل روک دیا۔ بعد میں اسرائیلی حکومت نے تو یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس نے بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف اس قسم کی سازش کی تھی مگر بھارت نے تسلیم نہیں کیا تھا۔“ ندیم چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ باری باری محسن اور قابوس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ان کاغذات پر اگرچہ تاریخ آج سے کئی سال پرانی ہے مگر ان کی تحریر بھی ایک ایسی ہی سازش کی تفصیل پر مبنی ہے۔ اس میں جیٹو اڑیا روں والے منصوبے کی ناکامی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف اس گھناؤنی سازش کی تفصیل ہے جس کے نتیجے میں 1971ء میں پاکستان دولخت ہوا تھا اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا گیا تھا۔ اس سازش میں بعض کشمیر میں رہائش پذیر لیڈروں کے نام بھی ہیں جو بظاہر تو مقبوضہ کشمیر میں رہتے ہوئے پاکستان کے حق میں نعرے بلند کرتے رہتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بھارتی حکومت کے ”ایجنٹ“ ہیں۔ اس منصوبے میں ان نام نہاد لیڈروں کے کرداروں کا تعین کیا گیا ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور آزاد کشمیر اور پاکستان میں داخل ہو کر کشمیر کاغذ کے حوالے سے انہیں پاکستانی عوام کو پاکستان کی حکومت کے خلاف کس طرح ہڑکانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے بیشتر وہ نام نہاد کشمیری لیڈر اب بھی موجود ہوں گے اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوں گے۔ یہ کاغذات ہماری حکومت تک پہنچ جائیں تو ان سازشی عناصر کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔

ان کاغذات کے ساتھ حضور بخش نامی ایک آدمی کا خط بھی ہے۔ حضور بخش سرینگر میں بھارت کے اسی حساس ادارے میں ملازم تھا۔ ادارے کے مسلمان ملازمین کو اگرچہ اس سازش کی ہوا تک نہیں لگنے دی گئی تھی لیکن یہ کاغذات کسی نہ کسی طرح حضور بخش

آدمی پہرہ پر رہ گئے اور باقی اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ ندیم کے خیے میں اس کے علاوہ قابوس اور محسن بھی تھے۔ اعتبار گل اور پانڈے باہر پہرے پر تھے۔ چیکو اور مونیکا ساتھ والے خیے میں تھیں۔ جبکہ ریمینڈ، گلریش اور راشدا اس سے اگلے خیے میں تھے۔ اپنے سلیپنگ بیگ میں گھسے ہوئے ندیم کو ان کاغذات کا خیال آگیا جو غار میں تیسرے ڈھانچے کے کوٹ کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ اس نے جیب سے کاغذات نکال لئے اور تاراج جلا کر سامنے رکھ لی۔

ندیم نے کرنسی نوٹ ایک طرف رکھ دیئے اور کاغذات کا معائنہ کرنے لگا۔ تمام کاغذات خستہ ہو رہے تھے اور ان کی رنگت بدل گئی تھی۔ حضور بخش نامی کسی شخص کے نام دو تین خطوط تھے جن پر سرینگر کا ایک ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ وہ تمام خطوط حضور بخش کے بڑے بھائی کی طرف سے لکھے گئے تھے جو دہلی میں رہائش پذیر تھے کیونکہ خط کے اوپر تاریخ کے ساتھ دہلی لکھا ہوا تھا۔ تاریخ کئی سال پرانی تھی۔ ندیم نے وہ خطوط ایک طرف رکھ دیئے اور براؤن لفافے میں سے کاغذات نکال لئے۔ یہ ہندو سرکار کے ایک بہت ہی حساس ادارے کے لیٹر پیڈ تھے جن پر تحریریں انگریزی میں ٹائپ کی گئی تھیں۔

ندیم پہلے کاغذ کی تحریر پڑھنے لگا۔ اس پر کئی سال پرانی تاریخ تھی۔ وہ جیسے جیسے تحریر پڑھتا جا رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ دوسرا کاغذ پڑھتے ہوئے اس کے منہ سے بے اختیار ”اوہ“ نکل گیا۔

”کوئی خاص بات ہے؟ کوئی لویئر ہے کیا؟“ محسن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لویئر نہیں۔ کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ تمام کاغذ پڑھ لوں تو بتاتا ہوں۔“ ندیم نے جواب دیا اور دوبارہ پڑھنے لگا۔

وہ سات کاغذات جنہیں پڑھتے ہوئے ندیم کے چہرے کی رنگت بار بار بدل رہی تھی۔ بالآخر آخری کاغذ پڑھنے کے بعد اس نے تمام کاغذ بڑی احتیاط سے دوبارہ لفافے میں رکھ دیئے۔

”ہاں! اب بتاؤ کیا بات ہے؟ یہ کاغذ کیسے ہیں؟“ اس مرتبہ قابوس نے پوچھا۔

”ان کاغذوں میں پاکستان کے خلاف ایک بڑی خوفناک سازش کی تفصیل درج ہے۔“



ندیم یکدم خاموش ہو گیا۔ اسے خیمے کے باہر ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ قدموں کی ہلکی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے یہی سوچا کہ پانڈے یا اعتبار گل میں سے کوئی گشت کرتا ہو خیمے کے قریب سے گزرا ہو گا۔

”اب ان دونوں ڈھانچوں کا معہ بھی حل ہو گیا ہے۔“ ندیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”حضور بخش کا تعاقب کرنے والا اس غارتگ پہنچ گیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ہلاک کر دیا تھا اور ان کی موت کو کوئی اور رنگ دینے کے لئے ان کے کپڑے اتار کر دور پھینک دیئے اور حضور بخش کے لباس سے وہ تمام کاغذات نکال لئے۔ مگر وہ خود بھی اس نارسے زندہ واپس نہیں جا سکا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا اور وہ بھی ختم ہو گیا۔“

”کئی سال گزر چکے ہیں۔ ان کاغذات کی تو اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔“ محسن نے کہا۔ ”یہ کاغذات اب بھی بہت اہم ہیں۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”ان سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کو دو لخت کرنے کی سازش بھارت نے تیار کی تھی۔ اس کے وہ نام نہاد ایجنٹ اگر اب بھی آزاد کشمیر یا پاکستان میں موجود ہیں تو انہیں حراست میں لے کر اس سازش کے بارے میں بہت کچھ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں ان کاغذات کی حفاظت کرنی ہوگی۔ پانڈے کو معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کاغذات کیسے ہیں۔“

”مجھے تو وہ کچھ پراسرار سا آدمی لگتا ہے۔ آج کل وہ مونیکا کی طرف مائل ہے۔ سفر میں بھی وہ دونوں اکیلے ہی چلتے ہیں اور پڑاؤ کے موقع پر بھی دونوں الگ تھلگ بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ بھی بھارتی ایجنٹ ہے اور کسی خاص مقصد کے تحت اس مہم میں شامل ہوا ہے۔“ محسن نے کہا۔

”ہمیں اس پر نگاہ رکھنی ہوگی۔“ ندیم نے کہا۔ ”بہر حال اب سو جاؤ۔“ وہ سلپنگ بیگ میں گھس گیا۔ کاغذات اس کی پتلون کی جیب میں تھے اور محفوظ تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

رات کو حسب معمول پہرے کے لئے ان کی ڈیوٹیاں بدلتی رہیں اور صبح دھوپ نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ آگے روانہ ہو گئے۔ انہیں ان پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے کئی روز بوجھ تھے لیکن ندیم نے اپنے ساتھیوں کی حرکات پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر گزشتہ رات محسن نے ذکر کیا تو اب وہ ٹیم کے ممبروں پر توجہ دینے لگا۔ اس نے پانڈے اور مونیکا

کے ہاتھ لگ گئے۔ اسے کشمیری مسلمانوں اور پاکستان سے بھر دی تھی۔ وہ یہ کاغذات کر سرنیگر سے بھاگ نکلا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ سرنیگر سے بارہ مولا کی طرف نکل جائے اور دریائے بیور کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو جائے مگر پھر اسے اپنے بیوی اور بچے کا خیال آیا۔ وہ کارگل کا رہنے والا تھا۔ اس کی بیوی اور بچہ کارگل میں تھے۔ وہ اچھی طرح جانے کہ اس کا راز فاش ہونے کے بعد بھارتی بھیڑیے سب سے پہلے اس کی بیوی اور بچے کو گرفت میں لیں گے اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا وہ اس سے بھی واقف تھا۔ نے اپنی بیوی اور بچے کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور بارہ مولا کی طرف جانے بجائے سرنیگر سے پہلے گام پہنچ گیا۔

وہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ تمام پہاڑی راستے اور درے آمدورفت کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹرک پر سوار ہو کر دوسرے دن کارگل پہنچا۔ کارگل سے بیوی اور بچے کو کونار سے ہوتا ہوا گلٹاری پہنچ گیا۔ یہاں تک اس نے ایک جیب میں سفر کیا تھا۔ گلٹاری کر اسے پتہ چل گیا کہ اس کی تلاش شروع ہو چکی ہے اور اس کا تعاقب بھی شروع ہو ہے۔ حضور بخش کا بچہ بیمار تھا مگر وہ اس کے علاج کے لئے رُک نہیں سکتا تھا۔ اس گلٹاری سے ایک نچر کرائے پر حاصل کیا اور انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بچے کا انتقال ہو گیا۔ حضور بخش نے اپنی بیوی کے ساتھ سفر جاری رکھا۔ اس کی بیوی بیمار ہو گئی مگر وہ کہیں رکا نہیں اور مسلسل سفر کرتا ہوا برزل پہنچ گیا۔ اگر اسے علم ہو پاکستان کی حدود میں داخل ہو چکا ہے تو وہ برزل سے بڑے آرام سے جیب میں سفر کر سکر دو پہنچ سکتا تھا جہاں سے جہاز کے ذریعے وہ اسلام آباد پہنچ جاتا۔ مگر اسے کوئی انا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ سفر کے ساتھ ساتھ لوگوں سے چھپنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ کئی بعد وہ اس غارتگ تک پہنچ گیا۔ اس کی بیوی کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ اس نے دو چار اس غارتگ میں رہنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ محفوظ جگہ تھی۔

حضور بخش نے اپنے اس خط میں یہ تمام تفصیل غارتگ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ اپنے آخری خط میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر وہ اور اس کی بیوی کسی حادثے کا شکار ہلاک ہو جائیں اور کوئی خدا کا بندہ انہیں دیکھ لے تو یہ کاغذات حکومت پاکستان تک

اپنے آپ کو میپ ریڈنگ کا ماہر بتایا تھا اور ندیم وغیرہ اس کے مشوروں پر عمل بھی کرتے رہے تھے۔

گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر ندیم اپنے خیالات سے چونک گیا۔ اس نے خچر روک لیا۔ اس کے ساتھ بھی رک گئے تھے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے لڑھک رہا ہو۔ وہ اس وقت چاروں طرف سے بلند چٹانوں میں گھرے ہوئے تھے اور بدحواس ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

”وہ..... وہ دیکھو.....!“ راشد بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔

سب مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔ بہت دور گلیشیر سے برف کا ایک بہت بڑا تودا سرک رہا تھا۔ تودا کیا تھا برف کی بہت بڑی چٹان تھی جو گلیشیر کی بلندی سے لڑھکتی ہوئی ڈھان کی طرف جا رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ وہ ان چٹانوں میں دھک سی بھی محسوس کر رہے تھے حالانکہ ان کے اور گلیشیر کے درمیان کم از کم تین چار میل کا فاصلہ ضرور ہو گا۔ برف کی چٹان بلندی سے لڑھکنے کے ساتھ ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر بھی رہی تھی۔ اڑتی ہوئی برف کا یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ تودا گرنے اور برف کے بکھرنے کا یہ عمل تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا اور وہ لوگ وہاں کھڑے یہ دلچسپ منظر دیکھتے رہے اور پھر آگے چلے گئے۔

شام سے ذرا پہلے وہ ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب رک گئے۔ اس جھیل میں بھی ٹرائٹ فش کی بہتات تھی۔ اعتبار گل اور گلرین نے لکڑیوں کے بھالے بنا کر مخصوص طریقے سے چند مچھلیاں پکڑیں اور وہ دونوں کھانا پکانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

اس روز وہ بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ کھانا کھاتے ہی سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ندیم جاگ رہا تھا۔ کاغذات اس کی پتلون کی جیب میں تھے۔ وہ بار بار پانڈے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پانڈے پر اس کا شبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پانڈے کے پاس ایک جھوٹا ٹاپا کٹ سائز ٹرانسپیرینڈیو بھی تھا جو اس کے گلے میں لٹکے ہوئے کیونس بیگ میں موجود رہتا تھا۔ یہ جھوٹا سائریڈیو کئی سیشن کیچ کرتا تھا اور آواز بالکل صاف آتی تھی۔ قابوس اور محسن وغیرہ نے ایک دوسرے پانڈے سے یہ ریڈیو مانگا بھی تھا مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایک ٹرانسپیرینڈیو کے پاس بھی تھا مگر وہ لوگ اپنا یہ ریڈیو صرف خبریں سننے کے

کو خاص طور پر لگا ہوں میں رکھا ہوا تھا۔ محسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ان دونوں کے خچر ہا ساتھ چل رہے تھے اور وہ دونوں آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ پھر ندیم نے سوچا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اس سفر کے دوران ان دونوں میں کچھ زیادہ بے تکلفی ہو گئی تھی اور وہ زیادہ ترائیک دوسرے کے قریب رہنے کی کوشش کرتے تھے بالکل اسی طرح جیسے چیکو اس کے قریب آگئی تھی اور اب بھی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ چیکو دوسروں کے مقابلے میں اس پر زیادہ اعتماد کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ندیم نے ایک موقع پر اس کی جان بچائی تھی۔ اب وہ زیادہ تر اس کے قریب کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن غار میں ڈھانچے کے لباس سے وہ کاغذات ملنے کے بعد پانڈے کی طرف سے محتاط ہو گیا تھا۔ وہ بھارتی تھا۔ اس کی بہن اور بہنوئی اس گاڑی کے مسافروں میں شامل تھے۔ وہ خود دہلی سے آیا تھا اور بہن اور بہنوئی کی تا کے سلسلے میں اس مہم میں شامل ہوا تھا۔ لیکن محسن کا یہ شبہ درست بھی ثابت ہو سکتا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت اس مہم میں شامل ہوا ہو۔ دشمن ایسے ہی موقع سے توفاندہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وادی گلگت کا یہ علاقہ فوجی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ مقبوضہ کشمیر کی سرحد قریب ہونے کے علاوہ اس وادی میں اہم تنصیبات بھی تھیں اور سیاحین گلیشیر بھی اس خطے میں واقع تھا۔ سیاحین کو دنیا کا بلند ترین جنگ کہا جاتا تھا۔ جنگی اعتبار سے یہ گلیشیر بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا اور یہاں دونوں ممالک کی فوجوں میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ بھارت اس گلیشیر پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ کوشش کر چکا تھا لیکن ہر مرتبہ اسے کھانی پڑی تھی۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ پانڈے کسی خاص مقصد کے تحت اس مہم میں شامل ہوا ہو۔ اسے دہلی سے بھیجا ہی کسی مقصد کے لئے گیا ہو اور اسے پتہ چلا کہ ندیم طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش میں جانے کے لئے ایک ترتیب دے رہا ہے تو وہ بھی اس میں شامل ہو گیا ہو تاکہ اس علاقے میں اہم فوجی جگہ کا جائزہ لے سکے۔

اب ندیم کو یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ انہوں نے نقشہ دیکھ کر جب بھی راستوں کرنے کی کوشش کی تھی تو پانڈے نے بھی کئی مرتبہ انہیں مشورے دیئے تھے۔

دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ ”جاؤ! اپنے خیمے میں جا کر سو جاؤ۔“  
 ”اوہ! مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں رہا تھا کہ تم سگریٹ نوشی نہیں کرتے۔ میں نے  
 شاید راشد کو سگریٹ پینے دیکھا تھا۔“

ندیم نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ موزیکا کو واقعی سگریٹ کی  
 تلاش تھی یا پانڈے کے کہنے پر وہ کاغذات چرانے آئی تھی۔ لیکن آدھی رات کے وقت اس  
 طرح خیمے میں گھس آنے سے موزیکا بھی اس کی نظروں میں مشکوک ہو گئی تھی۔ ندیم ابھی  
 یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ موزیکا کبل بنا کر اس کے قریب آ گئی۔

”یہ..... یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ ندیم بری طرح گڑبڑا گیا۔ ”قابوس اور محسن باہر  
 موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی اندر آ گیا تو تمہیں دیکھ کر کیا سوچے گا؟“

”سگریٹ کا تو مجھض بہانہ تھا ندیم!“ موزیکا نے سرگوشی کی۔ ”میں تو بہت دنوں سے کسی  
 ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔“

”تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اگر قابوس یا محسن آ گیا تو میں ان کی نظروں میں گر جاؤں گا۔“  
 ندیم بولا۔

”ان دونوں کی تم فکر مت کرو۔“ موزیکا نے سرگوشی میں جواب دیا۔ وہ دونوں پانڈے  
 والے خیمے میں سو رہے ہیں۔ باہر پانڈے اور راشد پہرے کی ڈیوٹی پر ہیں۔ ان کے  
 فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ اس موقع سے.....“

ندیم نے بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر موزیکا کو ایک طرف دھکیل دیا اور اٹھ کر  
 خیمے سے باہر نکل گیا۔ موزیکا سے پیچھا چھڑانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ اس نے خیمے سے باہر  
 نکلے ہوئے موزیکا کی بو بڑا ہٹ سنی تھی۔

چاند پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے چلا گیا تھا اور ماحول پر گہری تاریکی تھی۔ ندیم چند قدم  
 گئے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ خیموں سے تقریباً بیس گز دور ایک پتھر پر راشد بیٹھا  
 سگریٹ پی رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے جسم پر کبل لپیٹ رکھا تھا اور اس کی  
 انگلی بھی قریب ہی پڑی تھی۔

”پانڈے کہاں ہے؟“ ندیم نے راشد کے قریب پہنچ کر پوچھا۔  
 ”وہ اس طرف گیا ہے۔“ راشد نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے مخصوص اشارہ

لئے استعمال کرتے تھے۔ ندیم کو اب یاد آ رہا تھا کہ کہیں پڑاؤ کے دوران بعض اوتار  
 پانڈے پہاڑوں میں گھنے گھنے بھر تک غائب ہو جاتا تھا۔

اس رات ندیم اپنے خیمے میں اکیلا ہی تھا۔ محسن اور قابوس باہر پہرے پر تھے۔ نہ  
 سلپنگ بیک میں گھنے کی بجائے دو بھاری کبل اوڑھے سو رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھ  
 گئی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر خیمے کی تاریکی میں گھورتا رہا۔ اسے خیمے میں کسی  
 موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ پہلے تو اسے خیال آیا کہ شاید قابوس اور محسن اپنی پہرے  
 ڈیوٹی ختم کر کے آئے ہیں مگر پھر اسے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ خیمے میں جو کوئی بھی تھا  
 احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ کپڑوں کی بہت ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اور  
 ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے کبل میں ہاتھ ڈال کر اس کے جسم کو ٹول رہا  
 وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت لیٹا رہا۔

حرکت کرتا ہوا ہاتھ پہلے اس کے سینے پر ریگلتا رہا۔ پھر نیچے آ گیا اور اس کی پتلہ  
 ٹولنے لگا۔

ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسے ندیم کی جیبوں میں کسی چیز  
 تلاش تھی۔ اس کے ذہن میں پانڈے کا خیال آیا۔ اسے شاید ان کاغذات کے بارے  
 کسی طرح پتہ چل گیا تھا اور وہ انہیں چرانا چاہتا تھا۔

وہ ہاتھ ندیم کی جیب میں داخل ہو رہا تھا کہ ندیم ایک دم حرکت میں آ گیا۔ اس  
 ایک ہاتھ سے اس ہاتھ کو گرفت میں لے لیا اور کبل الٹ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔  
 کے ساتھ ہی وہ اس شخص سے لپٹ گیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہو گیا کہ  
 مرد نہیں عورت تھی کیونکہ اس کے منہ سے دہی دہی ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ وہ مو  
 تھی۔

”تم موزیکا.....؟“ ندیم کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”میرے خیمے میں کیا کر رہی ہو  
 میری جیبوں میں کیا تلاش کر رہی تھیں؟“

”سگریٹ!“ موزیکا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں جگانا مانا  
 نہیں سمجھا اور یہی سوچا تھا کہ آرام سے تمہاری جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لوں گی۔  
 ”تمہیں پتہ ہے میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ ندیم نے کہتے ہوئے کبل اپنے اوپر کھینچ لیا

تاکہ اگر بھیڑیے حملہ کر سکیں تو اپنا بچاؤ کیا جاسکے۔

”گھریزا!“ راشد نے روشنی کی۔ ”بھیڑیوں کے اس جھنڈ میں وہ سفید بالوں والا بھیڑیا ہے یا برفانی چیتا؟“

”یہ برفانی چیتا نہیں بھیڑیا ہی ہے۔ سفید بالوں والا بھیڑیا میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“ گھریزا نے جواب دیا۔

وہ سفید بھیڑیا ہی تھا۔ وہ تو تمام بھیڑیے قد و قامت میں غیر معمولی طور پر عام بھیڑیوں سے بڑے تھے مگر وہ سفید بھیڑیا اپنے ساتھی بھیڑیوں کے مقابلے میں خاصا جسیم تھا۔ اس کی آنکھوں میں بورہیسی چمک تھی اور سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔

وہ تمام بھیڑیے آسمان کی طرف منہ اٹھائے چلا رہے تھے۔ پھر اچانک ہی وہ گریزا اور راشد کی طرف لپکے۔ یہ دونوں کیمپ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے لیکن بھیڑیے جلد ہی ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رک گئے اور اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی لکڑیوں کو لٹھیوں کی طرح اٹھاؤ ہند چلانے لگے۔ بھیڑیے لپک لپک کر ان پر حملہ کر رہے تھے۔ سفید بھیڑیا گریزا کی طرف لپکا۔ گریزا نے ڈنڈا اٹھا دیا جو سفید بھیڑیے کے کندھے پر لگا۔ اس کے منہ سے ایک خوفناک غراہٹ نکلی۔ وہ پیچھے ہٹا اور پھر ہوا میں اچھل کر دوبارہ گریزا کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ اس کا حملہ کرنے کا اندازہ زیادہ خطرناک تھا۔ گریزا اپنے بچاؤ کے لئے ڈنڈے کو گھماتا تھا مگر اس مرتبہ وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکا۔ سفید بھیڑیا اس کے اوپر آن رہا۔ گریزا پشت کے بل گرا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ سفید بھیڑیے نے اس کی گردن دائیں میں دبوچ لی اور اسے ایک طرف گھسیٹنے لگا۔

گریزا بری طرح چیختے ہوئے ہاتھ پیر مار رہا تھا مگر بھیڑیا اسے منہ میں دبوچے حیرت انگیز تیزی سے گھسیٹ رہا تھا۔

شور کی آواز سن کر کیمپ میں موجود ندیم وغیرہ رافٹیں اٹھا کر دوڑے۔ قابوس نے ایک دوہوائی فائر بھی کر دیئے۔ بھیڑیوں کی آوازیں انہوں نے سن لی تھیں۔ قریب پہنچتے ہی انہوں نے بھیڑیوں پر فائر شروع کر دی۔ دو بھیڑیے ڈھیر ہو گئے اور باقی بھاگ نکلے۔ راشد ایک بھیڑیے کا پنجہ لگنے سے زخمی ہو گیا تھا۔

”اوہ..... وہ سفید بھیڑیا!“ راشد نے ”گھریزا“

کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم کہاں.....؟“

”نہیں نہیں آرہی تھی اس لئے اٹھ کر باہر آ گیا۔“ ندیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

کن آنکھوں سے اپنے خیمے کی طرف دیکھنے لگا۔

ندیم دس پندرہ منٹ تک وہاں بیٹھا رہا۔ اس وقت تک پانڈے واپس نہیں آیا تھا۔ خیمے میں واپس آ گیا۔ مونیکا جاچکی تھی۔ ندیم کمبلوں میں دبک کر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک مونیکا کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

انہیں ناگہا پر بت کی ان برف پوش وادیوں میں بھٹکتے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے مگر گمشدہ طیارے یا اس کے مسافروں کا بھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اور اب ندیم سوچتا تھا کہ یہ مہم شروع کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ ان کی اپنی زندگیاں خطر میں پڑی ہوئی تھیں۔

اگلے روز انہوں نے جس جگہ کیمپ لگایا وہ ایک چٹان کے دامن میں تھی۔ چٹان کا در حصہ کسی بہت بڑے سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اس چٹانی سائبان کی وجہ سے تیز ہوا سے بچ گئے تھے۔ اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک چشمہ تھا جس سے ٹھنڈا ابل رہا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ خیموں کے سامنے دو کار لیپ روشن تھے اور گریزا، راشد، ریمینڈ وغیرہ خیموں کے قرب وجوار کی جھاڑیوں کو کھینچ رہے تھے تاکہ الاؤ روشن کیا جاسکے۔ گریزا اور راشد اندھیرے کی طرف نکل گئے تھے۔ انہوں نے وہاں بکھری ہوئی لکڑیاں جمع کر کے ایک ڈھیر لگا دیا تھا۔ اب جمع شدہ لکڑیاں خیموں تک لانے کی تیاری کر رہے تھے۔

اچانک غراہٹ کی آواز سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ ایک نہیں کئی غراہٹیں تھیں بہت سے بھیڑیے مل کر ایک ساتھ غرارہے ہوں۔ وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔ ایک لمحہ کو تو یوں لگا جیسے انہیں سکتہ سا طاری ہو گیا ہو۔ وہ چھ سات بھیڑیے تھے؟ سے تقریباً پندرہ گز دور جھاڑیوں کے قریب کھڑے غرارہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”اوہ..... وہ سفید بھیڑیا!“ راشد نے ”گھریزا“

۹۸

اس چٹان کے پیچھے لے گیا ہے۔“

قابوس وغیرہ چٹان کی طرف دوڑے۔ دوسری طرف پہنچ کر انہیں رُک جانا پڑا۔

سفید بھیڑیا لگزی کو دبوچ کر حیرت انگیز تیزی سے گھسیٹتا ہوا ایک اور چٹان پر تقریباً سوف کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک لگزی پر چل رہا تھا۔ لگزی اب بھی ہاتھ پیر چلا رہا تھا۔ لگزی نے رائفل سیدھی کر کے بھیڑیے پر گولی چلا دی۔ گولی سفید بھیڑیے کو نہیں لگی لیکن اس نے لگزی کو چھوڑ کر لگزی کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ لگزی بھی بھیڑیے کی نجات پانے کے بعد اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکا تھا۔ وہ چٹانی لگزی سے لڑھکا اور تقریباً فٹ گہرے کھڈ میں پتھروں پر گر گیا۔

وہ سب اس طرف دوڑے۔ جب وہ کھڈ میں پہنچے تو لگزی ہڈیوں اور گوشت کے ایک ڈھیر کی صورت میں پتھروں پر پڑا تھا۔ چاروں طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ وہ لگزی کی لاش ایک چادر میں سنیت کر کمپ میں لے آئے اور اس ویرانے میں ایک قبر بنادی گئی۔

اس رات وہ ایک لمحے کو بھی نہیں سوئے تھے۔ ان پہاڑوں میں بھیڑیوں کی موجودگی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ انوکھی بات تو وہ سفید بھیڑیا تھا۔ وہ دیر تک اس خونخوار بھیڑیے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس کی قوت کا مظاہرہ بھی وہ دیکھ چکے تھے۔ کوئی بھیڑیا کسی انسان کو گھسیٹ کر نہیں لے جاسکتا۔ لیکن وہ سفید بھیڑیا جس طرح لگزی گردن سے دبوچے گھسیٹ کر لے جا رہا تھا وہ حیرت انگیز تھا۔

صبح سویرے ہی انہوں نے کمپ اٹھا دیا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل چاہتے تھے اس لئے کہیں رے کے بغیر دن بھر سفر کرتے رہے۔ بالآخر چار بجے کے قریب ایک وسیع و عریض وادی میں پہنچ گئے۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر برفانی میدان تھے۔ پہاڑ چنار کے درختوں کی بھی بہتات نظر آرہی تھی۔

☆

چیکو کی چیخ نے ان سب کو بدحواس کر دیا۔

”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ اس قدر خوفزدہ کیوں ہو....؟ جاوید نے پوچھا۔

”وہ.... وہ....“ چیکو بھلائی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔

سب کی نظریں کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں اور وہاں سفید بھیڑیے کو دیکھ کر ان کے حواس واقعی رخصت ہو گئے۔ بھیڑیا اب بھی کھڑکی کے شیشے پر پہنچے مار رہا تھا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غرائشیں نکل رہی تھیں۔

ندیم، اعتبار گل اور ریمینڈ نے لپک کر اپنی اپنی رائفلیں اٹھالیں۔ ندیم نے فائر کرنے کے لئے رائفل سیدھی کی ہی تھی کہ بھیڑیے کا چہرہ کھڑکی سے غائب ہو گیا۔ ندیم دوڑ کر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سفید بھیڑیا برف پر دوڑتا ہوا پائوں کے درختوں کی طرف جا رہا تھا۔ ندیم کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف دوڑا۔ ریمینڈ اور اعتبار گل بھی اس کے

سلاچنگ بیڈز میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

اس رات سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ریمنڈ اور اعتبار گل اپنے دو ساتھیوں کی جگہ پہرے کی ڈیوٹی پر آئے تھے۔ وہ لکڑی کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گرم لباس اور سر پر گرم ٹوپیاں بھی تھیں۔ گردنوں پر مفلر لپٹے ہوئے تھے مگر تیز برفانی ہوا ان کے لباس کو چرتی ہوئی جسم میں ہڈیوں کے گودے تک میں اترتی جا رہی تھی۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ ان کے سامنے تاحد نگاہ سفید برفانی وادی پھیلی ہوئی تھی۔ سردی کی شدت سے ان کے دانت بجنے لگے تھے۔

”سردی زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں اندر چل کر بیٹھنا چاہئے۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند ہوں تو ہمیں کسی درندے سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“ یہ بات ریمنڈ نے کہی تھی۔

اعتبار گل کے خیال میں اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ عمارت کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند ہوں تو واقعی کسی جنگلی جانور سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کوئی جانور کھڑکی یا دروازہ کھول کر تو اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ویسے بھی وہ جاگ کر ڈیوٹی دیتے رہیں گے۔ اس طرح وہ سردی سے بھی بچ جائیں گے۔

”ٹھیک ہے۔ چلو! اندر ہی چلتے ہیں۔“ اعتبار گل نے کہا۔ اور وہ پھرتی سے اندر آگئے اور دروازہ بند کر دیا۔

ان کے خچر لکڑی سے بنی ہوئی اس عمارت کے عقبی سمت میں واقع ایک شیڈ کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ یہ شیڈ غالباً گھوڑوں اور خچروں ہی کے لئے بنایا گیا تھا۔ اعتبار گل اور ریمنڈ کھڑکیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ تیز و تند برفانی ہوا سے اگرچہ بچ گئے تھے مگر سردی اب بھی ان کی ہڈیوں کے گودے میں رچی ہوئی تھی۔ ان کے پیر قدرے ٹھنڈے پڑ رہے تھے جیسے برف میں لپٹے ہوئے ہوں۔

دفعۃً خچروں کے ہنہانے کی آوازیں سن کر وہ چونک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خچروں کے ہنہانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آپس میں لڑپڑے ہوں یا کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر ہنہانا رہے ہوں۔

خچر خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ وہ ایک بار پھر

ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔

سورج اگرچہ غروب ہو چکا تھا، لیکن چاروں طرف برف کی وجہ سے قدرے اجالا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے عمارت کے پچھلی طرف آگئے۔ بھیڑ یا درختوں میں بہت دور پہنچ چکا تھا۔ درختوں میں برف پر دوڑتے ہوئے سفید بھیڑیے پر نظریں جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ ان تینوں نے بیک وقت گولیاں چلا دیں۔ ان میں سے کوئی گولی بھیڑیے کا کچھ نہیں بگاڑی۔ بھیڑیا حیرت انگیز تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا انکا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔ گولیوں کی آواز دہر تک برف پوش پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی۔

وہ لوگ کچھ دیر وہاں کھڑے درختوں میں دیکھتے رہے۔ پھر واپس آگئے۔ ان کے تہہ ساتھی دروازے کے قریب جمع تھے۔ پانڈے اور محسن کے ہاتھوں میں رائفلیں بھی نظر رہی تھیں۔

”بھاگ گیا۔“ اعتبار گل نے قریب پہنچ کر کہا۔

”کیا یہ وہی سفید بھیڑیا تھا جو کل گلرئز کو اٹھا کر لے گیا تھا؟“ یہ سوال پانڈے نے اٹھا۔

”کیا احمقانہ سوال کیا ہے؟“ محسن نے کہا۔ ”وہ واقعہ کل شام کو پیش آیا تھا اور آج بھر میں ہم نے ان پہاڑوں میں ایک طویل فاصلہ طے کیا ہے۔ اگر یہ وہی بھیڑیا ہے تو پھر جانور نہیں کوئی بدروح ہی ہوگی جو ہمارے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ ارے بھائی یہ پہاڑ ہیں۔ یہ برف پوش وادیاں ہر قسم کے جانوروں کا مسکن ہیں۔ ان ویرانوں میں ا طرح کے بیسیوں سفید بھیڑیے بکھیرے ہوئے ہوں گے۔“

”مجھے تو یہی بھیڑیا لگتا ہے۔“ پانڈے نے ایک بار پھر اپنے شے کا اظہار کیا۔ ”اچھا بھئی! آئے گا تو اس سے پوچھ لیں گے۔ بحث کوئی کا فائدہ نہیں۔ البتہ کھانا ہو رہا ہے۔ اعتبار گل نے ہم سب کے لئے کتنی محنت سے کھانا تیار کیا ہے۔ کچھ اس کی کا تو خیال کرو۔“ قابوس نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ سب لوگ اس بڑے کمرے میں آ جہاں کھانا چٹا ہوا تھا۔

کھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی وہ دیر تک اس بھیڑیے کے بارے میں کرتے رہے۔ پھر حسب معمول دو آدمی رائفلیں سنبھال کر باہر چلے گئے اور باقی اپنے

ہنہانے لگے۔ اس مرتبہ شور کچھ زیادہ ہی تھا اور پھر نچروں کی اس ہنہناہٹ میں ایک اور  
آواز سن کر وہ دونوں چونک گئے۔



وہ بھیڑیے کی غراہٹ تھی۔ ممکن ہے کوئی بھیڑیا نچروں کے شید میں گھس آیا ہو اور اگر  
بھیڑیے نے نچروں کو زخمی کر دیا تو ان کے سفر میں مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ یہی سوچ  
کر وہ دونوں دروازہ کھول کر باہر نکل آئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے عمارت کے اوپر  
سے گھوم کر اصطبل کی طرف بڑھنے لگے۔

نچر بری طرح ہنہنا رہے تھے اور بھیڑیے کی غراہٹ بھی بڑھ گئی تھی۔ دفعۃً بھیڑیے  
کی غراہٹ دب گئی۔ نچر بھی خاموش ہو گئے تھے۔ صرف ایک نچر اس طرح بلبلا رہا تھا جیسے  
اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔

اعتبار گل اور ریمینڈ بے قدموں سائبان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رائفلیں ان کے  
ہاتھوں میں تیار تھیں۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ وہی سفید بھیڑیا ہو تو اس مرتبہ وہ  
اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ریمینڈ قدرے آگے تھا۔ اس نے ایک پتھر کی آڑ سے سائبان کی طرف جھانکا۔ پھر  
پتھر کی آڑ سے نکل کر آگے بڑھنے لگا۔ اور پھر دفعۃً اسے یوں لگا جیسے برف کا کوئی تودا اس  
پر گر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اسے خوفناک غراہٹ بھی سنائی دی تھی۔

وہ سفید بھیڑیا تھا جس نے گھات لگا کر ریمینڈ پر چھلانگ لگائی تھی۔ ریمینڈ نے بچنے کے  
لئے پیچھے ہٹنا چاہا مگر بھیڑیے کا بچہ اس کے بائیں کندھے پر لگا۔ وہ چیخ مار کر پشت کے بل  
گرا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے کندھے میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ پیچھے گرتے ہوئے  
اس کے ہاتھ سے رائفل کا ٹرانسنگر دب گیا۔ گولی خاموش فضا میں گونج پیدا کرتی ہوئی  
نجانے کہاں چلی گئی۔ لیکن وہ سفید بھیڑیا اس کے کندھے کو زخمی کرتا ہوا اس کے اوپر سے  
دوسری طرف گرا تھا اور پھر اٹھ کر برق رفتاری سے درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔

اعتبار گل چند قدم پیچھے تھا۔ وہ ریمینڈ کی چیخ اور فائر کی آواز سن کر بدحواس ہو گیا۔ پھر

”پہلے اسے اندر لے کر چلو.... نچروں کو بعد میں دیکھیں گے۔“ ندیم نے کہا۔  
وہ ریمینڈ کو اندر لے آئے اور کوٹ، سویٹر وغیرہ اتار کر اس کا کندھا برہنہ کر دیا گیا۔  
ریمینڈ اب آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اس کا کندھا دیکھ کر چچیکو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل  
گئی۔ مارے خوف کے اس کا چہرہ کچھ اور زرد ہو گیا تھا۔ ریمینڈ کے کندھے کا گوشت بری  
طرح نچا ہوا تھا۔

موزیکانے فرسٹ ایڈ بکس نکال لیا۔ وہ نرسنگ کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی تھی۔  
اس نے روٹی سپرٹ میں بھگوئی اور زخم صاف کرنے کے لئے سپرٹ میں بیگی ہوئی روٹی  
جیسے ہی کندھے پر رکھی ریمینڈ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”ایزی.... ایزی مائی ڈیئر!“ موزیکانے کا انداز پیکارنے والا تھا۔ ”زخم صاف کرنا بہت  
ضروری ہے ورنہ انفیکشن ہو جانے کا اندیشہ ہے۔“

موزیکانے کا زخم صاف کرتی رہی۔ ریمینڈ نے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے لیکن اس  
کے باوجود اس کے منہ سے سسکاریاں سی نکل رہی تھیں۔ زخم اچھی طرح صاف کرنے  
کے بعد موزیکانے ڈریسنگ کردی اور اسے دو پین کمر گولیاں بھی کھلا دی گئیں۔

ریمینڈ تقریباً ایک گھنٹے تک تکلیف سے کراہتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی کراہیں بند  
ہو گئیں اور وہ سو گیا۔ باقی لوگ دیر تک جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ نچروں کا تو  
کسی کو خیال ہی نہیں رہا۔ البتہ وہ سفید بھیڑیا ان کا موضوع گفتگو بن رہا۔

”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں یہ وہی سفید بھیڑیا ہے جس نے گلریز کو ادھیڑا تھا۔ اس  
کے منہ کو انسانی خون کا چمکا لگا چکا ہے۔ اب یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ میرا تو مشورہ  
ہے کہ ہمیں جلد سے جلد ان پہاڑوں سے نکل کر کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرنی  
چاہئے۔“ راشد نے کہا۔

”حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ کل شام سے ہمارا پیچھا کیسے کر رہا ہے؟“ ندیم بولا۔  
”تم نے شاید شکاریات کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا۔“ راشد بولا۔ ”میں نے دنیا کے  
مشہور ترین شکاریوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ بعض جنگلی درندے  
انسانی خون کا ذائقہ چکھ لینے کے بعد ہفتوں اپنے شکار کا پیچھا کرتے ہیں۔ یہ سفید بھیڑیا بھی  
شاید درندوں کی کسی ایسی ہی نسل سے ہے۔ اگر یہ کوئی بدروح نہیں ہے تو اس سے پیچھا

اس نے سفید بھیڑیے کو درختوں کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے گولی چلا دی مگر  
سفید بھیڑیا درختوں اور بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔ اعتبار گل، ریمینڈ کی  
طرف دوڑا۔

ریمینڈ اپنا دایاں ہاتھ کندھے پر رکھے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے  
اس کے کندھے کے اس مخصوص حصے پر کھولتا ہوا لادوانڈیلا جا رہا ہو اور یہ لادوا آہستہ  
آہستہ اس کے بازو، گردن اور پشت کی طرف پھیلتا جا رہا ہو۔

اعتبار گل نے اس کا ہاتھ زبردستی کندھے سے ہٹا کر دیکھا۔ ریمینڈ نے اگرچہ دو سویٹر،  
ایک جیکٹ اور اس پر ایک اور کوٹ پہن رکھا تھا مگر بھیڑیے کے نوکیلے ناخنوں نے ان  
مونے کپڑوں کو چیر کر کندھے کے گوشت کو ادھیڑا لادوا تھا جس سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔  
گولیوں کی آواز سن کر عمارت کے اندر سوئے ہوئے سب لوگ جاگ گئے تھے۔  
مردوں کے ہاتھ سب سے پہلے اپنی رائفلوں پر گئے تھے۔ باہر سے ریمینڈ کے پیچنے کی  
آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ رائفلیں اٹھائے باہر دوڑے۔

”کیا ہوا.... یہ کیوں چیخ رہا ہے؟“ ندیم نے ان کے سامنے پہنچتے ہی چیخ کر پوچھا۔  
”وہ سفید بھیڑیا!“ اعتبار گل نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں خوف کی جھلک نمایاں  
تھی۔ ”اس بھیڑیے نے ریمینڈ کو زخمی کر دیا ہے۔“

”اوہ!“ ندیم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”مگر کیسے؟ کیا وہ سفید بھیڑیا دوبارہ آگیا تھا؟  
تم لوگ سو رہے تھے کیا کہ اسے حملہ کرنے کا موقع مل گیا؟“

”ہم جاگ رہے تھے۔“ اعتبار گل نے جواب دیا۔ ”باہر شدید سردی تھی۔ ہم اندر آ  
گئے تھے۔ پھر نچروں کے ہنہانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی بھیڑیے کے  
غرانے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ ہم سمجھے کہ کوئی عام بھیڑیا ہو گا جو نچروں کو تنگ کر رہا  
ہے۔ ہم صورت حال معلوم کرنے کے لئے اس کمرے سے نکل کر پچھلی طرف چلے گئے۔  
ریمینڈ مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ بھیڑیے نے شاید ہماری آوازیں سن لی تھیں اور وہ  
گھات لگائے بیٹھا تھا۔ پھر اس نے اچانک ہی ریمینڈ پر چھلانگ لگا دی اور اسے زخمی کر تا ہوا  
بھاگ گیا۔ میں نے اسے گولی مارنے کی کوشش کی تھی مگر وہ درختوں میں غائب ہو گیا۔ میرا  
خیال ہے کہ اس نے کسی نچر کو زخمی بھی کیا ہے۔“



چھڑانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم جلد سے جلد کوئی ہستی تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

”یاس سفید بھیڑیے کو ختم کر دیا جائے۔“ یہ جملہ پانڈے نے کہا۔

”وہ لو مڑی سے زیادہ چالاک اور چیتے سے زیادہ پھرتیلا ہے۔ اسے شکار کرنا بھی آسان نہیں ہو گا۔“ اس مرتبہ محسن نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”وہ کوئی بھیڑیا ہو، چیتا ہو یا کوئی بدروح! ہمیں بہر حال اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔ اگر واقعی وہی بھیڑیا ہے جس نے گلریز کو ہلاک کیا تھا اور اس کے منہ کو انسانی خون کا ذائقہ چکا ہے تو یہ ایک ایک کر کے ہم سب کو ختم کر دے گا۔ اسے ہر حالت میں ختم کرنا ہو گا۔ ندیم بولا۔

”ارے! خچروں کا تو ہمیں خیال ہی نہیں رہا۔ کہیں بھیڑیے نے ان میں سے کسی زخمی نہ کر دیا ہو۔ میرا خیال ہے چل کر ان خچروں کی بھی خبر لینی چاہئے۔“ اس مرتبہ اتم گل بولا تھا۔

”ہاں چلو!“ ندیم اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”ندیم، قابوس، اعتبار گل اور پانڈے راکفلین اٹھا کر باہر نکل گئے۔ راشد اور محسن راکفلین سنبھال کر دروازے پر جم گئے۔

وہ چاروں راکفلین اٹھائے اس طرح چل رہے تھے جیسے کسی ان دیکھے دشمن کا مقابلہ کرنے جا رہے ہوں۔ ان سب کی نظریں سرچ لائٹ کی طرح چاروں طرف گردش رہی تھیں۔ جب وہ عمارت کی پشت پر پہنچے تو انہیں ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ جھجھکے لیکن پھر تیزی سے خچروں والے ساتبان کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ آواز ایسی جیسے کوئی خچر زمین پر پڑا پیر پٹ رہا ہو۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی خچر زخمی تھا۔

ان کا اندازہ درست نکلا۔ نارچوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ اس خچر بھیڑیے نے تین خچروں کو زخمی کیا تھا۔ دو تو معمولی زخمی تھے لیکن تیسرا خچر شدید زخمی اس کی گردن، زرخرے، پیٹ، ناگوں اور پسلیوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ تکلیف کی دس بار بار پیر پٹ رہا تھا۔

”اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔ اس کا تو ہم علاج بھی نہیں کر سکتے۔“ ندیم خچر کی حالت

تربولا۔

”اس کا علاج میرے پاس ہے۔“ قابوس نے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اس خچر کی رسی کھولی اور اسے اصطبل سے نکال کر کھینچتا ہوا دور لے جانے لگا۔ تقریباً بیس گز آگے جانے کے بعد خچر لڑکھڑا کر گر گیا۔ قابوس نے رسی چھوڑ دی۔ ندیم اور پانڈے نہیں سمجھ پائے کہ قابوس اس خچر کے زخموں کا کیا علاج کرنے والا ہے۔ لیکن جب قابوس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی راکفلین خچر کی طرف تان لی تو ندیم ایک دم آگے بڑھا مگر اعتبار گل نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

”ان پیازوں میں اس زخمی خچر کا بھی ایک علاج ہے۔“ اعتبار گل نے ندیم کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

اسی لمحے فضا فارتنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ قابوس نے دو فار کئے تھے۔ دونوں گولیاں خچر کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ خچر کچھ دیر تڑپا اور پھر ختم ہو گیا۔ قابوس واپس آ گیا۔ ندیم اور پانڈے دہشت زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ زخمی خچر کے اس علاج نے ان دونوں کے دل دہلا کر رکھ دیئے تھے۔ وہ چاروں واپس آ گئے۔

”فارتنگ کس نے کی تھی؟ کیا بھیڑیا واپس آیا تھا؟“ راشد نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی پوچھا۔

”نہیں! ہوائی فائر کئے تھے تاکہ اگر وہ بھیڑیا اس پاس موجود ہو تو ڈر کر دور نکل جائے۔“ قابوس نے جواب دیا۔

وہ کمرے میں آ گئے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ راشد اور محسن نے ڈیوٹی سنبھالی اور باقی اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں دبک گئے۔

صبح سات بجے تک وہ سب ہی جاگ گئے تھے۔ موزیکا اٹھتے ہی ریمینڈ کے قریب پہنچ گئی۔ وہ سو رہا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ریمینڈ کی پیشانی کو چھو کر دیکھا ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔

رات کو ہوا خاصی تیز تھی لیکن اس وقت ہوا میں کچھ اور تندی آ گئی تھی۔ برفانی علاقے میں اس قسم کی تیز ہوا میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ موسم کے پیش نظر لکڑی کی بنی ہوئی یہ عمارت ان کے لئے محفوظ ترین جگہ تھی۔ لیکن اس سفید خونخوار بھیڑیے کا

یہ یقیناً بھیڑیے کی آواز تھی جسے سن کر ان پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ بھیڑیے کی آواز اس برفانی وادی میں چاروں طرف بازگشت سی پیدا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تک وہ تقریباً پندرہ میل کا فاصلہ طے کر سکے تھے۔ تیز ہوا انہیں مسلسل پیچھے دھکیل رہی تھی جس سے ان کی آگے بڑھنے کی رفتار کم ہو گئی۔ ہوا کی تیزی کے ساتھ برف کی اڑنے والی کرچیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اور پھر قابوس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

تیز ہوانے برفانی طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اب ان کے چاروں طرف اتنی برف اڑ رہی تھی کہ چند فٹ کے فاصلے تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چیخ کر ایک دوسرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلارہے تھے۔ انہوں نے اپنے سر جھکا رکھے تھے لیکن برف کی کرچیاں ان کے چہروں کو زخمی کر رہی تھیں۔

وہ ایک گھنٹے تک اس طوفان میں پھنسے رہے۔ کسی کو دوسرے کا ہوش نہیں تھا۔ سب ہی لوگ اب پچھتا رہے تھے کہ اگر قابوس کے مشورے پر عمل کر لیا ہوتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستے۔

بالآخر ہوا کا زور ٹوٹنے لگا۔ ہوا کے ساتھ اڑنے والی کرچیاں بھی کم ہوتی چلی گئیں اور پھر وہ اپنے ارد گرد چند گز کے فاصلے تک دیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی بصارت کا دائرہ بتدریج بڑھتا چلا گیا۔

دفعۃً ندیم محسن کی چیخ سن کر چوٹک گیا۔ محسن پیچھے تھا۔ ندیم نے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ محسن کے ساتھ ہی ریمینڈ والا خنجر چل رہا تھا لیکن ریمینڈ خنجر پر نہیں تھا۔ وہ خنجر کے ساتھ ساتھ برف پر الٹا گھسٹ رہا تھا۔ اس کا ایک پیر رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب خنجر سے گرا تھا اور کب سے اس طرح گھسٹ رہا تھا۔ وہ سب فوراً ہی اپنے خنچروں سے اتر کر ریمینڈ والے خنجر کے قریب پہنچ گئے اور اسے روک کر ریمینڈ کا پیر رکاب سے نکال دیا لیکن ریمینڈ ختم ہو چکا تھا۔ وہ پتہ نہیں کب سے اس طرح رکاب میں پھنسا گھسٹ رہا تھا۔ مسلسل گھسٹتے رہنے سے اس کے چہرے کے نقوش اس طرح بگڑ گئے تھے کہ اسے پہچانا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک طرف کے رخسار کی ہڈی نظر آرہی

خوف ان کے ذہنوں پر طاری تھا اور وہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے انہوں نے ناشتہ کر لیا اور سامان بھی خنچروں پر لاد لیا۔ دھوپ میں برف آئینے کی طرح چمک رہی تھی اور کسی جگہ نظریں ٹکنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے تاریک شیشوں والی عینکیں لگالیں اور ندیم روانگی کے انتظامات کا آخری جائزہ لینے لگا۔ اس وقت ہوا کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ قابوس نے ہوا کے تیور دیکھتے ہوئے مشورہ کیا کہ ایسے موسم میں سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ انہیں آج کا دن اور اگلی رات بھی اسی بڑے گزاری نی چاہئے۔ اس عمارت میں وہ کم از کم ہوا کے طوفان سے تو بچے رہیں گے۔ مگر...

کوئی بھی اس کا مشورہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”ذرا ریمینڈ ہی کا خیال کرو۔ وہ زخمی ہے۔ خنجر پر دشوار گزار سفر اس کے لئے مزید تکلیف کا باعث بن سکتا ہے۔“ قابوس بولا۔

”میرا خیال ہے ریمینڈ سفر کی تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔ میں نے اسے کچھ گولیوں کھلا دی ہیں۔ اسے راستے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ مونیکا نے جواب دیا۔ سفید بھیڑیے کا خوف اس کے ذہن پر بھی طاری تھا۔

”تم لوگ ایسے برفانی علاقوں میں چلنے والی ان تیز ہواؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ ہوا طوفان کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔ ہوا کی تیزی سے برف اڑنا شروع ہو جائے گی اور یہ طوفان ایسی قیامت بن جائے گا کہ تم لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

مگر ان میں سے کسی نے بھی قابوس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ وہ سب لوگ روانگی

بضد تھے۔ مجبوراً قابوس کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔

تین گھنٹوں تک کے سفر کے دوران اندازہ ہوا کہ ہوا کے رفتار مسلسل بڑھ رہی تھی۔ سفید بھیڑیے کے خوف سے مسلسل چلتے رہے۔ ہوا کچھ اور تیز ہو گئی۔ اب ہوا کے ساتھ برف کی چھوٹی چھوٹی کرچیاں بھی اڑنے لگی تھیں۔ برف کی یہ منہمی منہمی کرچیاں سو نیول کی طرح ان کے چہروں پر لگ رہی تھیں۔ قابوس نے انہیں کسی چٹان کی آڑ میں پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ ممکن ہے کہ اس کا مشورہ مان لیا جاتا مگر اچانک ہی خاموش فضا میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کتارورہا ہو۔

نہ ہو۔ وہ آس پاس کہیں موجود ہو گا۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے لیکن سب سے پہلے ہمیں ریمینڈ کے بارے میں سوچنا چاہئے۔“ ندیم نے کہا۔

ریمینڈ کی تدفین کا مسئلہ تھا۔ یہاں زمین تو نظر نہیں آرہی تھی کہ کھود کر اسے دفن کر دیا جائے۔ پاروں کی طرف تاحہ نگاہ برف ہی برف تھی۔ انہوں نے برف کی قبر کھودی اور ریمینڈ کو اس میں دفن کر کے اپنے اپنے عقائد کے مطابق اس کی مغفرت کی دعا مانگنے لگے۔

اعتبار گل کے بارے میں ندیم کو یقین تھا کہ وہ قرب و جوار ہی میں کہیں ہو گا کیونکہ برف کے طوفان کی وجہ سے وہ زیادہ فاصلہ بھی طے نہیں کر پائے تھے۔ وہ آس پاس کے علاقے میں پھیل کر اسے تلاش کرنے لگے۔ اعتبار گل کا نام لے کر اسے پکارا بھی جا رہا تھا کہ اگر وہ ان میں سے کسی کی آواز سن لے تو اپنی موجودگی سے آگاہ کر دے۔ لیکن بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی اس وادی میں انہیں اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد اعتبار گل انہیں مل گیا لیکن ہڈیوں اور گوشت کے ٹوٹنوں کی صورت میں۔ طوفان کے دوران خنجر سمیت وہ ایک گہرے کھڈ میں جا گرا تھا۔ وہ کھڈ تقریباً پچاس ساٹھ فٹ گہرا تھا۔ سب سے پہلے راشدنے اسے دیکھا تھا اور پھر وہ سب کھڈ کے کنارے پر جمع ہو گئے۔ اعتبار گل کی لاش سے چند گز دور خنجر بھی نظر آ گیا۔ وہ بھی یقیناً مر چکا تھا۔ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد کسی کے زندہ بچ جانے کے بارے میں سوچنا ہی حماقت تھا۔

اس کھڈ میں اترنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ عمودی چٹانیں تھیں جن سے اترنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر تک کھڑے اعتبار گل کی بکھری ہوئی لاش کی طرف دیکھتے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔ ان کے چہروں پر ایک بار پھر افسردگی چھا گئی تھی۔

تقریباً دو گھنٹوں تک مزید چلتے رہنے کے بعد وہ چپڑ کے فلک بوس درختوں کے جھنڈ کے قریب لکڑی کا ایک کیمپ دیکھ کر حیران سے رہ گئے۔ لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا یہ کیمپ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا اور یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے فرش پر دس بارہ آدمی

تھی۔ دونوں ہاتھ بھی مسلسل رگڑ کھاتے رہے تھے جس سے ہاتھوں کا گوشت اُدھر گیا اور ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔

ریمینڈ کی اس اذیت ناک موت کے ساتھ ایک اور خوفناک انکشاف یہ ہوا کہ اعتبار گل بھی خنجر سمیت غائب تھا۔ وہ شاید طوفان میں بھٹک کر کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ خنجر ہے خنجر سمیت کسی گہرے کھڈ میں جا گرا ہو اور وہ بھی ریمینڈ کی طرح ان کا ساتھ چھوڑا ہو۔

”میں نے آپ لوگوں کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ ایسے موسم میں سفر کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن آپ لوگوں کی ضد کی وجہ سے ہم اپنے دو آدمیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟“ قابوس نے کہا۔ وہ بہت غصے میں نظر آرہا تھا۔

”دیکھو قابوس!“ راشدنے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”غصہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کی مہمات میں ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ زندگی اور موت کا کھیل ہے۔ یہ سب کچھ ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتا تھا۔ ریمینڈ اگر خنجر سے اترنا چاہتا تھا یا گر گیا تھا تو اس میں اس کی اپنی غلطی ہوئی۔ اگر اس کا بیج رکاب میں نہ پھنسا تو اس حادثے کا شکار نہ ہوتا۔ اگر ہم سفر جاری رکھنے کی بجائے اس عمارت میں رہتے تو کوئی نہ کوئی حادثہ وہاں بھی پیش آ سکتا تھا۔ مثلاً وہ سفید خونخوار بھیڑیا.....“

”بھیڑیا..... بھیڑیا.....!“ قابوس چیخا۔ ”وہ بھیڑیا کسی بھوت کی طرح تم لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہو گیا ہے۔ وہ کوئی بدروح نہیں ہے۔ ایک جانور ہے جس سے بچنے کی سوتدائیر کی جاسکتی تھیں۔ ہم لکڑی کی اس عمارت میں رہتے تو اس بھیڑیے سے بھی محفوظ رہ سکتے تھے اور اس خوفناک طوفان سے بھی جس نے دو آدمیوں کو نگل لیا ہے۔“

”قابوس!“ ندیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”ریمینڈ کی موت کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن اعتبار گل کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ طوفان میں راستہ بھٹک کر کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ پریشان

شام ہوتے ہی بھیڑیوں کی آوازیں سن کر وہ بدحواس سے ہو گئے۔ آوازوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کئی بھیڑیے تھے اور آوازیں چاروں طرف سے گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ قابوس کے کہنے کے مطابق اس علاقے میں لومڑیاں اور برفانی چیتے بھی بکثرت تھے۔ اس لئے انہیں یہ رات زیادہ محتاط رہ کر گزارنی تھی۔ کھانے کے بعد قبوہ پاندے نے بنایا۔ قبوہ پینے کے بعد وہ لوگ کچھ دیر تک ریمینڈ اور اعتبار گل کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں دیکھتے چلے گئے۔ قابوس اور راشد کیمین کے باہر چلے گئے تھے اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح جھاڑیوں کا الاؤ روشن کر لیا تھا۔ ندیم سلیپنگ بیگ میں لیٹا اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سر بوجھل ہو رہا تھا اور دماغ پر ہتھوڑے سے برستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور کبھی اچانک ہی آنکھ کھل جاتی اور وہ متوحش لگا ہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ اچانک ہی ندیم کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ دماغ پر اب بھی ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ لیکن پیٹ کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ بالآخر وہ سلیپنگ بیگ سے نکل کر باہر آگیا۔ الاؤ کی جگہ تین چار موٹی موٹی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ دو آدمی کمبوں میں دبکے بڑے بڑے پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ شاید اس طرح بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے کیونکہ دونوں میں سے کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ندیم کیمین کے پچھلی طرف چلا گیا اور تقریباً پچاس گز دور نکل کر جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد وہ جھاڑیوں سے نکل کر واپس مڑنا ہی چاہتا تھا کہ کسی چیز نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ ندیم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی سفید بھیڑیے کا خیال ابھرا تھا۔ لیکن وہ سفید بھیڑیا کوئی اور جنگلی جانور نہیں تھا، کوئی انسان تھا جو اسے دوپٹے کی کوشش کر رہا تھا۔

ندیم کا دماغ اب بھی کسی قدر بوجھل تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو حملہ آور کے شبخے سے چھڑانے کی کوشش شروع کر دی اور بالآخر وہ حملہ آور کو اپنے اوپر سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر حملہ آور سنبھل کر دوبارہ اس کی طرف لپکا۔ ندیم نے جھکائی دے کر اس سے بچنے کی کوشش کی مگر حملہ آور انا بھینسے کی طرح اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے

اطمینان سے سو سکتے تھے۔

”اس کیمین کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ قرب وجوار میں کوئی نہ کوئی بستی بھی ہوگی۔“ ندیم نے کیمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں!“ قابوس نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”بہت عرصہ پہلے لوگ برفانی چیتوں اور لومڑیوں کا شکار کھینے کے لئے اس طرف آیا کرتے تھے۔ پھر ان پہاڑوں میں جنگلی چابوروں کے شکار پر پابندی لگادی گئی اور لوگوں نے پہاڑوں کی طرف آنا چھوڑ دیا۔ یہ کیمین بھی پناہ اسی زمانے کی یادگار ہے اور ہمارے لئے کم از کم ایک رات کے لئے پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ ندیم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے ہم راستہ بھٹک کر مزید بلندی کی طرف جا رہے ہیں جیسے ناگاپربت کی چوٹی سر کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔“ قابوس نے کہا۔

قابوس کی اس بات پر ندیم چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اب وہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ پچھلے دو دن سے وہ مسلسل بلندی کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ وہ گمشدہ طیارے کی تلاش میں نکلے تھے اور خود گمشدہ ہو گئے تھے۔

لکڑی کا وہ کیمین ان کے اندازے کے مطابق تقریباً پچاس سال پرانا تھا۔ تبدیلی زمانہ نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ فرش پر گرد جمی ہوئی تھی جسے صاف کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اور پھر خچروں سے سامان اُتارا جانے لگا۔

کیمین کا دروازہ کسی حد تک سلامت تھا۔ البتہ چاروں طرف بنی ہوئی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جن سے رخ بستہ ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ کیمین میں آگ نہیں جلائی جا سکتی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ کیمین لکڑی کا بنا ہوا تھا جس سے آگ لگ جانے کا اندیشہ تھا اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ آگ جلانے کے لئے لکڑیاں دستیاب نہیں تھیں۔ کیمین کے آس پاس یوں تو جھاڑیاں بکثرت تھیں مگر گیلی تھیں اور مشکل ہی سے جل سکتی تھیں۔ لیکن کھانے کی تیاری کے سلسلے میں کچھ تو کرنا تھا۔

راشد اور قابوس وغیرہ نے بہت سی جھاڑیاں جمع کر لیں۔ کھانا پہلے اعتبار گل تیار کیا کرتا تھا۔ اب یہ ذمہ داری قابوس اور محسن نے مل کر سنبھال لی تھی۔

ندیم ہوش میں آیا تو دھوپ چمک رہی تھی۔ برف پر چکا چوند کر دینے والی چمک میں وہ زیادہ دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رک سکا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس لمحے کھوپڑی میں ٹیپیں اٹھنے لگیں اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور پھر اپنے بالوں میں چیچپاٹ سی محسوس کر کے چونک گیا۔ اس نے ہاتھوں کو اٹکھا۔ انہیں خون آلود تھیں۔ رفتہ رفتہ اسے سب یاد آ گیا۔ رات کو وہ فطری ضرورت کے تحت کیمین سے نکل کر اس طرف آیا تھا اور پھر کسی نے اس پر حملہ کر دیا تھا اور وہ دونوں لڑتے ہوئے ڈھلان پر لڑھکنے لگے تھے۔ پھر ندیم کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن..... وہ یہ جگہ تو نہیں تھی جہاں وہ بے ہوش ہو کر گر رہا تھا۔ وہ تو ڈھلان پر ایک پتھر کے پاس گر رہا تھا اور اس وقت وہ جہاں پڑا تھا وہ ایک چٹانی کنج سا تھا۔ اور بالکل سامنے پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں براہ راست اس پر پڑ رہی تھیں۔ چٹانوں کی آڑ ہونے کی وجہ سے اوپر سے اسے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ چٹانوں کے اس کنج میں وہ ہوا سے بچ گیا تھا۔ اگر کھلی جگہ پر پڑا رہتا تو اب تک اس کی لاش بھی اکڑ چکی ہوتی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے کھلی جگہ پر سے اٹھا کر اس کنج میں حملہ آور ہی نے ڈالا ہو گا۔ وہ کچھ دیر تک سر کو سہلاتا رہا۔ ٹکرانے سے کھوپڑی کی کھال پھٹ گئی تھی جس سے بننے والا خون جم چکا تھا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا گیا۔ رات بھر سردی میں پڑے رہنے سے اس کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ وہ چٹان کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور باری باری ٹانگوں کو ہلکے ہلکے جھٹکے دینے لگا۔

دفعہ س کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ اپنی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیبوں میں تمام چیزیں موجود تھیں۔ لیکن اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ بے ہوش ہونے کے بعد اس کی جیبوں کی تلاشی لی گئی تھی۔ غالباً حملہ آور کو اپنے مطلب کی کوئی چیز نہیں ملی تھی اس لئے وہ تمام چیزیں دوبارہ اس کی جیبوں میں ٹھونس دی گئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

ندیم چٹانوں کے کنج سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گیا اور چڑھائی چڑھنے لگا۔ اوپر بہت دور چڑھنے کے درختوں کی ایک قطار سی نظر آرہی تھی۔ جب وہ نشیب سے نکل کر اوپر آیا تو اسے

سر کی ٹکڑی کے سینے پر لگی اور وہ چیختا ہوا پشت کے بل ڈھیر ہو گیا۔ حملہ آور نے اس پر چھلانگ لگادی مگر ندیم بڑی پھرتی سے لوٹ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ حملہ آور منہ کے بل برف پر گرا۔ ندیم نے فوراً ہی اسے چھاپ لیا۔ اب حملہ آور اپنے آپ کو اس کے شکنجے۔ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا برف پر لوٹنے لگے۔ برف اڑا کر چاروں طرف بکھر رہی تھی۔

حملہ آور نے چہرے پر ماسک چڑھا رکھا تھا جس سے ندیم اس کا چہرہ ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے ذہن میں پانڈے کا خیال ابھر جوا غار میں ڈھانچے کے لباس سے ملنے والے کاغذات کے حصول کے لئے اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ لیکن پانڈے کا خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ جب وہ کیمین سے نکلا تھا تو پانڈے اپنے سلپنگ بیک میں دبا گہری نیند سو رہا تھا۔ پھر قابوس کا خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ قابوس کے تین آدمی اس ہم کے دوران ہلاک ہو چکے تھے اور اعتبار گل کی موت کا تو وہ انہی کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مایوس ہو گیا ہو اور اس قسم کے جھٹکڈے استعمال کر کے یا تو وہ اپنے ساتھیوں کی موت کا انتقام لینا چاہتا ہو یا انہیں چلنے پر مجبور کرنا چاہتا ہو۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے ایک کھڈے کنارے پر آگئے تھے۔ کھڈی ڈھلان تقریباً ساٹھ کے زاویے پر تھی اور یہ ڈھلان بہت گہرائی تک چلی گئی تھی۔ حملہ آور ندیم کو اس ڈھلان پر دھکیلنا چاہتا تھا لیکن ندیم نے ایک ہاتھ سے ایک جھاڑی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے حملہ آور کا گلابوچ رکھا تھا۔ اپنا گلابوچ چھڑانے کی کوشش میں حملہ آور اس کے منہ پر گھونسنے برسانے لگا۔ ندیم نے جھاڑی چھوڑ دی اور ایک بار پھر حملہ آور سے لپٹ گیا۔

وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ڈھلان پر لڑھکنے لگے۔ دونوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کوئی بھی کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا اور بالآخر ندیم کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ وہ پتھر سے ٹکرا کر زک گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ اپنے حواس قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے ذہن پر تاریکی چھاتی چلی گئی اور بالآخر وہ اوندھا ہو کر پتھر کے قریب گر گیا۔

اس کے ساتھی اس کی آواز سن کر اسے تلاش کرتے ہوئے اس طرف آئیں۔ اس کی آواز کی بازگشت وادی میں گونجتی رہی لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ایک چھوٹی سی چٹان کے دوسری طرف آگیا۔ اس طرف بھی ایک وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی لیکن کہیں اس طرف بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ندیم کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کہاں آگیا تھا۔ اس نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی ”ایس ان ونڈر لینڈ“ جس میں ایک لڑکی خواب میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتی ہے جو اس کے لئے بالکل اجنبی ہوتی ہے اور اسے قدم قدم پر حیرت انگیز واقعات کا سامنا ہوتا ہے۔

ندیم یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ بھی کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟

لیکن یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ وہ خوفناک حقیقت تھی جو سرد جہنم کی صورت میں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سردی اب اس پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ سر کا زخم تکلیف دینے لگا تھا اور پیر بھی سن ہو رہے تھے۔ وہ ہاتھوں کو بھی بار بار جھٹک رہا تھا۔ چہرے پر بھی وہ عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ بار بار ناک کو چھو کر دیکھتا۔ ناک بھی سن ہو رہی تھی۔ اسے ایک انگریزی فلم یاد آگئی۔ ایک آدمی برفانی علاقے میں بھٹک جاتا ہے اور شدید سردی سے اس کے جسم کے اعضا جھڑنے لگتے ہیں۔ یہ سوچ کر ہی ندیم کانپ اٹھا تھا کہ اگر وہ جلد ہی اپنے ساتھیوں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہو گا۔

وادی کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا وہ اچانک ہی ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہ ندی تقریباً تین فٹ چوڑی تھی اور اس میں بہنے والا پانی دائیں طرف ایک چشمے سے اُبل رہا تھا۔ ندیم نے ندی کے پانی میں ہاتھ ڈالا تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ ندی کا پانی گرم تھا جیسے اس کے نیچے میسر جل رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں پیر اور ہاتھ پانی میں ڈال دیئے۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے جوڑوں میں شدید درد ہو رہا تھا مگر گرم پانی کی سینکائی سے آہستہ آہستہ تکلیف کم ہونے لگی۔ وہ پیر پانی میں ڈالے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ سامنے والی چٹان پر ایک لمحے کو کوئی چیز دھوپ میں چمکی۔ اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز گونجی اور گولی ندیم سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر ایک پتھر پڑ گئی۔ ندیم نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

اندازہ ہوا کہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں اس پر حملہ کیا گیا تھا۔ دور دور تک کہیں کہیں کاہن نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ شاید غلط سمت میں آگیا تھا۔ یہ سوچتے ہی اس کی روح قابو گئی۔ ایک انجانے خوف کی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ خطہ سرد جہنم تھا۔ اس کے چاروں طرف برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ اپنی پارٹی سے نہ مل سکا تو اس سرد جہنم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ اس کی لاش اس ویرانے میں بھٹکتے ہوئے بھٹکتے ہوئے دوسرے جانوروں کی خوراک بن جائے گی۔

ندیم سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں کو اس کی گمشدگی کا پتہ چل گیا ہو گا اور انہوں نے اس کی تلاش شروع کر دی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی اس طرف بھی آ رہا ہو۔ اسے کوئی اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ کہیں کس طرف ہے۔ وہ محض اندازے کی بناء پر ایک طرف چلنے لگا۔

اس کے پیروں میں اونی موزے تھے۔ جسم پر پتلون اور قمیص پر سویٹر اور اس کے اوپر جرسی پہنے ہوئے تھے۔ وہ لوگ رات کو سلیپنگ بیگ میں بھی ایسے ہی گرم کپڑے پہن کر سوتے تھے لیکن برف پر تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کے اونی موزے بھیک گئے اور پیروں سے ٹھنڈک چڑھنے لگی۔ وہ تیز تر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔

فائر کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ فائر کی آواز دور کی اور گونجتی ہوئی سی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ فائر کرنے والا کس طرف تھا۔ وہ محض اندازے کی بناء پر ایک طرف چلا رہا۔ فائر کی آواز سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی وادی میں موجود تھے اور اس کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی اور گولی شاید اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کرنے کے لئے چلائی گئی تھی۔

وہ چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے گرد گھومتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں آگے گہرا کھڈ تھا۔ چٹان بالکل عمودی تھی اور اس کھڈ میں اترنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ مڑ کر دوسرے راستے پر ہولیا اور تنگ سی چٹانوں کے بیچ میں ایک دراڑ سے گزر کر دوسری طرف پہنچا۔ اس کے سامنے نشیب میں ایک وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ برف سے ڈھکی ہوئی وادی میں چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن کہیں کا نام و نشان اب بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے ساتھیوں کے نام پکارنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید

چاہتا تھا۔ گزشتہ رات والے واقعے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ ان کے کیمپ میں اس کا کوئی دشمن موجود تھا اور اس کی دشمنی کی وجہ بھی وہ سمجھ چکا تھا۔ صبح ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس نے اپنے لباس کی جیبوں میں رکھی ہوئی چیزوں کو چیک کیا تھا۔ تمام چیزیں موجود تھیں مگر انہیں چیک کرنے کے بعد دوبارہ جیبوں میں ٹھونسا گیا تھا۔ اس کا طالب تھا کہ اس پر حملہ آور ہونے والا جو کوئی بھی تھا، اسے نہ تو اس کی جیبوں میں رکھی ہوئی خفیہ رقم کی ضرورت تھی نہ ہی دوسری چیزوں سے سروکار تھا۔ اسے صرف ان کاغذات سے دلچسپی تھی جو غار میں ایک ڈھانچے کے لباس سے برآمد ہوئے تھے۔ ان کاغذات کے حوالے سے صرف پانڈے ہی ایک ایسا شخص تھا جس پر حملہ آور ہونے کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ندیم نے وہ کاغذات ایسی جگہ چھپا رکھے تھے کہ پانڈے کے فرشتے بھی تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن یہ ان باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ موت جبرے پھیلانے اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ بھیڑیے کی طرف دیکھنے لگا جو ندی سے نکل کر کنارے پر آگیا تھا اور اب شاید ندیم پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اگلے دونوں پیر کچھ آگے کو نکال لئے تھے۔ اس کی غراہٹ بڑی خوفناک تھی۔

ندیم دونوں ہاتھوں سے پتھروں کو ٹٹولنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک ایسا نوکیلا پتھر آگیا جس کا وزن ایک کلو کے لگ بھگ ضرور رہا ہو گا۔ ندیم نے اس پتھر کو مضبوطی سے پکڑا اور پھر اچانک ہی بھیڑیے پر دے مارا۔

پتھر بھیڑیے کی تھوٹھنی پر لگا۔ وہ ہلبلا یا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ندیم پر حملہ کر دیا۔ ندیم اس حملے کے لئے تیار تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے دائیں طرف ہٹ گیا۔ بھیڑیا اپنی ہی جھونک میں پتھروں پر گرا۔ اور جب وہ سنبھل کر مڑا تو اس کا منہ پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ ندیم اس مرتبہ بھی بچ نکلا۔ بھیڑیا پھر ندی کے پانی میں جاگرا۔

شدید سردی کے باوجود ندیم کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس کے دماغ میں تیز سنناہٹ ہو رہی تھی اور جسم پر چیونٹیاں سی رنگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں لیکن اس خونخوار بھیڑیے کے خوف کے باوجود اس نے اپنے حواس بحال رکھے تھے۔

ندیم پہلو کے بل چھوٹے چھوٹے پتھروں پر گرا تھا۔ اس کی کہنی پر چوٹ لگی تھی لیکن اس کے چھلانگ لگانے کے ساتھ ہی کوئی چیز اس کے اوپر سے ہوتی ہوئی شرابور آواز کے ساتھ ندی میں گری تھی۔ ندیم کا خیال تھا کہ گولی کی دھمک سے کوئی بڑا پتھر جگہ سے لڑھک کر گرا ہو گا۔ لیکن کتے جیسی غراہٹ کی آواز سن کر ندیم نے ایک طرف دیکھا تو وہ اپنی کہنی کی تکلیف بھی بھول گیا اور چٹان پر سے چلائی جانے والی گولی کا بھڑک اس کے سامنے سفید بھیڑیا تھا جو ندی کے پانی میں کھڑا اس کی طرف دیکھتے ہوئے رہا تھا۔ بھیڑیے کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی سرخ زبان اور نوکیلے خونخوار دانت دل پر دہشت طاری کئے دے رہے تھے۔ بھیڑیا پانی میں بھیگا ہوا تھا۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھیڑیا ہی تھا جس نے پشت پر سے اس پر چھلانگ لگائی تھی لیکن چٹان سے گولی چلنے سے ندیم نے بھی ایک طرف چھلانگ لگادی تھی اور بھیڑیا اس کے اوپر سے ہوتا ہوا ندی میں جاگرا تھا۔ اگر ندیم عین وقت پر ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو یہ خونخوار بھیڑیا اسے دلوں چکا ہوتا اور اس کا حشر بھی شاید گلرز سے مختلف نہ ہوتا۔

لیکن ..... بھیانک موت اس خونخوار بھیڑیے کی صورت میں اب بھی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ فاصلہ صرف چند گز کا تھا۔ بھیڑیے کی غراہٹ بڑھ رہی تھی۔ ندیم نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے پیچھے چٹان تھی۔ گویا پیچھے بننے کی جگہ نہیں تھی۔ سامنے ندی تھی جس میں وہ خونخوار بھیڑیا جبرے کھولے کھڑا تھا۔ دائیں بائیں بلند کھلی جگہ تھی۔ اگر بھیڑیا اس پر حملہ آور ہو تو بچنے کی کوشش میں جھکاؤ دے کر دائیں بائیں نکلا جاسکتا تھا۔ اگر وہ بھیڑیے کے حملے سے بچ بھی جائے تو بڑی آسانی سے دشمن کی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

چٹان پر را کھل بردار دشمن کے بارے میں اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی شخص ہو سکتا تھا جس نے گزشتہ رات اس پر حملہ کیا تھا اور بے ہوش ہونے کے بعد اسے نجا۔ کس جگہ ڈال گیا تھا جہاں ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنے کیمپ کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چٹان پر بیٹھے ہوئے شخص نے ندیم کے عقب سے بھیڑیے کو حملہ آور ہوتے دیکھ لیا ہو اور گولی بھیڑیے پر چلائی گئی ہو۔ لیکن گزشتہ رات کے واقعے کے بعد ندیم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہا۔

”تم ٹھیک ہونا؟“ قابوس نے اسے سہارا دے کر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ اس دوران پانڈے اور محسن بھی قریب آگئے تھے۔

”میرا خیال ہے وہ خونی بھیڑ یا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔“ پانڈے نے بنظر غائر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں! اس نے حملے تو بہت کئے تھے مگر میں نے اپنے حواس قائم رکھے۔ اگر خوف سے بدحواس ہو جاتا تو وہ سفید بھیڑ یا اب تک میرے بچنے اُدھیر چکا ہوتا۔ ممکن ہے وہ میرا بچھا نہ چھوڑتا۔ تم لوگوں کی فائرنگ سے وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ وہ میرا صرف ایک موزہ لے جانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔“ ندیم نے یہ کہتے ہوئے پیر کی طرف اشارہ کیا۔

”شکر کرو صرف موزہ ہی لے کر گیا ہے۔ اگر تمہارا پیر اس کے منہ میں آ جاتا تو اس وقت تم ایک پیر سے محروم ہو چکے ہوتے۔“ قابوس نے کہا۔

”یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں نے سامنے والی چٹان پر سے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”میں ہوائی فائر کر کے تمہیں اپنی موجودگی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر پھر اچانک ہی میری نظر تمہارے پیچھے والی چٹان پر اس سفید بھیڑیے پر پڑ گئی۔ میں نے بھیڑیے کو خوف زدہ کرنے کے لئے گولی چلا دی۔ گولی کی وجہ سے تم اپنی جگہ سے چھلانگ نہ لگا چکے ہو تے تو وہ خونخوار بھیڑیا تمہارے اوپر ہی آتا۔ لیکن وہ بھیڑیا بڑا ہی بے خوف ثابت ہوا جو بار بار تم پر حملہ آور ہوتا رہا اور تم اس سے زیادہ نڈر اور باہمت نکلے جو اپنی ذہانت سے اس کے حملوں سے بچتے رہے۔“

”میں خوفزدہ تو تھا لیکن اگر اپنے حواس قائم نہ رکھتا تو وہ خونی بھیڑیا میرا حساب کتاب برابر کر چکا ہوتا۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”مگر.....“ قابوس نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم کیپ سے

فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ گولی بھیڑیے سے سرز ایک فٹ کے فاصلے پر پانی میں گری تھی اور ندیم کو یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ اس بار گولہ قدرے قریب سے کسی اور چٹان سے چلائی گئی تھی۔

بھیڑیے نے غراتے ہوئے ایک بار پھر ندیم پر چھلانگ لگا دی۔ ندیم پھرتی سے اپنی طرف ہٹا مگر اس کے دائیں پیر کا موزہ بھیڑیے کے دانتوں میں آگیا۔ ٹھیک اسی وقت یکے بعد دیگرے دو تین فائر ہوئے۔ گولیاں اس کے آس پاس پتھروں پر لگیں۔ اس مرتبہ بھیڑیا بھی شاید گولیوں سے ڈر گیا تھا۔ اس نے تھو تھنی کو زوردار جھکا دیا۔ موزہ ندیم کے پیر سے نکل گیا اور بھیڑیا موزے کو منہ میں لٹکانے کے بعد رفقاری سے دوڑتا ہوا چٹانوں پر غائب ہو گیا۔ فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی۔ گولیاں اب ان چٹانوں پر لگ رہی تھیں جہاں بھیڑیا غائب ہوا تھا۔

ندیم پتھروں پر پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھا۔ اگر موزے کی بجائے اس کا بھینڑیے کے منہ میں آ جاتا تو وہ اس کا پیر چبا ڈالتا۔ برف میں مسلسل چلتے رہنے سے اور برفی ندی کے گرم پانی میں پیر ڈال کر بیٹھنے سے موزہ بھیک کر اس کا پہننے والا حصہ ڈھیلا ہو کر اسے آگے نکل گیا تھا اور موزے کا یہی حصہ بھیڑیے کے منہ میں آگیا تھا۔

اپنے عقب میں چٹان پر پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے پیچہ مڑ کر دیکھا۔ پانڈے، محسن اور قابوس رائفلیں سنبھالے بڑے محتاط انداز میں چٹان سے اتر رہے تھے۔ ان کے پیروں میں آکر چھوٹے موٹے پتھر لڑھک رہے تھے۔ چٹان اترتے ہی سب سے پہلے قابوس دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا تھا۔ اس نے ٹٹول کر بندھ اچھی طرح معائنہ کیا۔ کھوپڑی کے بالوں میں خون جما ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پر اور کوئی زخم نہیں تھا۔



نکل کر کہاں غائب ہو گئے تھے؟ صبح جب تمہیں کیبن میں موجود نہیں پایا تو ہم سمجھے کہ شاید تم رفع حاجت کے لئے کسی طرف چلے گئے ہو۔ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد بھی تم نہیں لوٹے تو ہمیں پریشانی ہوئی اور تمہاری تلاش شروع کر دی گئی۔ ہم نے ایک دوسرے فائرنگ بجڑ کی تھی تاکہ تم ہماری موجودگی سے آگاہ ہو کر اس طرف آ جاؤ۔“

”وادی میں فائرنگ کی آوازیں میں نے بھی سنی تھیں لیکن آواز چاروں طرف واپس ہوئی محسوس ہو رہی تھی اس لئے سمت کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا اور پھر بھٹکتا ہوا انجانے کہاں نکل گیا۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”تمہارے سر پر یہ چوٹ کیسی ہے؟ کہیں گر گئے تھے؟“ محسن نے پوچھا۔

”نہیں!“ ندیم نے نفی میں سر ہلادیا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ ”اوہاں! ایک جگہ برف پر پھسل گیا تھا۔ پتھر پر گرنے سے چوٹ لگ گئی۔ ہمارا کیپ یہاں سے کتنی دور ہے؟“ اس نے پوچھا۔ پانڈے کی موجودگی کی وجہ سے اس نے رات کو اپنے ساتھ پیش آنے والے والے کی تفصیل بتانا اس لئے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اگر اس پر حملہ پانڈے ہی نے کیا تھا تو وہ ہوشیار نہ ہو جائے۔

”اس چٹان کے پیچھے۔“ قابوس نے سامنے والی چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم سردی سے ٹھہر رہے ہو۔ لو..... میرا کوٹ پہن لو..... اور اپنے پیروں پر چل سکتے ہو تو چلو..... ورنہ ہم مل کر تمہیں اٹھالیتے ہیں۔“

”نہیں! میں چل لوں گا۔“ ندیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور قابوس کا دیا ہوا بھاری اور کوٹ پہن لیا۔

چٹان کے اوپر سے ہو کر کیپ تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ چیکو، موزیکا اور راش کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں نے رائفلیں سنبھال رکھی تھیں جیسے کسی دشمن کا اچانک حملے کا خطرہ ہو۔

ندیم کی گمشدگی کی وجہ سے ابھی تک کسی نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ اس تلاش میں پھرتے رہے تھے۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اس لئے ناشتہ بجائے دوپہر کے کھانے کو ترجیح دی گئی۔ وہ لوگ جو آٹا وغیرہ لے کر چلے تھے وہ دونوں ہی ختم ہو گیا تھا اور اب مہربند خوراک استعمال کی جا رہی تھی۔

”گمشدہ ہوئی جہاز اور اس کے مسافر تو ہمیں ابھی تک نہیں ملے اور نہ ہی ان کے مرنے کی توقع ہے۔“ راشد نے کہا۔ ”لیکن یہ سفید بھیڑ یا موت کے سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگ چکا ہے۔ اگر ہم نے اس سے نجات حاصل نہ کی تو یہ ایک ایک کر کے ہم سب کا خاتمہ کر دے گا۔ میرا خیال ہے پہلے اس کا بندوبست کرنا چاہئے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک نہیں، دو بھیڑیے ہیں۔“ یہ بات پانڈے نے کہی تھی۔ ”تم لوگوں کو یاد ہو گا کہ ندیم کی تلاش میں صبح سب سے پہلے ہم جنوب کی طرف چلے گئے تھے اور اس طرف بھی ایک بھیڑیے کو دیکھا گیا تھا جبکہ ندیم مشرق میں تھا اور بھیڑیے نے اسی جگہ پر حملہ کیا تھا۔ یہ تو بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھیڑیا اتنی جلدی طویل فاصلہ طے کر کے اس طرف آ گیا ہو۔“

”مجھے بھی یہی شبہ ہو رہا ہے۔“ راشد نے کہا۔ ”تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے میں نے سفید بھیڑیے کو کیبن سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر نشیب کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ چیکو اور موزیکا میرے اس بیان کی تصدیق کر سکتی ہیں۔ اس لئے ہم تینوں کیبن میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے کہ وہ بھیڑیا کہیں اس طرف نہ نکل آئے۔ اور تم لوگوں کے بیان کے مطابق تقریباً اسی وقت بھیڑیے نے ندیم پر حملہ کیا تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ہی بھیڑیا ایک وقت دو مختلف جگہوں پر موجود ہو۔ بشرطیکہ وہ کوئی بدروح نہ ہو۔“

”راشد ٹھیک کہتا ہے۔“ موزیکا نے اس کی تائید کی۔ ”اس دوسرے بھیڑیے کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں اور ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔“

”اگر وہ واقعی دو بھیڑیے ہیں اور وہ نہ، مادہ ہیں تو یہ ہمارے لئے نہایت خطرناک بات ہوگی۔ اب سب سے پہلے ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا ہو گا ورنہ یہ ہمارا بندوبست کر ڈالیں گے۔“ قابوس نے کہا۔

ندیم دو تین کبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ اب اس کی سردی کسی حد تک کم ہو گئی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ پہلے اس خونی بھیڑیے یا بھیڑیوں کا بندوبست کرنا چاہئے ورنہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خونخوار درندے ایک ایک کر کے انہی کا خاتمہ کر دیں۔

راشد اپنی جگہ پر بیٹھا محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پتھروں سے بنایا گیا ایک پتلا اس سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ رات کے وقت اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے واقعی وہ کوئی انسان ہو۔

ایک اس پتلے کے دائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر کسی سائے کو حرکت کرتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ وہ کوئی جانور ہی تھا جس کی رنگت سفید تھی اور برف پر ریگلتے ہوئے وہ مشکل ہی سے نظر آرہا تھا۔ راشد کچھ دیر تک اس متحرک سفید سائے کو دیکھتا رہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ سفید بھیڑیا ہے جو گھات لگائے رہیگا ہوا پتھروں کے اس پتلے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ راشد نے نشانہ لے کر ٹرائیگر دیا۔

ویرانہ فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ سفید سایہ اچھل کر برف پر گرا۔ راشد کی گولی نشانے پر لگی تھی اور وہ جانور گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ مگر جب وہ جانور ہوا میں اُچھلا تھا تو اس کا حجم دیکھ کر راشد کو حیرت ہوئی تھی۔ اس کا حجم بھیڑیے سے کہیں چھوٹا تھا۔ راشد کے ساتھ محسن تھا۔ وہ اٹھ کر رائفل سنبھالے اس جانور کی طرف دوڑا جسے راشد نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو انکشاف ہوا کہ وہ سفید فروالی لومڑی تھی۔ محسن نے لومڑی کو دم سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے اس کے ساتھی بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ انہوں نے بھی محسن کے ہاتھ میں لومڑی دیکھ لی تھی۔

دفعۃً بائیں طرف سے غراہٹ کی آواز سن کر محسن بدحواس سا ہو گیا۔ وہ لومڑی کو بچیک کر تیزی سے اس طرف گھوما۔ بھیڑیے کی غراہٹ پہچاننے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ بھیڑیا تقریباً دس قدم کے فاصلے پر ڈھلان میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بلور کی طرح چمک رہی تھیں۔

محسن کے حواس جواب دے گئے تھے۔ اس نے رائفل سیدھی کرنا چاہی مگر موت کو اس قدر قریب دیکھ کر اس کی تمام تر قوتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ رائفل اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر نیچے گر گئی۔ بھیڑیے کی سرخ زبان اور خونخوار دانت دیکھ کر اس کے دھمکے کھڑے ہو گئے۔ بھیڑیا غراتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا۔ غراہٹ سن کر محسن جیسے ٹوٹ میں آ گیا۔ اس نے چیختے ہوئے کیمپ کی طرف چھلانگ لگا دی۔ بھیڑیے نے بھی

ویسے یہ سفید بھیڑیا کچھ عجیب سی فطرت کا ثابت ہوا تھا۔ عام بھیڑیا عام طور پر ویرانے میں مل جانے والے اکیلے ڈکیلے آدمی پر حملہ کرتا ہے لیکن اس کا مقابلہ کیا جائے تو بہتر لگتا ہے اور اگر زیادہ لوگ ہوں تو بھیڑیا قریب آنے کی ہمت نہیں کرتا۔ لیکن یہ سفید بھیڑیا تو کسی بدروح کی طرح کئی روز سے ان کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے شہر و زکو ختم کیا۔ پھر گلریز اس کی درندگی کا نشانہ بنا۔ مس کوراکو ایک رہنچہ نے شہر دیا تھا۔ اعتبار گل برفانی طوفان میں پھنس کر خنجر سمیت کھڈ میں جا گرا تھا اور بے رحم موت نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ریمنڈ خنجر سے گر کر اس کے ساتھ پتھروں پر گھسٹا ہوا موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ اور اب ندیم اس خونخوار بھیڑیے ہی کے ہاتھوں موت کا شکار ہوتے ہوئے بچا تھا۔ قدرتی آفات اور ان خونخوار درندوں کے علاوہ ان کی پارٹی میں ایک کالی بھیڑ بھی گھس آئی تھی جو سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کالی بھیڑ کے بارے میں ندیم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس لئے اس پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ لیکن اگر سفید بھیڑیے ایک سے دو ہو گئے ہوں اور وہ واقعی نرمادہ تھے تو ان کے لئے بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ اس لئے پاپا ان کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔

اس روز انہوں نے آگے جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور بھیڑیوں کے شکار پر وگرام بنانے لگے۔ بھیڑیوں کو دھوکا دینے کے لئے انہوں نے ایک اور منصوبہ بھی بنایا تھا۔ کیمین سے کچھ دور تھوڑے فاصلے پر تین چار جگہوں پر پتھر نیچے اوپر کھڑے کر کے انہیں اس طرح کوٹ یا کبل اوڑھا دیئے گئے تھے کہ وہ دور سے آدمی ہی لگتے تھے۔ کاحیاں تھا کہ بھیڑیے کپڑوں میں لپٹے ہوئے ان پتھروں کو انسان سمجھ کر قریب آئیں۔ تو انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔

پورا دن خیریت سے گزر گیا۔ شام ہوتے ہی وہ لوگ محتاط ہو گئے۔ وہ لوگ باری بار مختلف جگہوں پر مورچے سنبھالے اس طرح بیٹھے رہے جیسے دشمن کی طرف سے حملہ انتظار کر رہے ہوں۔

رات دس بجے کے قریب ایک عجیب سی آواز فضا میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن وہ بھیڑیے کی آواز ہرگز نہیں تھی۔ غالباً کوئی اور جانور تھا۔

وہ بھیڑیا اس کا صرف موزہ ہی اتار کر لے جانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔“

باہر پہاڑوں میں فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یہ آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ان کے ساتھی بھیڑیے کے تعاقب میں چاروں طرف دوڑ رہے ہوں۔ وقفہ وقفہ سے فائرنگ کی آوازوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ بھیڑیا ان کی نگاہوں میں تھا اور وہ اسے شکار کر کے دم لیں گے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ لوگ واپس آ گئے۔ ان میں سے دو آدمیوں نے مردہ برفانی لومڑیاں اٹھا رکھی تھیں جنہیں انہوں نے کیمبن کے سامنے ڈال دیا اور اندر آ گئے۔ راشد نے انہیں لومڑیاں لاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”یہ تو لومڑیاں ہیں اور بھیڑیے کا کیا ہوا؟“ راشد نے پوچھا۔

”اس کم بخت کے دھوکے میں یہ تین لومڑیاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔ ندیم کی گولی سے وہ بھیڑیا بھی زخمی تو ہوا ہے ہم اس لئے اس کا تعاقب بھی کرتے رہے تھے لیکن وہ پہاڑوں میں غائب ہو گیا۔ محسن کیسا ہے؟ زیادہ زخمی تو نہیں ہوا؟“ قابوس نے یہ کہتے ہوئے محسن کی طرف دیکھا۔

”نہیں! بیبر پر بہت معمولی زخم ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ مونیکا نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے زخمی ہونے کے بعد وہ بھیڑیا اب اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔“ راشد بولا۔

”زخمی بھیڑیا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“ قابوس نے جواب دیا۔ ”ہمیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔ اب وہ بار بار چھپنے لگا۔“

”میرا خیال ہے ہمیں کل کا دن بھی یہیں رہنا پڑے گا۔ محسن کی وجہ سے شاید ہم سفر باری نہ رکھ سکیں۔“ ندیم نے محسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں! میں ٹھیک ہوں۔ بہت معمولی سازختم ہے۔ چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ہمیں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہئے۔“ محسن نے جواب دیا۔

بجڑیے کے حملے نے اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔

رات کا باقی حصہ انہوں نے تقریباً جاگتے ہوئے گزارا۔ اور پھر صبح سویرے ہی انہوں

غراتے ہوئے چھلانگ لگائی تھی۔

محسن کا بایاں پیر بھیڑیے کے جڑے میں آ گیا۔ بھیڑیا اسے ڈھان پر کھینچنے لگا۔ محسن بری طرح چیخ رہا تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر اس کے تمام ساتھی ہوائی فائر کرتے ہوئے دوڑ پڑے۔

فائرنگ کی آواز سے بھیڑیے نے محسن کا پیر چھوڑ دیا اور اچھلتا ہوا ایک طرف کھڑا نکلا۔ محسن ڈھان پر لڑھکتا ہوا بالآخر ایک جگہ رک گیا۔ اس کے ساتھی پہنچ گئے تھے۔ راشد اس کے قریب رک گیا اور باقی رائفلیں سنبھالے اس طرف دوڑتے چلے گئے تھے جس طرف بھیڑیا گیا تھا۔

محسن کے پیر میں چڑے کے گرم بوٹ تھے اور اندر دو دو موٹے موزے پہن رکھے تھے۔ بھیڑیے کے دانتوں نے اس کے جوتے کو چیر ڈالا تھا۔ محسن کو تو اس بھیڑیے کی طاقت پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اسے کس قدر آسانی سے گھینتا ہوا پچیس تیس گز دور لے گیا تھا۔

راشد نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اور پھر محسن اس کے سہارے بڑی مشکل سے کیمبن تک پہنچ سکا تھا۔ مچیکو اور مونیکا نے بھی محسن کی چیخیں اور فائرنگ کی آواز سن لی تھی۔ وہ کیمبن کے دروازے کے سامنے کھڑی تھیں۔ محسن کو راشد کے سہارے لنگڑا کر چلنے دیکھ کر دونوں دوڑتی ہوئیں اس کے قریب پہنچ گئیں۔ ان دونوں کی نظریں بیک وقت اس کے کے ادھر سے ہوتے جوتے پر پڑی تھیں۔

کیمبن میں محسن کو بٹھا کر مونیکا اس کا جوتا اتارنے لگی۔ جوتے کے اندر موزہ خون آ رہا تھا۔ موٹے موٹے دونوں اونٹنی موزے اتارے گئے تو پتہ چلا کہ بھیڑیے کا ایک دانت کو بہت معمولی نقصان پہنچا سکا تھا۔ دانت لگنے کا زخم بہت معمولی تھا۔ مونیکا نے فوراً سپرٹ سے زخم صاف کر کے بینڈج کر دی۔

”میرا خیال ہے کہ ایک دو دن تو تمہیں احتیاط ہی سے کام لینا ہو گا۔“ مونیکا نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھیڑیے پہلے ہم سب کو لنگڑا کریں گے اور جب ہم لو دوڑنے یا چلنے کے قابل نہیں رہیں گے تو پھر ہماری ضیافت اڑائیں گے۔“ محسن مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس بھیڑیے نے پہلے ندیم کا بھی پیر ہی چبانے کی کوشش کی تھی

”کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ پانڈے بولا۔ ”ہمیں اس سرد جنم میں بھٹکتے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں۔ ہم اس گمشدہ طیارے اور اس کے مسافروں کو تو کیا تلاش کرتے اپنے کئی آدمیوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ میرا خیال ہیں ہمیں ان چٹانوں سے نکل جانا چاہئے۔ کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے۔“

وہ لوگ کافی دیر تک وہاں کھڑے مشورہ کرتے رہے۔ پھر یہی طے پایا کہ دریا کے کنارے چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ کہیں نہ کہیں راستہ مل ہی جائے گا۔ تقریباً تین میل تک وہ دریا کے کنارے چلتے رہے اور بالآخر نیچے اترنے کا راستہ مل ہی گیا۔

دریا کا پاٹ تقریباً دو سو گز چوڑا تھا مگر پانی بہت کم تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب پہاڑوں کی برف پگھلا شروع ہو گی تو یہ دریا اور پر تک بھر جائے گا اور اسے عبور کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر بھی وہ چٹانوں میں تقریباً دو گھنٹوں تک چلتے رہے اور بالآخر ایک مناسب جگہ دیکھ کر کیمپ لگا دیا۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ یہ دریا عبور کر کے انہیں ان سفید بھیزیوں سے نجات مل گئی تھی جو کئی روز سے موت کے سائے کی طرح ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ اب وہ کم از کم رات کو سکون کی نیند سو سکیں گے۔ لیکن پھر بے داری نظام کو انہوں نے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ بھیزیوں کے علاوہ ان پہاڑوں میں اور بھی خونخوار درندے ہوں گے جو ان کے لئے خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد پھر بے کے لئے ڈیوٹیاں مقرر کر دی گئیں۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ راشد سب سے آخر میں بیدار ہوا تھا۔ وہ آنکھیں کھولنے کے بعد کچھ دیر تک سلپنگ بیگ میں دبکا رہا اور پھر اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ اس کے تمام ساتھی ایک چٹان کے قریب بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ لیکن پانڈے ان میں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ضروریات کے لئے چٹانوں کے پچھلی طرف کہیں نکل گیا ہو۔ راشد نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی اور ایک چٹان کے پیچھے مڑ گیا۔

اس طرف چھوٹی چھوٹی چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ راشد کیمپ سے تقریباً دو

نے کیمپ اٹھا دیا۔ محسن کے پیچ میں اگرچہ تکلیف تھی مگر خنجر پر سواری کی وجہ سے تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

دو پہر گیارہ بجے کے قریب راشد نے اپنا خنجر اچانک ہی روک لیا اور سامنے ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ سامنے دیکھو! اس چٹان پر۔“

ان سب نے خنجر روک لئے اور چٹان کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر ان سب کے من سے بے اختیار گہرے سانس نکل گئے۔ چٹان تقریباً نصف میل دور تھی اور دو سفید بھیزی چٹان پر اس طرح کھڑے تھے کہ انہوں نے تھو تھنیاں اس طرح آسمان کی طرف اٹھا رکھی تھیں جیسے فضا میں کچھ سو گھننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اور پھر کتوں کے رونے جیسی آواز سنائی دینے لگی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ یہ بھیزی زخمی ہونے کے بعد زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ ہمارا راستہ روک کے کھڑے ہیں اور ہمیں آسانی سے اس وادی سے نکلنے نہیں دیں گے۔ قابوس نے کہا۔“

”وہ دونوں بھیزی اس وقت بہترین ٹارگٹ بنے کھڑے ہیں۔ مگر فاصلہ بہت زیادہ ہے گولی وہاں تک نہیں جائے گی۔“ محسن نے کہا۔

”گولیاں ضائع کرنا بیکار ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں تھوڑا سا راستہ بدل لینا چاہئے قابوس نے کہا اور پھر راستے کا تعین بھی اس نے کیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک گھاٹی میں سفر کر رہے تھے۔ تقریباً پانچ میل تک اس گھاٹی میں چلتے رہنے کے بعد وہ اس گھاٹی سے نکل کر ایک بار پھر چٹانوں میں پہنچ گئے۔ گھاٹی نکلتے ہی ان کا سفر دشوار ہو گیا اور پھر ایک جگہ پر اچانک ہی انہیں رک جانا پڑا۔ آگے جیسے اچانک ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس سے آگے بہت گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کا پانی قدر شفاف تھا کہ اس کے نیچے پتھر تک نظر آرہے تھے۔

”واپس چلنا چاہئے۔ آگے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔“ راشد نے ادھر ادھر ہوئے کہا۔

”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ دریا کے کنارے ہم چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔“

نچ اترنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نظر آ ہی جائے گا۔“ ندیم بولا۔

نے ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔ پارٹی کے دو آدمی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ ان بھیڑیوں کی وجہ سے میں بھی کچھ محذور ہو کر رہ گیا ہوں۔ اس لئے کئی روز تک آپ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ ٹھیک ہے سر..... میں وہ کاغذات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور موقع ملے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ اور اینڈ آل!“

پانڈے کی یہ گفتگو سن کر راشد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس گفتگو سے اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پانڈے بھارتی جاسوس تھا اور باقاعدہ پلاننگ کے تحت ان کی اس مہم میں شامل ہوا تھا۔ راشد کو یاد آ رہا تھا کہ شروع میں اس نے ندیم اور پارٹی کے دوسرے ساتھیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کشمیر طیارہ وادی لیپایا چین کی طرف کہیں گرا ہو گا۔ وہ پارٹی کو اس طرف لے جانا چاہتا تھا۔ راشد اچھی طرح جانتا تھا کہ وادی لیپایا پاکستان کی نہایت اہم فوجی تنصیبات تھیں۔ اس وادی میں پاک فوج کے جوانوں کو برفانی علاقوں میں جنگ کی تربیت دی جاتی تھی۔ اور سیاچن تو وہ علاقہ تھا جسے پاکستان کی شہ رگ کہا جاسکتا تھا۔ وہ دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ تھا۔ سیاچن پر قبضہ کرنے کے لئے بھارتی فوج کئی بار کوشش کر چکی تھی اور صرف ایک موقع ایسا آیا تھا جب بھارتی فوج کچھ عرصہ کے لئے سیاچن پر قابض ہونے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ لیکن پھر پاک فوج کے جیالوں نے انہیں مار بھگا دیا تھا۔ پانڈے اس پارٹی کے ساتھ لیپایا چین کی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے فوجی راز حاصل کر کے اپنی حکومت کو آگاہ کر سکے۔

راشد کی رگوں میں خون لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اور ایک وقت پانڈے کا گلا گھونٹ دے۔ لیکن پہلے وہ اپنے ساتھیوں کو پانڈے کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ واپس جانے کے پیچھے مڑا۔ لیکن ایک پتھر اس کے پیروں سے ٹکرا کر چٹان پر لڑھکتا ہوا پانڈے کے بالکل سامنے گرا۔

پانڈے نے چونک کر اوپر دیکھا۔ راشد نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر وہ پانڈے کی نظروں میں آ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ راشد چٹان سے اتر سکتا پانڈے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسری طرف سے چٹان پر آ گیا اور بڑی پھرتی سے اس نے جیب سے پستول نکال کر راشد کو زد پر لے لیا۔

”تو تم نے میری باتیں سن لیں۔“ پانڈے کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”لیکن اب

فرلانگ دور نکل آیا تھا۔ وہ ایک چٹان پر چڑھ کر دوسری طرف اترنا ہی چاہتا تھا کہ ٹھہر گیا۔ چٹان کے دوسری طرف اسے باتوں کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ کون ہو سکتا تھا۔ پانڈے کے سوا اس کے تمام ساتھی کیمپ میں تھے۔ ایک لڑکے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ ممکن ہے ان کی طرح کوئی اور مہم جو پارٹی بھی اس طرف نکلی ہو اور انہوں نے اس چٹان کے دوسری طرف کیمپ لگا رکھا ہو۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک بار پھر ٹھٹھک گیا۔ اس نے پانڈے کی آواز پہچان لی تھی۔ اسے بے حد حیرت ہوئی تھی کہ پانڈے یہاں کس سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن پانڈے کے علاوہ اور کوئی آواز سننا نہیں دے رہی تھی۔

راشد ایک دم سامنے آنے کی بجائے سینے کے بل لیٹ گیا اور ریگتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور بالآخر وہ رک گیا۔ اس نے پانڈے کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ راشد کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

پانڈے ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ چھوٹا سا ٹرانسٹر ریڈیو تھا جس سے وہ اکثر گانے سن کر راتا تھا۔ لیکن اس وقت ریڈیو پر گانے نہیں آرہے تھے۔ ٹرانسٹر کا اینٹینا باہر نکلا ہوا تھا اور پانڈے اس کے سامنے منہ کئے بول رہا تھا۔

”میں بہت کوشش کر چکا ہوں جناب!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جائے کہ سفاری طیارہ وادی لیپایا چین کی طرف غائب ہوا تھا۔ اسے اس طرف تلاش کرنا چاہئے۔ لیکن وہ بضد رہے کہ طیارہ ناٹنگ پربت کے آس پاس یا کشمیر کے سرحدی علاقے میں کسی جگہ گرا ہو گا۔ یس سر.....“

سر..... میں انہیں ناٹنگ پربت کے آس پاس برفانی وادیوں میں گھمار رہا ہوں۔ جی.....“

سمجھ رہا ہوں۔ میں دوسرے وہ کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کر چکا ہوں مگر کامیاب نہیں ہوا۔ وہ کاغذات پارٹی لیڈر ندیم کے قبضے میں ہیں۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ نے پارٹی میں شامل مونیکا نامی ایک فرانسیسی لڑکی کو بھی اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ ہاں..... مجھے مونیکا پر پورا بھروسہ ہے..... میں سمجھ گیا سر..... میں مونیکا کو سمجھا دیا گا۔ دراصل اس نے ابھی تک ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ جی..... مجھے یقین ہے مونیکا اسے اپنے جال میں پھنسا لے گی۔ یس سر..... سمجھ گیا سر..... دو خوشخوار بھیڑیو

تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔“

”تمہارا راز کھل چکا ہے پانڈے!“ راشد نے جواب دیا۔ ”اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہاری پارٹی میں شامل کیوں ہوئے تھے۔ لیکن تم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے گے۔ تم لوگوں نے ہمیشہ ہمارے ملک کے خلاف سازشیں کی ہیں مگر ہمیشہ منہ کی کھائی ہے اور اس دفعہ بھی تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

”یہاں سے زندہ واپس جاؤ گے تو میرے بارے میں دوسروں کو کچھ بتا سکو گے نا۔ چلا اس طرف چٹان سے نیچے اترو۔“ پانڈے غریبا۔

راشد اس کے آگے آگے چلتا ہوا چٹان سے اترنے لگا۔ لیکن آدھا راستہ طے کرتے ہی اس نے گھوم کر اچانک ہی پانڈے کے پستول والے ہاتھ پر ٹھوکر ماری۔ پستول پانڈے کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں اڑتا ہوا دور جاگرا۔ لیکن اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راشد پر چھلانگ لگادی۔

دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے چٹان سے لڑھکنے لگے۔ چٹان کے دامن میں پیچھے ہی راشد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑالیا۔ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن پانڈے نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ راشد منہ کے بل گرا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے دوسری ٹانگ گھوڑے کی دولتی کی طرح چلائی تھی۔ اس کا پیر پانڈے کے منہ پر لگا۔ پانڈے کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی راشد کا دوسرا پیر اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

راشد بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پانڈے کو اٹھنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ پانڈے بری طرح پشمار ہا۔ لیکن بالآخر وہ سنبھل گیا اور مونہ ملتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دونوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ایک دوسرے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ راشد اگر پانڈے کے

ہاتھوں سے نکلتا تو پانڈے خود بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ پارٹی کے دوسرے آدمی جاسوس اور غداری کے جرم میں اسے مار مار کر ختم کر دیتے۔ وہ پاکستانیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ انہیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ اگر یہ دوست کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتے

تھے تو دشمن کو زندہ بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ پانڈے کا راز کھل گیا تھا۔ لیکن یہ راز صرف ایک آدمی تک محدود تھا۔ راشد کی زندگی اس کی اپنی موت تھی اور راشد کی موت اس کی زندگی کی ضمانت بن سکتی تھی۔ اس لئے وہ ہر قیمت پر راشد کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔

پانڈے نے اچانک ہی آگے بڑھ کر راشد کے منہ پر گھونسا مارنا چاہا مگر اس نے پانڈے کے ہاتھ کی کمانی پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کے پیٹ میں زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ پانڈے بلبللا کر دوہرا ہو گیا۔ راشد نے گھٹنے سے اس کی تھوڑی پر ٹھوکر ماری۔ پانڈے ٹھوکر کھا کر سیدھا ہوا تو اس نے ایک بار پھر اسے لاتوں اور گھونسلوں پر رکھ لیا۔

دونوں لڑتے ہوئے ایک گہرے کھڈے کنارے پر آگئے۔ اس وقت تک پانڈے سنبھل چکا تھا۔ اب اس نے بڑی پھرتی سے جھک کر پتلون کے پانچے کے اندر پنڈلی پر بندھا ہوا ایک دودھاری خنجر نکال لیا۔

پہلے پستول اور اب پانڈے کے پاس یہ خنجر دیکھ کر راشد کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ یہ چیزیں اس کے پاس کہاں سے آگئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں وہ خنجر دیکھ کر راشد کی آنکھوں میں بہر حال کسی قدر خوف ابھر آیا تھا۔

”مجھے یقین تھا کہ ہم کے دوران کسی نہ کسی وقت مجھے ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے میں نے اس قسم کا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا۔ یہ پستول اور خنجر میں نے تم لوگوں سے چھپ کر سنوڑے خریدے تھے اور اب یہ خنجر تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔“ پانڈے نے اس کے سامنے مخصوص انداز میں خنجر لہراتے ہوئے کہا۔

خنجر دیکھ کر راشد کسی حد تک خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں پانڈے کے خنجر والے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔ اور پھر پانڈے نے اچانک ہی آگے بڑھ کر راشد پر حملہ کر دیا۔ راشد نے بڑی پھرتی سے ایک طرف جھک کر اپنے آپ کو بچایا۔ پانڈے نے فوراً ہی دوسرا وار کیا۔ اس مرتبہ خنجر کی نوک راشد کے بائیں بازو پر گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی۔ راشد کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔

پانڈے کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس نے ایک اور حملہ کیا۔ اس مرتبہ راشد کے اس کا وار روک لیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی خنجر والی کمانی پکڑ کر مروڑنے لگا۔ دونوں قوت آزمائی کر رہے تھے۔ پانڈے کا بازو بالکل مڑ گیا اور بالآخر خنجر اس کے ہاتھ

سے نکل کر نیچے گر گیا۔ راشد نے گھٹنے سے اس کے پیٹ پر ٹھوکر ماری۔

وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے پر گھونے اور ٹھوکریں برسانے لگے۔ وہ کھڑے بالکل کنارے پر تھے۔ راشد ایک گھونسا کھا کر لڑکھڑایا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر اس کا پیر پھسل گیا۔ کھڑے میں گرتے ہوئے اس نے کنارے کے ایک پتھر کو پکڑ لیا۔

پانڈے اس وقت چند قدم دور تھا۔ راشد اس پتھر کو تھامے اوپر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پانڈے دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کے ہاتھوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے وزنی جوتوں سے راشد کی انگلیاں پکلی گئیں۔ بالآخر پتھر پر سے اس کی گرفت چھوٹ گئی اور وہ کھڑے میں لڑھکتا چلا گیا۔

پانڈے کھڑے کنارے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ راشد تقریباً سو فٹ نیچے جا کر رہا تھا۔ لیکن وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ پانڈے کو یقین تھا کہ راشد ختم ہو گیا تھا۔ اتنی بلندی سے پتھروں پر لڑھکنے کے بعد کسی کا زندہ رہنا مشکل ہی تھا۔

پانڈے نے خنجر کو پتلون کے نیچے پنڈلی پر لپیٹے ہوئے جڑے کے شریپ میں اڑسا۔ پھر پستول تلاش کر کے جیب میں ڈالا اور اپنا ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھا کر اپنا حلیہ درست کرنے لگا۔ اس کے ایک منٹ بعد وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اس طرح آوازیں نکالنے لگا جیسے کوئی کتابیا بھیڑیادور رہا ہو۔ اور پھر اس کے بعد تیزی سے کیپ کی طرف دوڑنے لگا۔

پانڈے جب کیپ میں پہنچا تو اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ چہرے پر بدحواسی نمایاں تھی۔

”کیا ہوا.....؟“ ندیم یہ کہتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔

”وہ..... بھیڑ..... بھیڑیا.....“ پانڈے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ہکا بایا۔ ”بھیڑیا راشد کو لے گیا۔ وہ ایک گہرے کھڑے میں گرا تھا۔“

ندیم اور قابوس رائفلیں اٹھا کر چٹانوں کی طرف دوڑے۔ تھوڑی دیر پہلے بھیڑیے کی آواز انہوں نے بھی سنی تھی۔ پانڈے کیپ ہی میں رہ گیا تھا۔ ندیم اور قابوس بالآخر اس جگہ نیچے گئے جہاں کھڑے راشد پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ندیم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دو سفید بھیڑیے راشد کے آس پاس چکر لگا رہے تھے۔ ندیم اور قابوس نے بیک وقت فائر کئے۔ بھیڑیے ایک طرف کو بھاگ نکلے۔

وہ دونوں کھڑے آ گئے۔ جس جگہ راشد پڑا تھا وہاں تک پہنچنا بڑا مشکل تھا مگر ندیم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گیا۔ راشد ختم ہو چکا تھا۔ اس کی لاش ٹوٹی پھوٹی تھی۔ آس پاس خون بکھرا ہوا تھا۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بھیڑیا راشد کو اوپر سے کھینچ رہا ہو گا کہ نیچے گرنے سے وہ ختم ہو گیا۔

ندیم کچھ دیر تک راشد کی لاش کو دیکھتا رہا۔ پھر دفعۃً اس کی نظر اس پتھر پر پڑ گئی جس پر راشد کا ہاتھ تھا۔ دوسرے ہی لمحہ ندیم چونک گیا۔ راشد نے شاید مرنے سے پہلے اپنے خون سے کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر ندیم کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا لکھنا چاہتا تھا۔

”پانڈے.....!“

راشد یقیناً کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن زندگی نے اسے لفظ پورا کرنے کی مہلت نہیں دی۔ مگر ندیم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ کیا راشد کو پانڈے نے قتل کیا تھا اور بھیڑیے محض اتفاق سے اس طرف آ گئے تھے۔

اس نے جھک کر راشد کی شکستہ لاش اٹھائی اور اس طرف چلنے لگا جہاں قابوس کھڑا تھا۔ ان کا ایک اور ساتھی ان سے بچھڑ گیا تھا۔ مگر ندیم کو یقین تھا کہ راشد کی موت میں بھیڑیوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ وہ انسانی بھیڑیا تھا جس نے راشد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

☆

”مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ بھیڑیے یہاں بھی ہمارے پیچھے آجائیں گے۔“ قابوس نے کہا۔ ”وہ ہمارے تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ خود تم پر اور محسن پر بھی یہ خونی بھیڑیے حملے کر چکے ہیں۔ یہ تم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ زندہ بچ گئے۔ اگر دوسرے بروقت مدد کو نہ پہنچ جاتے تو آج تم دونوں بھی ہم میں نہ ہوتے۔“

وہ دونوں اس وقت کیپ سے ذرا دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے برف کی قبر میں راشد کو دفن کیا تھا اور آج انہوں نے آگے روانگی کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

جب وہ راشد کی لاش لے کر کھڑے واپس آئے تھے تو پانڈے نے انہیں بتایا تھا کہ وہ برویات کے لئے چٹانوں کے پیچھے گیا تھا اور جب واپس آ رہا تھا تو راشد مل گیا۔ وہ

پہلے اس نے اس رات مونیکا والی کوشش کی تفصیل بتائی۔ پھر بولا۔ ”کل رات تم لوگ یہ سمجھے تھے کہ میں شاید راستہ بھٹک گیا تھا اور تم لوگ مجھے تلاش کرتے رہے تھے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ قابوس نے اسے گھورا۔

”نئی رات۔ آخری پہر، میں ایک فطری تقاضے سے اٹھ کر کیبن سے باہر گیا تھا۔ میں کچھ زیادہ دور بھی نہیں گیا تھا۔ جھاڑیوں کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ میں سمجھا کہ خونی بھیڑیے نے حملہ کر دیا ہے۔ مارے خوف کے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ میرے اوپر چھلانگ لگانے والا بھیڑیا نہیں کوئی انسان تھا جس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ہم دونوں میں دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ مجھے حیرت ہے کہ ہماری دھینگا مشتی کی آوازیں کیبن کے سامنے پہرہ دینے والوں تک نہیں پہنچ سکیں۔ حملہ آور نے مجھے ڈھلان پر دھکیل دیا۔ میں لڑھکتا ہوا ایک پتھر سے ٹکرایا۔ میرے سر پر چوٹ لگی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی اور جگہ پر پڑا ہوا تھا۔ ہوش میں آتے ہی مجھے اپنی جیبوں کا خیال آیا۔ میں نے سب کچھ چیک کیا۔ ہر چیز موجود تھی مگر بے ہوشی کے دوران میری جیبوں کی تلاشی لی گئی تھی۔“

”اور وہ کاغذات؟“ قابوس نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”وہ میں نے کسی ایسی جگہ پر چھپا رکھے ہیں کہ کسی کو ان کا پتہ نہیں چل سکتا۔“ ندیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تو کیا تمہارے خیال میں اس رات تم پر حملہ پانڈے نے کیا تھا؟“ قابوس نے کہا۔  
”مجھے شبہ ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”اور راشد کی المناک موت سے میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ راشد نے مرنے سے پہلے اپنے خون سے پانڈے کا نام لکھنے کی کوشش کی تھی۔ جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے پانڈے پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہو۔ پانڈے نے اسے قتل کر دیا ہو۔ عین وقت پر لاش کے قریب بھیڑیوں کی موجودگی محض اتفاق بھی ہو سکتی ہے۔ تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ راشد کی لاش پر ایسے کوئی نشانات نہیں تھے جس سے اندازہ ہو تا کہ بھیڑیے نے اسے نوچا ہو گا۔ نہ تو مجھے اس کے جسم پر ننگے پنچوں کے نشانات نظر آئے تھے اور نہ ہی دانتوں کے۔ حالانکہ پانڈے نے کہا تھا کہ

دونوں ایک جگہ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بھیڑیے نے اچانک ہی ان پر حملہ کر دیا۔ بد قسمتی سے راشد اس کی زد میں آگیا۔ بھیڑیا راشد کو گھسیتا ہوا کھڈ کی طرف لے جا رہا تھا اور پانڈے بھیڑیے کو پتھر مار رہا تھا تاکہ وہ راشد کو چھوڑ دے۔ کھڈ کے کنارے پرینچے کو راشد کھڈ میں اٹک گیا اور اس طرح وہ بھیڑیے کے جبرے کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ پانڈے بھیڑیے کو مسلسل پتھر مار رہا تھا۔ بالآخر وہ خونی بھیڑیا بھی کھڈ میں اتر گیا۔ راشد کی ڈھلان پر لڑھکتا ہوا تقریباً سو فٹ نیچے جا چکا تھا۔ پانڈے کے بیان کے مطابق اس نے کھڈ میں ایک اور بھیڑیے کو بھی دیکھا تھا۔ بھیڑیوں کے خوف سے وہ راشد کی کوئی مدد نہیں کر سکا اور چیختا ہوا کیمنپ کی طرف دوڑنے لگا۔

”اس میں شبہ نہیں کہ خونی بھیڑیے موت کے سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن پانڈے نے جو کہانی سنائی ہے، میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔“ ندیم نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔

”کیوں.....؟“ قابوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ دونوں بھیڑیے راشد کی لاش کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ اس میں شبہ کی کیا بات ہے؟“  
”شبہ کی بات یہ ہے کہ راشد کی موت کسی بھیڑیے کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ راشد کی موت کا ذمہ دار پانڈے ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ قابوس نے اسے گھورا۔

”تم راشد کی لاش کے قریب نہیں گئے تھے۔ لیکن میں جب راشد کی لاش اٹھانے لگا تو ایک پتھر پر خون سے ”پانڈ“ لکھا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ادھورالفظ راشد نے اپنے خون سے لکھا تھا۔ وہ یقیناً پانڈے کا نام لکھنا چاہتا تھا۔“ ندیم نے کہا۔

”لیکن پانڈے راشد کو قتل کیوں کرنے لگا۔ اس کی راشد سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ قابوس بولا۔

”تم شاید ان کاغذات کو بھول رہے ہو جو چند روز پہلے ایک غار میں ہمیں ایک ڈھانچے کے لباس سے ملے تھے۔“ ندیم نے کہا۔

”لیکن وہ کاغذات تو تمہارے پاس ہیں۔“ قابوس بولا۔

”ہاں! ان کاغذات کے حصول کے لئے دو مرتبہ کوشش ہو چکی ہے۔“ ندیم نے کہا۔



بھیڑ یا اسے گردن سے دبوچ کر گھسینا ہوالے گیا تھا جبکہ اس کی گردن پر بھی ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔

”تمہیں پانڈے پر کس قسم کا شبہ ہے؟“ قابوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ انڈین ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”اور تم ہندوہیوں کو جانتے ہو کہ یہ کس قدر عیار اور سازشی ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ سفاری فلائٹ کی گمشدگی کی خبر سن کر اسلام آباد آیا تھا کیونکہ اس کی بہن اور بہنوئی اس طیارے پر سوار تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہماری اس مہم میں شامل ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ وادی گلگت، لیپا اور سیاجن کے علاقوں میں ہماری بعض اہم فوجی تنصیبات بھی ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ وہ ہماری فوجی تنصیبات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اور پھر اسے ان کاغذوں کے بارے میں پتہ چل گیا ہو جو ہمیں ایک ڈھانچے کے لباس سے ملے تھے۔ وہ کاغذات اگرچہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں مگر ان کی اہمیت سے اب بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

”ہوں!“ قابوس نے کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ موزیکا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

”یہ تم لوگوں نے ہمیں کہاں لا کر پھنسا دیا ہے؟ لگتا ہے ہم زندگی بھر ان پہاڑوں سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ اور لگتا ہے کہ بھیڑیوں کی صورت میں موت کے یہ جو فرشتے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ ہمیں ختم کر کے ہی دم لیں گے۔“ موزیکا نے کہا۔

”سفاری طیارے اور اس کے مسافروں کی تلاش سے تو اب ہم مایوس ہو چکے ہیں۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”اب تو ہم اس سرد جہنم سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ خونی بھیڑیے یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔ ہم جس طرف بھی جاتے ہیں وہ خونی بھیڑیے ہمارا راستہ روکے کھڑے نظر آتے ہی اور ہر مرتبہ ہمارا کوئی آدمی ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں ان پہاڑوں سے نکلنا ہے تو سب سے پہلے ہمیں ان خونی بھیڑیوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔“

”لیکن میرا خیال ہے کہ ہم ان پہاڑیوں سے باہر نکلنے کی بجائے ناٹگا پر بت کے چاروں

طرف چکر لگا رہے ہیں۔ اتنے روز ہو چکے ہیں ہم ان برف پوش وادیوں سے باہر نہیں نکل سکتے۔“ موزیکا نے کہا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن آج کا دن تو ہمیں یہیں پر گزارنا ہے۔ کل کوئی نیا راستہ تلاش کر لیں گے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

ان کے دوسرے ساتھی بھی وہیں آگئے تھے۔ وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھے اس موضوع پر بات کرتے رہے کہ انہیں ان برف پوش پہاڑوں سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنا چاہئے ورنہ یہ خونی بھیڑیے ایک ایک کر کے انہیں شکار کر لیں گے یا یہ ویرانہ انہیں نگل جائے گا۔ ان سب کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ انہیں سفر کرتے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے لیکن اس دوران انہیں کوئی چھوٹی سی بستی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی تھی کہ وہ ناٹگا پر بت کے ظلم میں پھنسے ہوئے تھے۔

دو تین مرتبہ انہوں نے کیپ کے قرب و جوار میں بھیڑیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ رائفلیں لے کر ان کی آوازوں کے تعاقب میں بھاگے بھی تھے لیکن وہ بھیڑیے ان کی توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوئے تھے۔ انہیں بڑی آسانی سے چمکے دے کر چٹانوں میں غائب ہو گئے۔

”دوسرے دن ان کا قافلہ پھر چل پڑا۔ اس مرتبہ نقشہ دیکھ کر انہوں نے نئی سمت کا تعین کیا تھا۔ چٹانوں سے نکل کر وہ ایک وادی میں پہنچ گئے جس سے آگے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ چار بجے کے لگ بھگ انہوں نے کیپ لگا دیا۔ کیپ لگائے ہوئے تقریباً ایک ہی فٹ ہو ا تھا کہ گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر وہ چمک گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”وہ..... وہ دیکھو.....“ محسن پہاڑی چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔ سب کی نظریں بیک وقت اوپر اٹھ گئیں۔ پہاڑی چوٹی سے برف کا ایک بہت بڑا تودہ بڑی تیزی سے لڑھکھکا ہوا سیدھا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز اس تودے کے لڑھکنے کی تھی۔ تودہ لڑھکنے کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنا جا رہا تھا۔

”بھاگو..... جلدی.....!“ قابوس چیخا۔

”سب اپنا سامان چھوڑ کر ایک طرف کو بھاگ نکلے۔“ موزیکا اور موزیکا بری طرح چیخ رہی تھیں۔ موزیکا دوڑنے میں تیز تھی مگر موزیکا بار بار لڑھکھکا کر گر رہی تھی جس سے وہ پیچھے رہ گئی

تھی۔ ندیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے دوڑنے لگا۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ اولمپک گیمز کی فائنل ریس میں حصہ لے رہے ہوں۔ ہر کوئی دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا پہاڑ کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی موت نے انہیں اس حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

ان کے خچر پتھروں سے بندھے ہوئے تھے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز نے ان خچروں کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ بری طرح ہنہانے ہوئے رسیاں تڑوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہاڑ سے لڑھکنے والا برف کا بڑا تودہ ٹوٹ کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ تودے کا ایک حصہ سیدھا ان کے کیمپ کی طرف آرہا تھا۔ ندیم وغیرہ دوڑتے ہوئے وہاں سے بہت دور نکل گئے تھے۔ بالآخر وہ رک گئے۔ اور جب مڑ کر دیکھا تو بڑے تودے نے کئی حصوں میں بکھر کر ان کے کیمپ کو تباہ کر دیا تھا۔ ان کی چھوٹی اریاں اور خچر برف کے نیچے دب گئے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک برف کے بادل سے اڑتے رہے۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ یہ لوگ کیمپ کی طرف جانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ تیز ہوا سے بچنے کے لئے ایک چٹان کی آڑ میں دب کر بیٹھ گئے۔ وہ سب دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ کرے وہ خوبی بھیڑیے بھی برف کے نیچے دب کر ختم ہو گئے ہوں۔

☆

فضا میں برف کا غبار پھیلنے سے سردی بڑھ گئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے حسب معمول تمام گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ موٹے موٹے اور کوٹ، گرم ٹوپیاں اور مفلر جوا انہیں سردی سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔

وہ چٹانوں میں ایسی جگہ بیٹھ گئے تھے جہاں ہوا کم سے کم تھی۔ لیکن اس کے باوجود سردی تھی۔ وہ ایک ہی جگہ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے تاکہ ایک دوسرے کی حرارت سے سردی پر قابو پا سکیں۔ ندیم بائیں سرے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ چیکو تھی۔ اس سے آگے موزیکا اور پھر دوسرے تھے۔

پہاڑ پر سے برف کے چھوٹے چھوٹے تودے اب بھی لڑھک رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کیمپ کی طرف جانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ ویسے ایک بات ان میں سے ہر ایک کے ذہن میں تھی کہ کیمپ میں اب انہیں کچھ نہیں ملے گا اور ان کے لئے مزید دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

وہ رات بھر چٹان کی آڑ میں بیٹھے سوتے جاتے رہے۔ ندیم بھی چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ چونک سا گیا۔ چیکو اس کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ چیکو کو اس طرح اپنی گود میں سر رکھے دیکھ کر ندیم کو یہ خیال آیا تھا کہ اگر کسی نے انہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو نجانے کیا سوچے۔ اس نے بڑی آہستگی سے چیکو کو ہٹا چاہا مگر چیکو گہری نیند میں تھی۔ وہ نیند میں بڑبڑاتی ہوئی ندیم سے مزید لپٹ گئی۔ اس نے ندیم کو آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے تمام ساتھی ایک دوسرے پر لدے ہوئے سو رہے تھے۔ ندیم کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کے بالوں پر پہنچ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا لگ رہا

”نہ ہے۔“ ندیم نے کہا۔

چیکو کو بادل ناخواستہ ندیم سے الگ ہونا پڑا۔ ”تمہارے سینے پر سر رکھ کر بڑا سکون مل رہا تھا۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے میں عیب سا شمار تھا اور آنکھوں میں بھی ستاروں جیسی چمک تھی۔

ندیم کی روز سے محسوس کر رہا تھا کہ چیکو اس کی طرف مائل ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہتی۔ پڑاؤ کے دوران وہ کہیں بھی بیٹھتا، چیکو اس کے پاس آ جاتی۔ ندیم کو بھی یہ سب کچھ بڑا اچھا لگا تھا۔

”تم یہاں رکو۔۔۔۔۔ میں دیکھتا ہوں، پانڈے کیمپ کی طرف کیا کرنے گیا ہے۔“ ندیم کہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”جاؤ! مگر اپنا خیال رکھنا۔ وہ انڈین مجھے بہت پر اسرار اور خطرناک لگتا ہے۔“ چیکو کہتی ہوئی موزیکارپلڈ گئی جو گھڑی بنی سو رہی تھی۔

ندیم اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے چلنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پانڈے اس کی نظروں میں آ گیا۔ وہ بڑی تیزی سے کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔ ندیم بھی چھوٹی چھوٹی چٹانوں اور پتھروں کی آڑ لیتا ہوا اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ پانڈے نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا مگر ندیم پتھروں کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے اس کی نظروں میں آنے سے محفوظ ہی رہا تھا۔

پانڈے کیمپ والی جگہ کے سامنے رُک گیا۔ ندیم اس سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر کھڑا کیمپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیمپ کی حالت دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

صرف ایک خچر اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور باقی سب برف کے نیچے دب کر یا تو ختم ہو گئے تھے یا زخمی تھے۔ ان کی چھولدا اریاں بھی برف کے نیچے دبئی ہوئی تھیں۔ لیکن بعض چھولدا اریوں کا کپڑا نظر آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ تمام چھولدا اریاں پوری پوری طرح برف میں نہیں دبائی تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ پہاڑ نے لڑھکنے والا بڑا تودہ تو اس طرف گرا تھا یہاں خچر بندھے ہوئے تھے اور چھولدا اریوں پر کوئی چھوٹا تودہ گرا تھا۔

پانڈے برف میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ بالآخر وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہ ایک چھولدا اری کے قریب رکھا تھا اور وہ چھولدا اری نصف کے لگ بھگ برف میں دبئی ہوئی تھی

تھا۔

رات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لمحات صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ ندیم اب اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے گمشدہ طیارے کی تلاش میں نکلنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انہیں ان برف پوش پہاڑوں میں بھٹکتے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے۔ طیارہ تو انہیں نہیں تھا البتہ وہ خود کھو گئے تھے اور بظاہر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

کسی کی بڑبڑاہٹ کی آواز سن کر ندیم چونک سا گیا۔ اس نے کن آنکھوں سے آواز سمت دیکھا۔ وہ پانڈے تھا جو بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ ندیم اس طرح ساکت ہو گیا جیسے سورہا ہو پانڈے کی بڑبڑاہٹ ختم ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر بڑی آہستگی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں کی طرف دیکھا جو گھڑیاں بنے سو رہے تھے۔ پھر وہ دبے قدموں کیمپ کی طرف چلنے لگا۔

کیمپ وہاں سے تقریباً نصف میل دور تھا۔ یہ رات کا پہلا پہر تھا اور ندیم کو حیرت رہی تھی کہ پانڈے اس وقت کیمپ کی طرف کیا کرنے جا رہا ہے۔ پھر دفعۃً اس کے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ اس سے پہلے پانڈے اس پر حملہ کر کے اس کے لباس کی تلاشی لے چکا تھا اور وہ کاغذات اسے نہیں ملے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت پانڈے کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ کاغذات ندیم کے سامان میں ہوں گے۔ انہوں نے برف کا ایک تودہ کیمپ سے گرتے دیکھا تھا۔ ان کی چھولدا اریاں اور سارا سامان یقیناً برف کے نیچے دب گیا ہو گا لیکن پانڈے شاید اس امید پر کیمپ کی طرف جا رہا تھا کہ اگر برف زیادہ نہ ہو تو وہ ندیم کے سامان میں سے کاغذات تلاش کر سکے گا۔

پانڈے جیسے ہی ایک چٹان کے پیچھے غائب ہوا، ندیم بھی چیکو کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ چاپانی زبان میں بڑبڑاتی ہوئی اس سے مزید لپٹی جا رہی تھی۔

”چیکو۔۔۔۔۔ چیکو۔۔۔۔۔ ندیم نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کیا ہے؟ سونے دو نا۔۔۔۔۔!“ اچھا لگ رہا ہے۔۔۔۔۔“ چیکو نے سرگوشی کی۔ وہ جاگ گئی تھی مگر ندیم سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

”میں نے پانڈے کو چوری چھپے کیمپ کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ یقیناً اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔ میں اس کے پیچھے جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اس طرف کیا کرے۔“

پستول تو کسی نے نہیں خریدا تھا۔ لیکن پانڈے کے پاس پستول دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ہتھیار اس نے خفیہ طور پر خریدا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے عزائم شروع ہی سے خطرناک تھے۔

پانڈے بڑی تیزی سے برف ہٹا رہا تھا اور بالآخر برف کے اندر دبی ہوئی کوئی کالی سی چیز سامنے آئی۔ وہ ہم کامیابی سے پانڈے کے ہاتھ سے پستول کو کھینچنے لگا۔ بالآخر وہ اسے برف سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے پستول کی زپ کھولی اور اس میں بھری ہوئی چیزیں نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔

ٹھیک اسی لمحے فضا میں ایک خوفناک غراہٹ اُبھری۔ پانڈے اُچھل پڑا اور بیک پیٹک کر خوفزدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر برف کے ایک بہت بڑے تودے پر سفید بھینڑیا بچے اترنے کے لئے راستہ تلاش کر رہا تھا۔ لڑکھارے چل رہا تھا جس سے پانڈے کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی بھینڑیا تھا جو دودن پلے ندیم کی گولی سے زخمی ہوا تھا۔

پانڈے جھولداری سے ہٹ کر برف کے چھوٹے چھوٹے تودوں کی آڑ لیتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔ بھینڑیے کو دیکھ کر اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے پاس بڑے پستول موجود تھا لیکن وہ اس پستول کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ فائر کی آواز اس کے دوسرے ساتھی سمجھ جائیں گے کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت اس کا راز کھل جائے گا اور اس وقت یہ پستول ہی اس کی زندگی کی انت ہو گا۔

ندیم نے بھی بھینڑیے کی غراہٹ سن لی تھی اور اسے برف کے تودے پر دیکھ بھی لیا۔ اس کے دل پر بھی خوف سا طاری ہونے لگا اور وہ آہستہ آہستہ چٹانوں میں پیچھے ہٹنے لگا۔ بھینڑیے کا مقابلہ کرنے کے لئے ان میں سے کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ جب وہ برف کے تودے کو لڑھکتے دیکھ کر بھاگے تھے تو سب کچھ کیپ ہی میں رہ گیا تھا۔ اندھلیں بھی کیپ میں تھیں جو برف کے نیچے دب گئی ہوں گی اور ظاہر ہے خالی ہاتھ تو غور بھینڑیے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ندیم پانڈے سے پہلے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سب گھڑیاں بنے سو رہے

جبکہ اس کا نصف حصہ برف میں دبے سے محفوظ رہ گیا تھا۔ سفید برف میں چھولدار کی رنگین کپڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ اس کی اپنی جھولداری تھی۔

پانڈے جھولداری کے کپڑے کا ایک کونا پکڑ کر کھینچنے لگا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے کپڑا چھوڑ دیا اور ہاتھوں سے جھولداری پر سے برف ہٹانے لگا۔ برف نرم تھی اس لئے اسے کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

ندیم چٹان کی آڑ میں کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک اور بڑے پتھر کی آڑ میں چاہا مگر اس کا پیر پھسل گیا۔ دو تین پتھر لڑھک گئے۔ پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سناتے ہوئے دور تک پھیل گئی۔ ندیم بڑی پھرتی سے دوبارہ چٹان کی آڑ میں ہو گیا اور بڑی احتیاط سے جھانک کر پانڈے کی طرف دیکھنے لگا۔

پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سے پانڈے بھی بری طرح چونک گیا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے برف کے ڈھیر کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور سینے کے بل لیٹ کر محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پستول بھی نکال لیا تھا۔

پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر اس کے ذہن میں دو شبہات نے سر اُبھارا تھا۔ پہلا وہ پارٹی کا کوئی آدمی تھا جو اس کا تعاقب کر رہا تھا یا وہ خونی بھینڑیا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لئے خطرہ تھا اور اس نے اس خطرے سے نمٹنے کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لیا تھا۔

وہ تقریباً دو منٹ تک چاروں طرف دیکھتا رہا۔ لیکن کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ نہ بھینڑیا اور نہ ہی کوئی انسان۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ ان برفانی وادیوں میں اور بھی بہت سے جانور تھے۔ لومڑیاں، خرگوش اور بیسیوں قسم کے جانور ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے وہ بھی کوئی جانور ہو جائے۔

پانڈے برف کے ڈھیر کی آڑ سے نکل کر دوبارہ جھولداری کی طرف آ گیا۔ ندیم چٹان کی آڑ میں چھپا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پانڈے کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ چونک گیا۔ وہ نہیں رہ سکا تھا۔ ندیم نے اوستور سے صرف آٹھ ایک رائفلیں خریدی تھیں۔ وہ

رات کی تاریکی رخصت ہونے لگی اور دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ قابوس اور ندیم اپنے ساتھیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے چٹانوں کی آڑ لیتے ہوئے کیمپ کی طرف بڑھنے لگے۔ قابوس کے ہاتھ میں کھلا ہوا شکاری چاقو تھا اور ندیم نے پتھر اٹھا رکھے تھے۔ لیکن راستے میں ایک لمبی سی لکڑی دیکھ کر اس نے پتھر پھینک دیئے اور لکڑی اٹھالی۔ یہ لکڑی ہاکی کے ڈرا بمبی تھی اور آگے سے ہاکی ہی کی طرح مڑی ہوئی تھی اور خاصی مضبوط تھی۔

وہ جیسے جیسے کیمپ کے قریب پہنچ رہے تھے غراہٹوں کی آوازیں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ اور بالآخر وہ اس چٹان کے قریب پہنچ گئے جہاں پہلے بھی ندیم چھپ کر پانڈے کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

اور پھر بات ندیم کی سمجھ میں آگئی کہ بھیڑیے کی غراہٹیں صرف ایک ہی جگہ تک محدود ہو کر کیوں رہ گئی تھیں۔ ندیم جب پانڈے کے تعاقب میں آیا تھا تو اس نے صرف ایک بھیڑیادیکھا تھا۔ لیکن اب دو سفید بھیڑیے تھے۔ جو ایک خچر دبا ہوا تھا اور مرچکا تھا اس کا گوشت نوچتے ہوئے بھیڑیوں کے منہ سے غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

”وہ..... وہ دیکھو! رائفل.....“ قابوس نے ایک طرف برف میں پڑی ہوئی رائفل کی طرف اشارہ کیا۔

رائفل ان بھیڑیوں سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تھی اور جب پہاڑ کی چوٹی سے برف کا تودہ گرا تھا تو جان بچانے کی کوشش میں بھاگتے ہوئے ان کے ساتھیوں ہی میں سے کسی نے یہ رائفل پھینک دی تھی۔

”یہ بہترین موقع ہے۔“ قابوس نے سرگوشی کی۔ ”اگر یہ رائفل کسی طرح ہمارے قبضے میں آجائے تو ان دونوں بدروحوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھکارہ مل سکتا ہے۔“

”لیکن رائفل تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ قابوس بولا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ ندیم نے اسے گھورا۔ اگر ان بھیڑیوں نے تمہاری بو بھی سونگھ لی تو وہ خچر کو چھوڑ کر تمہاری چیر پھاڑ شروع کر دیں گے۔“

”ایک کوشش تو کر دیکھنی چاہئے۔ تم یہیں رکو!“ قابوس نے کہا اور ندیم کے منع کرنے کے باوجود وہ چٹان کی آڑ سے نکل کر سینے کے بل برف پر زینگتا ہوا رائفل کی طرف

تھے۔ ندیم اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ جھپکنا شاید جاگ رہی تھی کیونکہ اس نے فوراً ہی اٹھ کر اپنے ندیم کے سینے پر ٹکا دیا تھا۔

”کیا ہوا؟ پانڈے نے کہا کیا تھا؟“ جھپکنا کی سرگوشی ندیم کی سماعت سے نکل آئی۔

”ہمارا کیمپ برف میں دب گیا ہے۔ لیکن بعض چھو لدریاں پوری طرح برف دہنے سے بچ گئی ہیں۔ پانڈے میری چھو لدری میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے برف کر کسی طرح میرا بیگ نکال لیا تھا۔ اس کے پاس پستول بھی ہے جس کے بارے میں کسی کو بھی علم نہیں ہے۔“ ندیم نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ بہت پر اسرار اور خطرناک قسم کا آدمی ہے۔ اس ہو شیار رہنے کی ضرورت ہے۔“ جھپکنا بولی۔

اسی لمحے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جھپکنا سمجھ کر ندیم سے لپٹ گئی کہ قدموں کی آواز کے ساتھ ہی کتے کے رونے جیسی آواز سنائی دی تھی۔ وہ یقیناً بھیڑیا انہیں تلاش کرتا ہوا ان کے آس پاس پہنچ گیا تھا۔

”بجھ..... بھیڑیا..... وہ پھر آگیا.....“ جھپکنا ہلکائی۔

”یہ وہی بھیڑیا ہے جسے دو دن پہلے میری گولی لگی تھی۔“ ندیم نے بتایا۔ ”میں نے اسے برف کے ایک تودے پر لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس بھیڑیے کو دیکھا پانڈے وہاں سے بھاگا تھا۔ لیکن وہ شاید لمبا چکر کاٹ کر آ رہا ہے۔“

پانڈے بھی پہنچ گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر سب ہی لوگ گئے تھے۔ اور جب انہیں پتہ چلا کہ بھیڑیا ان کے تعاقب میں یہاں بھی پہنچ چکا ہے سب کے چہروں پر خوف کے سائے سے لہرا گئے تھے۔ سب کی نیند غائب ہو گئی خوف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے کسی کے پاس رائفل وغیرہ نہیں تھی۔ وہ لوگ ہو شیار ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے پاس بہت سے پتھر جمع کر لئے تھے

اگر وہ خونی بھیڑیا ان پر حملہ آور ہو تو ان پتھروں ہی کو اس کے خلاف ہتھیار کے استعمال کیا جائے۔ ویسے قابوس نے جیب سے شکاری چاقو بھی نکال لیا تھا۔

وہ لوگ بھیڑیے کے انتظار میں جاگتے رہے اور رات بیتی رہی۔ کیمپ کی طرف غراہٹوں کی آوازیں مسلسل سنائی دیتی رہیں۔ مگر بھیڑیا اس طرف نہیں آیا۔

بڑھنے لگا جو وہاں سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔

قابوس بہت احتیاط سے رہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھانا، شکاری چاقو تھا۔ ندیم ہاکی نما وہ ڈنڈا سنبھالے تیار کھڑا تھا تاکہ اگر کوئی بھیڑیا قابوس پر حملہ آور ہو تو وہ شور مچاتا ہوا بھاگ کر بچاؤ کی کوشش کرے۔ وہ کبھی قابوس کی طرف دیکھتا اور کبھی بھیڑیوں کی طرف جو غراتے ہوئے خنجر کا گوشت نوچنے میں مصروف تھے۔

قابوس رائفل سے صرف پانچ گز کے فاصلے پر رہ گیا۔ اس نے مزید ایک گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بھیڑیے نے اسے دیکھ لیا۔ وہ خنجر کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی تھو تھنی سے خون ٹپک رہا تھا اور منہ سے بہت ہی خوفناک غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ قابوس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے گردن پر چبوتیاں سی رہتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور سنسنی کی ایک لہر سی پورے بدن میں دوڑ گئی۔ موت نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کے اور موت کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا۔

بھیڑیا خوفناک انداز میں غراتا ہوا اس پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہا تھا۔ قابوس نے اٹھ کر رائفل کی طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن بھیڑیا اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ بھی چھلانگ لگا چکا تھا اور اس سے پہلے کہ قابوس رائفل تک پہنچتا بھیڑیا ہوا اڑتا ہوا اس کے اوپر آن رہا۔

وہ دونوں برف پر گرے۔ قابوس نیچے تھا اور بھیڑیا اوپر۔ بھیڑیے کا ایک پنجہ قابوس کے دائیں کندھے پر لگا۔ چمڑے کی جیکٹ اور موٹا اور کوٹ ہونے کی وجہ سے بھیڑیے کے ناخن اگرچہ اس کے جسم تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ لیکن کوٹ اور جیکٹ پھٹ گئی تھی۔ نیچے گرنے کے باوجود قابوس نے بھیڑیے پر چاقو سے وار کر دیا۔ چاقو اس کی گردن کے بائیں طرف کندھے پر لگا۔ اس کے منہ سے خوفناک غراہٹ نکلی۔ اس نے قابوس کو گردن پر دانت گاڑنے چاہے مگر کوٹ کا کالر اس کے منہ میں آگیا۔ اور وہ اسے بری بھنبھونے لگا۔

ندیم پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ چند لمحے مبہوت سا کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا ہاکی نما ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے بھاگ اٹھا۔ اس نے جا بھڑیے کی کمر پر زور دار وار کیا۔ ضرب یقیناً کاری تھی۔ بھیڑیا بلبلاتا اٹھا۔ وہ قابوس

منہ میں دبائے زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

قابوس نے موقع ملتے ہی چاقو سے ایک اور وار کیا۔ اس مرتبہ چاقو بھیڑیے کے دائیں پہلو میں پیوست ہو گیا۔ زخمی ہونے کے بعد بھیڑیے پر بھی جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ اس نے کوٹ کا کالر چھوڑ کر اس کا بازو چبانے کی کوشش کی۔ مگر اس مرتبہ بھی کوٹ ہی اس کے منہ میں آیا تھا۔ جسے وہ بری طرح بھنبھون رہا تھا۔

ندیم نے بھیڑیے پر ڈنڈے سے ایک اور وار کیا۔ پھر دوسرے بھیڑیے کی غراہٹ سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا بھیڑیا بھی ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ندیم ڈنڈا پھینک کر رائفل کی طرف لپکا۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ دوسرا چھلانگیں لگاتا ہوا ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ ندیم نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر کے فائرنگ کی مگر وہ بھیڑیا چھلانگ لگا کر برف کے ایک تودے کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔

قابوس نیچے دبا ہوا ہونے کے باوجود چاقو سے اس بھیڑیے پر پے در پے وار کر رہا تھا۔ بھیڑیے کے زخموں سے بہنے والا خون قابوس کے کوٹ کو تر کر رہا تھا۔ ندیم نے رائفل پھینک دی اور بھیڑیے کو پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر قابوس کے اوپر سے کھینچنے لگا۔ قابوس نے بھی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے بھیڑیے کو اپنے اوپر سے ایک طرف کھینچ دیا اور لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔

کئی زخم کھانے کے باوجود وہ خونی بھیڑیا ٹھننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ندیم نے ایک بار پھر رائفل اٹھالی اور اس کا رخ بھیڑیے کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ رائفل سے نکلنے والی دلیوں نے بھیڑیے کو چھلنی کر دیا۔ اس کے خون سے آس پاس کی برف سرخ ہو رہی تھی۔

ندیم نے ایک بار پھر رائفل پھینک دی اور دوڑ کر قابوس کے پاس پہنچ گیا جو برف پر ہت پڑا لے لے سانس لے رہا تھا۔ اس کا کوٹ خون سے تر ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک ہو.....؟“ ندیم اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

”ہاں! ٹھیک ہوں.....“ سینے پر شاید اس بدروح کا ناخن لگا ہے مگر تکلیف زیادہ نہیں ہے۔“ قابوس نے کہتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ندیم نے سہارا دے کر اسے اٹھا دیا۔ ندیم نے اس کے کوٹ کے بٹن اور جیکٹ کی زپ

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ایک چھو لداری میں سے کھانے پینے کا کچھ سامان نکل آیا تھا۔ دو تین سلپنگ بیگز اور چند کبیل بھی ہاتھ لگ گئے تھے۔

صورت حال بڑی خوفناک تھی۔ خوراک کا جو ذخیرہ بچا تھا وہ دو تین دن سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ اس ذخیرے کے ختم ہونے کے بعد اس سرد جہنم میں کھانے پینے کی کسی چیز کی قیام کرنا بیکار ہی تھا۔ ایک اور رائفل بھی مل گئی تھی۔ اب صرف دو رائفلیں تھیں۔ البتہ ندیم کے میگ میں چار فاضل میگزین بھی موجود تھے۔

سارا سامان اس خنجر پر لا دیا گیا جو زندہ بچا تھا۔ خوراک کے ذخیرے کو دیکھتے ہوئے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اب کھانا صبح اور رات ہی کو کھایا جائے اور وہ بھی کفایت شعاری کے ساتھ۔ لیکن ان کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اب انہیں پیدل ہی چلنا تھا جس کا مطلب تھا کہ خنچروں پر اگر وہ دن میں تیس میل کے لگ بھگ سفر کر لیتے تھے تو اب وہ پیدل پورے دن میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر پائیں گے کیونکہ نشیب و فراز بھی تھے اور راستہ دشوار گزار بھی تھا۔

وہ لوگ فوراً ہی چل پڑے تھے۔ خنجر پر لد ا ہوا سامان زیادہ وزنی نہیں تھا۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ جھیکو اور موزیکا باری باری خنجر پر سواری کریں گی۔ پہلے موزیکا کی باری آئی گی۔ سامان کی وجہ سے بیٹھنے کی جگہ بڑی مشکل سے نکل سکی تھی۔

ایک گھنٹے بعد موزیکا خنجر سے اتر گئی اور اس کی جگہ جھیکو نے لی۔ دو پہر بارہ بجے تک وہ مشکل پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کر پائے تھے۔ وہ مسلسل بلندی کی طرف سفر کر رہے تھے کہ اسے وہ بری طرح تھک گئے تھے۔ پیدل چلنے کی وجہ سے صبح کا کھایا پیا ہضم ہو گیا تھا اور بھوک ستانے لگی تھی۔ محسن اور موزیکا نے دبے لفظوں میں کچھ کھانے کی بات کی تھی۔ ندیم نے بڑی سختی سے اپنے پروگرام پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر کوئی شکار مل جائے تو اس پر دعوت اڑائی جاسکتی تھی۔

موزیکا اور جھیکو پارٹی سے الگ ہو کر چٹانوں کے پیچھے چلی گئیں۔ وہ جب بھی کسی فطری بات کے تحت جاتیں اکٹھی ہی جاتی تھیں۔ بھڑیئے کے خوف سے انہیں ایک رائفل بندے دی گئی تھی۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ دونوں واپس آئیں تو جھیکو کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جیسے کوئی

کھول دی۔ نیچے سویٹر بھی ادھڑ گیا تھا۔ اس نے سویٹر نیچے کھینچ کر دیکھا۔ سینے پر بھڑیئے کے ناخن سے لگنے والا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ معمولی سا خون رس رہا تھا۔

”ایک بدروح سے تو نجات ملی۔“ قابوس نے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ دونوں اٹھ کر بھڑیئے کو دیکھنے لگے جو اب بھی تک آہستہ آہستہ تڑپ رہا تھا۔ اس کا خون آلود سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور نوکیلے دانت بہت ہی خوفناک لگ رہے تھے۔

”تم یہ رائفل سنبھال کر یہیں رکو۔ میں دوسروں کو بلا کر لاتا ہوں۔ سورج نکلنے والا ہے۔ پھر دیکھتے ہیں برف نے ہمارے لئے کچھ جھوڑا ہے یا نہیں۔“ ندیم نے کہا۔ اس نے رائفل قابوس کو تھمائی اور ہاکی نما ڈنڈا اٹھا کر اس طرف چل پڑا جہاں اس کے دوسرے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ سب لوگ بھی پہنچ گئے۔ کیمپ کی حالت دیکھ کر وہ سب ہی حوازا باختہ ہو گئے تھے۔ صرف ایک خنجر زندہ بچا تھا باقی تمام خنجر برف کے تودوں کے نیچے دب کر ہلاک ہو چکے تھے۔ دو تین خنچروں کی ٹانگیں اور سر بھی برف میں سے نظر آرہے تھے۔

کیمپ کی تباہی نے جہاں انہیں بدحواس کر دیا تھا وہاں ایک خوشی کی بات یہ تھی کہ اس میں سے ایک بھڑیا مارا گیا تھا جس کی لاش ان کے سامنے پڑی تھی۔ لیکن تب قابوس۔

یہ انکشاف کیا کہ یہ بھڑیا تھا اور اس کی مادہ بچ نکلی ہے تو کسی کو پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے دلوں میں خوف تو اس وقت طاری ہوا جب قابوس نے انہیں بتایا کہ مادہ اپنے

انتقام لینے کے لئے پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جائے گی اور زندگی کے آخری لمحوں کا ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ممکن ہے مادہ کہیں آس پاس ہی گھات لگا۔

بیٹھی ہو اور موقع پاتے ہی ان پر حملہ کر دے اس لئے انہیں جلد سے جلد اس علاقے

نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ برف میں دبی ہوئی چھو لداریوں میں اپنا سامان تلاش کرنے لگے۔ صرف

چھو لداریاں ایسی تھیں جن پر سے برف ہٹائی جاسکتی تھی۔ جبکہ باقی چھو لداریاں مکمل طور پر برف کے بڑے تودوں کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور ان پر سے برف ہٹانا ممکن نہیں تھا۔

وہ ان تین چھو لداریوں میں سے برف کے نیچے دبا ہوا جتنا سامان نکال سکتے تھے

ملق میں آگیا۔ تقریباً پچاس فٹ گہرائی میں پانی بہہ رہا تھا۔  
کھڈ پر رکھی ہوئی سلیب ڈیڑھ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اس پر سے گزرنا اگرچہ  
ہل صراط سے گزرنے کے مترادف تھا۔ لیکن ندیم کو یقین تھا کہ اس کے دوسری طرف  
انہیں اس دیرانے سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور مل جائے گا۔

ندیم کھڈ کے کنارے پتھر کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس پتھر  
کو یہاں پڑے ہوئے نجانے کتنی صدیاں بیت گئی تھیں۔ اس دوران بارش، دھوپ، ہوا اور  
برف سے یہ پتھر خستہ تو نہیں ہو گیا۔ لیکن جب اس نے پتھر کو تھپتھا کر دیکھا تو اندازہ ہوا  
کہ وہ ٹھوس اور خاصا مضبوط تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ پتھر کے  
دامیں اور بائیں کناروں پر نقش و نگار کندہ تھے۔

ندیم نے قابوس کو بھی پتھر پر ان نقش و نگار کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی بڑی احتیاط  
سے کنارے پر جھک کر ان خوبصورت نقش و نگار کا معائنہ کرنے لگا۔ لیکن جھیکو آگے آنے  
کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ اس کے برعکس وہ چند قدم دور کھڑی بڑی عقیدت سے ایک  
چٹان پر بدھ کا مجسمہ دیکھ رہی تھی۔

قابوس اور ندیم بھی کھڈ کے کنارے سے اٹھ کر جھیکو کے قریب آگئے۔ قابوس کا بھی  
یہی خیال تھا کہ اس کھڈ کے دوسری طرف چٹانوں میں کوئی قدیم بدھ خانقاہ ہے۔ وہاں  
سے انہیں ضرور کوئی راستہ مل جائے گا۔

”تو پھر میرا خیال ہے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی یہیں لے آیا جائے اور پھر  
کوئی پروگرام بناتے ہیں۔“ ندیم نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ چلو! انہیں بھی یہ خوشخبری سنا دیں کہ ہم اس سرد جہنم سے نکلنے والے  
ہیں۔“ قابوس بولا۔

وہ اس تنگ سی دراڑ سے نکل کر دوبارہ کھلی جگہ پر آگئے۔ دراڑ بہت تنگ تھی۔ دو آدمی  
پہلو بہ پہلو مشکل ہی سے چل سکتے تھے۔ اس لئے وہ آگے پیچھے ایک قطار کی صورت میں  
اس دراڑ میں سے گزر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو بھی دراڑ کے پاس لے آئے۔ اب ان کے  
سامنے ایک نیا مسئلہ تھا۔ دراڑ اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے خچر نہیں گزر سکتا تھا اور مزید

بہت ہی خاص بات ہو گئی ہو۔

”کیا بات ہے؟ اس طرف کوئی خاص چیز دیکھ لی کیا؟“ ندیم نے پوچھا۔

”ہاں! بہت ہی خاص!“ جھیکو نے جواب دیا۔ ”اس طرف ایک چٹان پر بدھ کا روگنگ“

ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ندیم چونک گیا۔ اور پھر وہ جھیکو کے ساتھ چل پڑا۔ قابوس بھی ان کے

ساتھ ہو گیا تھا۔

تقریباً سو گز آگے ایک نہیں کئی چٹانوں پر بدھ کا روگنگ بنی ہوئی تھیں۔ انہیں حیرت

ہوئی تھی کہ بدھ کے پیروکار یہاں تک کیسے پہنچے ہوں گے۔ لیکن اس میں حیرت کی بات

نہیں تھی۔ راولپنڈی سے چند میل آگے ٹیکسلا صدیوں پہلے بدھ تہذیب کا مرکز رہا تو

سوات، کوہستان، ہنزہ اور گلگت میں بھی جگہ جگہ قدیم بدھ تہذیب کے آثار اب

موجود تھے۔ گلگت میں کئی مقامات پر تو وہ خود بھی چٹانوں پر بدھ کا روگنگ دیکھ چکے تھے۔

وہ چٹانوں پر ان بدھ کا روگنگ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ چٹانوں میں گھوم

ہوئے اپنے دوسرے ساتھیوں سے تقریباً ایک میل دور نکل چکے تھے۔ انہیں یقین تھا

ان پہاڑوں میں کہیں نہ کہیں کوئی قدیم بدھ خانقاہ ضرور موجود ہوگی یا کوئی ایسا غار ہو

جہاں بدھ بھکشو دنیا تہج کر عبادت میں مشغول رہتے ہوں۔ ان پہاڑوں میں کسی خانقاہ یا

ایسے غار کی موجودگی کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ انہیں کسی آبادی تک جانے کا راستہ

مل سکتا تھا۔

وہ اس وقت چٹانوں کے درمیان ایک بہت تنگ سی دراڑ میں چل رہے تھے۔ دراڑ

چٹانوں پر بھی جگہ جگہ کا روگنگ تھی۔ اور پھر دراڑ ایک کشادہ سی جگہ پر ختم ہو گئی۔ تو

دس فٹ چوڑے اس چوڑے سے آگے تقریباً دس فٹ چوڑا گہرا کھڈ تھا اور دو

طرف بھی چٹان پر گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ نظر آرہا تھا۔ دس فٹ چوڑے اس

عبور کرنے کے لئے تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑے پتھر کا ایک سلیب رکھا ہوا تھا۔ یہ سلیب

صدیوں پہلے کسی چٹانی پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس سلیب کے علاوہ کھڈ پار کرنے کا

راستہ نہیں تھا۔

ندیم نے کھڈ کے کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچ



تھے اور اس نے آگے جھک کر پتھر کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ندیم اس کے پیچھے اس پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ پتھر پر جمادیا اور دوسرے ہاتھ سے جھیکو کی جیکٹ پکڑ لی۔  
 ”اب آہستہ آہستہ آگے سرکتی رہو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں سہارا دے رکھا ہے۔“ ندیم نے کہا۔

جھیکو جیونی کی رفتار سے آہستہ آہستہ آگے سرکنے لگی۔ اس کی نظریں سامنے لگی ہوئی تھیں جہاں قابوس کھڑا تھا۔ وہ جھیکو کی حوصلہ افزائی کے لئے اسے آگے بڑھتے رہنے کے اشارے کر رہا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ میں انہوں نے تین فٹ کا فاصلہ طے کیا۔ اس لمحے ندیم کو ایک اور خطرے کا احساس ہوا۔ یہاں ہوا تیز تھی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہوا تیز ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ہوا انہیں ایک طرف دھکیل رہی ہو۔

”جھیکو.....! آرام سے آگے بڑھتی رہو اور اپنا توازن برقرار رکھو۔“ ندیم بولا۔  
 جھیکو پھر آگے ریگننے لگی۔ ایک مرتبہ اس نے نیچے دیکھ لیا۔ تقریباً پچاس فٹ گہرائی میں پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ جھیکو کو چکر سا آگیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور رُک گئی۔ وہ ہوا کے زور پر ایک طرف جھک رہی تھی۔ ندیم نے دوسری طرف سے اس کی جیکٹ کو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ ندیم نے پوچھا۔  
 ”نیچے مت دیکھو..... سامنے قابوس کی طرف دیکھ کر آگے سرکتی رہو۔“ ندیم نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

تقریباً ایک منٹ بعد جھیکو ایک بار پھر آگے ریگننے لگی۔ اس مرتبہ اس نے نیچے دیکھنے کی طاقت نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل آگے ریگتی رہی۔ تقریباً دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو قابوس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ دوسری طرف آتے ہی جھیکو چوتھے پربت گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اسے واقعی یوں لگا تھا جیسے وہ پہل صراط عبور کر کے آئی ہو۔

ان کے بعد موزیکا اور پانڈے اسی طرح پتھر عبور کر کے آگئے۔ اب محسن رہ گیا تھا۔ وہ بھی پتھروں پر دونوں طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ تقریباً آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا کہ ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا۔ ہوا کے زور

براں اس ڈیڑھ فٹ چوڑے پتھر پر سے بھی خچر کو لے جانا ممکن نہیں تھا۔ لہذا فیصلہ یہ کر گیا کہ خچر کو آزاد کر دیا جائے اور اس پر لد اہو اسامان بانٹ کر اٹھالیا جائے۔ سامان زیادہ نہیں تھا۔ جھیکو اور موزیکا کو ایک ایک بیگ دے دیا گیا باقی سامان جس میں ایک چھو لہاری مہربند خوراک اور کبل وغیرہ شامل تھے مردوں نے آپس میں تقسیم کر لئے تھے۔

خچر کو ڈھلان کی طرف ہانک دیا گیا اور وہ لوگ قطار بنا کر اس تنگ سی دراڑ میں داخل ہو گئے۔ دراڑ کے اختتام پر چوتراہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ وہ چٹان کے ساتھ لٹے کھڑے رہے۔ اس ڈیڑھ فٹ چوڑے پتھر کو دیکھ کر سب کی روح فنا ہو گئی تھی۔ کوئی بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر قابوس نے پہل کر دی۔

وہ چوتراہ پر بیٹھ کر گھٹٹا ہوا پتھر کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس نے دونوں ٹانگیں پتھر کے دونوں طرف لٹکالی تھیں اور قدرے آگے جھک کر دونوں ہاتھ پتھر پر جمادیے تھے۔ یہ بالکل ویسے ہی تھا جیسے کسی پارک میں بچوں کے کھیلنے کے لئے تختہ بنا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ تختہ بچوں کے وزن سے دونوں طرف سے اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے اور اس پتھر کے دونوں کنارے چٹان میں گڑے ہوئے تھے۔

تقریباً دس فٹ کا یہ فاصلہ قابوس نے پانچ منٹ میں طے کیا۔ دوسری طرف کے چوتراہ پر پہنچ کر اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلادیا۔

”میں اس پتھر پر چڑھ رہا ہوں اور جھیکو! تم بھی میرے پیچھے ہی دونوں طرف پیر لٹا کر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ ساتھ آگے کھسکتی رہنا۔ بس اپنا بیلنس قائم رکھنا۔ ندیم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ جھیکو کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔  
 ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اپنا توازن برقرار رکھو گی تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ قابوس تمہارے سامنے یہ راستہ عبور کر چکا ہے۔ یا پھر یوں کرو تم آگے رہو اور میں تمہارے پیچھے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تمہیں سنبھال لوں گا..... چلو..... میں سہارا دے رہا ہوں۔“ ندیم نے کہتے ہوئے جھیکو کا بازو پکڑ لیا۔

چوتراہ کے کنارے پر پہنچ کر ندیم نے دونوں پیر چٹان پر جمادیے اور جھیکو کو سہارا دے کر پتھر پر اس طرح بٹھادیا کہ اس کے دونوں پیر اس کے دونوں اطراف لٹکے ہوئے

سے محسن ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور پتھر سے گر گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر کو دونوں ہاتھوں گرفت میں لے لیا تھا۔

چیکو اور موزیکا کی چیخیں نکل گئیں۔ قابوس اور ندیم پتھر کی طرف دوڑے اور اپنی زندگیوں کی پرواہ کئے بغیر پتھر پر بڑی تیزی سے رینگتے ہوئے محسن کے قریب پہنچے۔ ندیم، محسن سے آگے نکل گیا اور قابوس اس سے پہلے رک گیا۔ ان دونوں نے ایک ایک ہاتھ سے پتھر کا کنارے تھام لیا اور ایک ایک ہاتھ سے محسن کا ایک بازو پکڑ لیا۔ محسن پتھر کے نیچے لٹکا ہوا تھا اور پچاس فٹ نیچے خاموش بہتے ہوئے پانی کی صورت میں موت اس کی منتظر تھی۔

”دوسرا ہاتھ چھوڑ دو اور نہیں۔“ ندیم نے کہا۔

محسن نے دوسرا ہاتھ پتھر سے ہٹا لیا۔ اس کا ایک بازو قابوس اور ندیم کی گرفت میں تھا۔ وہ ان دونوں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ اسے اوپر کھینچنے لگے۔ وہ انہیں ایک طرف دھکیل رہی تھی۔ مگر انہوں نے پتھر پر اپنے ہاتھ جمائے رکھے۔ محسن نے بھی دوسرا ہاتھ پتھر پر جمالیا تھا۔ اس طرح اسے اپنے جسم کو اوپر اٹھانے میں آسانی ہو گئی۔ اور بالآخر ان دونوں نے اسے پتھر پر کھینچ لیا۔

محسن پتھر کے دونوں طرف پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے جیسے مجھد ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ قابوس اور ندیم نے اب بھی اسے سہارا دے رکھا تھا۔

وہ تقریباً تین منٹ تک پتھر پر بیٹھے رہے اور بالآخر آہستہ آہستہ کنارے کی طرف سرکنے لگے۔ دوسری طرف چبوترے پر پہنچتے ہی محسن گر سا گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس مہم کے دوران وہ نہایت دشوار مرحلوں سے گزرے تھے لیکن یہ مرحلہ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہ تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ پھر چبوترے سے آگے دو چٹانوں کے درمیان ایک کشادہ راستے پر چلنے لگے۔ ان چٹانوں پر بھی جگہ جگہ گوتم بدھ کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، یہ درہ نما راستہ بتدریج تنگ ہو تا جا رہا تھا۔ اور بالآخر

ایک تنگ سی دراڑ کی صورت اختیار کر گیا اور انہیں ایک بار پھر قطار میں چلنا پڑا۔ چٹانوں میں جگہ جگہ گوتم بدھ کے پتھروں پر کھدے ہوئے مجسمے ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔

یہ دراڑ تقریباً نصف میل طویل ثابت ہوئی۔ اس کے اختتام پر تقریباً تین فٹ چوڑا کنواں تھا۔ لگتا تھا جیسے اس جگہ سے پہاڑ شق ہو گیا ہو۔ کنواں غالباً زمین کی تہہ تک چلا گیا تھا۔ انہوں نے نیچے بھاٹک کر دیکھا۔ مگر تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ تین سو فٹ چوڑا کنواں عبور کرنا ان کے لئے مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اس کنواں کے دوسری طرف ایک بار پھر درہ نما کشادہ راستہ تھا۔ یہ راستہ تقریباً بارہ فٹ چوڑا تھا اور انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گلی میں چل رہے ہوں۔

یہ چٹانی گلی آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ آگے والے دونوں راستے تریچھے تھے اور اس طرح انگریزی کا حرف ”وائی“ بن گیا تھا۔

☆

کھائی کے دوسری طرف چند قدم کے فاصلے پر ایک غار کا دہانہ نظر آرہا تھا۔ غار کے دہانے کے دائیں بائیں مہاتما بدھ کے تراشیدہ مجسمے نظر آرہے تھے۔

قابوس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس غار کے اندر بدھ کے پیر و نگاروں کی وہ خانقاہ ہوگی جس کی تلاش میں وہ یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ قابوس اس پل پر چلتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا اور غار میں جھانکنے لگا۔ اندر گہری تاریکی تھی اور اس کے پاس ٹارچ نہیں تھی۔ اس لئے وہ غار میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکا۔ وہ غار کے دہانے کے دائیں طرف والے مجسمے کو دیکھنے لگا۔ یہ مجسمہ چٹان کو کاٹ کر اس طرح بنایا گیا تھا کہ چٹان سے بالکل باہر کو نکلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ مجسمہ بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ دوسری طرف چٹان پر شبیہ دیکھ چکے تھے۔ مجسمے سے نیچے کوئی سہارا وغیرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے مہاتما بدھ آلتی پالتی مارے ہو ایں معلق ہوں..... قابوس کچھ دیر حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس مجسمے کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مجسمہ اپنی جگہ سے ہل رہا تھا۔ پہلے تو وہ ڈرا کہ مجسمہ چٹان پر اٹکا ہوا ہے کہیں گرنے جائے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ مجسمہ پچھلے طرف سے کسی چیز سے چٹان کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ قابوس اس مجسمے کو ہلانے لگا۔ بدھ کا مجسمہ آہستہ آہستہ دائیں طرف گھومنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی گڑگڑاہٹ کی ہلکی سی آواز سن کر قابوس چونک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کھائی پر چٹانی پل دوسری طرف سے ایک تختے کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا۔

قابوس مجسمے کو دوبارہ بائیں طرف گھمانے لگا۔ چٹانی پل آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ اس نے مجسمے کو پوری طرح گھما کر سیدھا کر دیا۔ پل اپنی جگہ پر فٹ ہو گیا۔ قابوس کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گہری کھائی کا وہ چٹانی پل قدرتی نہیں تھا اور یہ مجسمہ دراصل اس پل کو اٹھانے اور گرانے کا میکزم تھا۔

قابوس اس مجسمے سے ہٹ کر غار کے دہانے کے دوسری طرف والے مجسمے کے قریب آگیا اور اسے بھی گھمانے لگا۔ ساتھ ہی وہ چٹانی پل کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ گڑگڑاہٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ لیکن چٹانی پل اپنی جگہ سے نہیں ہٹا تھا۔ وہ غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ آواز غار کے دہانے کے اندر سے آرہی تھی۔ اور پھر اسے یہ دیکھ کر

وہ لوگ تینوں راستوں کے سنگم پر کھڑے تھے لیکن اب ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ دائیں طرف کا راستہ اختیار کریں یا بائیں طرف جائیں۔ بالآخر انہوں نے دائیں طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ راستہ اڑھاتر چھاتھار بتدریج تنگ ہوتا چلا گیا۔ وہ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور اس دو فرلانگ میں کئی موڑ آئے تھے اور آخری موڑ کے بعد راستہ بند ہو گیا۔ سامنے ایک عمودی چٹان تھی اور اس چٹان پر مہاتما بدھ کی بہت بڑی شبیہ کندہ تھی۔ مہاتما بدھ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کی پسلیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ یہ عجائبی کتنی صدیاں پہلے بنائی گئی تھی؟ جس شخص نے بھی یہ کندہ کاری کی تھی وہ بلاشبہ اپنے فن کا ماہر تھا۔ وہ کتنی دیر تک حیرت سے اس خوبصورت کام کو دیکھتے رہے۔ جھکی کی نگاہوں میں تو بڑی عقیدت تھی۔

وہ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہے اور پھر واپس آگئے۔ راستوں کے سنگم پر پہنچ کر وہ بیٹھ گئے۔ وہ لوگ بری طرح تھک گئے تھے اور کچھ دیر سست لینا چاہتے تھے۔

”میں ذرا آگے سے ہو آؤں!“ قابوس کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دیکھو کہیں راستہ بھی تو آگے جا کر بند نہیں ہو جاتا؟“

اس نے اپنا سامان نیچے رکھ دیا اور رائفل سنبھال کر بائیں طرف والے راستے پر چل پڑا۔ یہاں بھی چٹانوں پر مہاتما بدھ کی شبیہیں اس کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ یہ راستہ بھی اڑھاتر چھاتھار بل کھاتا ہوا تھا لیکن اس کی کشادگی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس راستے پر بھی تقریباً نصف میل چلنے کے بعد قابوس رُک گیا۔ یہاں بھی پہلے کی طرح سینکڑوں فٹ گہری کھائی تھی جس کی چوڑائی میں فٹ سے کم کسی طرح نہیں ہوگی۔ لیکن اس کھائی کا ایک بہت بڑی ہموار چٹان بھی موجود تھی۔ پل نما یہ چٹان تقریباً دس فٹ چوڑی تھی۔ اس

کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔

یہ وسیع و عریض غار انسانی ہاتھوں کا کارنامہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ پہاڑ کا کھوکھلا سینہ نہ کچھ دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ پھر آگے بڑھنے لگے۔ اس غار کو بہت بڑا ہال بنا سکتا تھا جس میں راہداروں کی طرح اور بھی بہت سی سرنگیں تھیں۔ وہ ہال کے وسط میں سیدھے پلے رہے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے روشنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور بالآخر وہ اندرے میں آگئے۔ ندیم نے اپنے بیگ سے نارچ نکال کر روشن کر لی۔ ان کے سامنے ایک بہت بڑا چوترہ تھا اور اس چوترے پر مہاتما بدھ کا قد آدم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ نارچ کی روشنی میں مجسمہ کا جائزہ لیتے رہے۔ چوترہ بہت اونچا تھا اور مجسمے کا صرف اوپر کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ بلاشبہ بدھ کا ایک نادر ترین مجسمہ تھا۔ چوترے پر چڑھنے کے لئے دو بڑے پتھر نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ چیکو دوڑتی ہوئی پتھروں سے ہوتی ہوئی چوترے پر چڑھ گئی اور الہانہ انداز میں بدھ کے مجسمے کی طرف دوڑی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ رک گئی۔۔۔۔۔

گوتم بدھ کے مجسمے کی گود میں ایک انسانی ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر چیکو کے ہرے خوفناک چیخ نکل گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ تیار کر چوترے پر گر گئی۔

محسن اور قابوس دوڑ کر چوترے پر چڑھ گئے۔ مجسمے کی گود میں ایک انسانی ڈھانچے کو دیکھ کر ایک لمحے کو وہ بھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ چیکو کو اٹھا کر چوترے سے نیچے لے آئے اور زمین پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ چیکو بڑی مشکل سے ہوش میں آئی تھی۔

اس وسیع و عریض غار میں گوتم بدھ کے اس عظیم الشان مجسمے کو دیکھ کر ان سب کو بڑی نرت ہوئی تھی۔ یہ مجسمہ چٹان نما کسی بہت بڑے پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا تھا اور اسے انسانی انگوٹھوں کی صنایع کا بہترین شاہکار قرار دیا جاسکتا تھا۔ ندیم کا خیال تھا کہ ممکن ہے یہی غار اندہ قدم میں بدھ کے پیروکاروں کی عبادت گاہ رہا ہو۔ لیکن یہاں چوترے پر بدھ کے مجسمے اور اس کی گود میں انسانی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

غار میں جا بجا کلموں کے جالے لٹکے ہوئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ غار میں کوئی چراگڑ نہیں تھی۔ حالانکہ ایسی ویران جگہوں پر عام طور پر چمکاڑ ضرور ہوتی ہیں۔

”میرا خیال ہے ان سرگوں ہی میں کہیں باہر نکلنے کا راستہ ہو گا۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ

حیرت ہوئی کہ غار کے دہانے سے تقریباً بیس فٹ اندر ایک چٹان شق ہو رہی تھی۔ چٹان پر ایک حصہ سلائیڈنگ ڈور کی طرح دائیں طرف سرک رہا تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ اس طرح خلا پیدا ہونے سے دوسری طرف بہت ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی۔ قابوس نے بدھ کے مجسمے کو واپس گھمادیا۔ غار کے اندر چٹان کے دونوں حصے دوبارہ آپس میں مل گئے۔ اب قابوس سمجھ گیا کہ خانقاہ اسی غار کے اندر واقع تھی۔ تاریخ کے مطالعہ سے وہ یہ تو جانتا تھا کہ مہاتما بدھ کی طرح اس کے پیروکار بھی دنیا کو تنج کرویرانوں میں جا کر عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ بدھ کے پیروکاروں کی بیشتر عبادت گاہیں اب تک ویرانوں ہی میں پائی گئی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ صدیوں پہلے بدھ کے پیروکاروں کا کوئی گروہ اس طرف آ نکلا ہو اور انہوں نے یہاں کوئی عبادت گاہ بنائی ہو۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس غار کے اندر واقع خانقاہ کے دوسری طرف کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہو گا جو انہیں کسی ہستی تک لے جائے گا۔

وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کے تمام ساتھی اسی جگہ موجود تھے۔ چیکو اور محسن تو چٹان سے ٹیک لگائے اوکھ رہے تھے۔ قابوس، ندیم کے پاس بیٹھ گیا اور اسے اپنی اس دریافت کے بارے میں بتانے لگا، ندیم کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چل دینا چاہئے۔“ ندیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

چیکو اور محسن کو بھی جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ اور دس منٹ بعد وہ روانہ ہو گئے۔ غار کے دہانے تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ چٹانی پل عبور کرنے کے بعد قابوس نے غار کے دہانے کے دائیں طرف والے مجسمے کو گھما کر چٹانی پل کو اٹھا اور گرا کر دکھایا۔ پھر دہانے کے دوسری طرف پہنچ کر بدھ کا مجسمہ گھمانے لگا۔

غار کے اندر چٹان شق ہوتی چلی گئی۔ اس طرح ایک کشادہ راستہ بن گیا۔ وہ لوگ اندر آ گئے۔ اندر آتے ہی انہیں یوں لگا تھا جیسے وہ عجائبات کی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ غار بہت وسیع و عریض تھا۔ چھت گنبد کی طرح گول اور بہت اونچی تھی۔ اوپر بہت بڑا سورن تھا جس سے روشنی اندر آرہی تھی۔ یہ غار قدرتی تھا اور پہاڑ کے سینے میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چھت کے سورن سے آنے والی روشنی اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن اس جگہ انہیں نارچ

باری باری تمام سرنگوں کو چیک کیا جائے۔“ ندیم نے کہا۔

وہ دو دو کی ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک ٹولی میں ندیم، جیکو، دوسری میں محسن، تھر اور تیسری پارٹی میں پانڈے اور مونیکا شامل تھی۔ طے یہ ہوا کہ وہ الگ الگ ان سرنگوں کا جائزہ لیں اور اگر کسی سرنگ میں باہر نکلنے کا راستہ مل جائے تو وہ دوبارہ غار میں دوسروں کو متوجہ کرنے کے لئے پکارے گا۔

وہ لوگ دو تین گھنٹوں تک مختلف سرنگوں میں بھٹکتے رہے۔ بعض سرنگیں تو ایسی تھیں تھوڑی ہی دور جا کر بند ہو گئی تھیں اور بعض اندر ہی اندر چکر کھاتی ہوئی دوبارہ اس بڑے ہال میں نکل آتی تھیں۔ اس طرح وہ ایک بار پھر بڑے ہال میں جمع ہو گئے تھے۔

”میرا خیال ہے اس غار سے کسی اور طرف نکلنے کا راستہ نہیں ہے۔ کیوں نہ والیں؟“ پانڈے نے پیش کی تھی۔

”واپسی کا راستہ اگرچہ بہت خطرناک ہے۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ندیم نے کہا۔

یہ خوفناک انکشاف انہیں دہلا دینے کے لئے کافی تھا کہ وہ واپسی کا راستہ بھول تھے۔ اس غار کے اطراف میں اتنی سرنگیں تھیں کہ انہیں اب یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ غار اندر کس طرف سے آئے تھے.....

”مجھے یقین ہے کہ غار کے دہانے کا راستہ کھولنے کے لئے اندر بھی کوئی نہ کوئی میگز ضرور ہو گا۔ ہمیں وہ میگزیم تلاش کرنا چاہئے۔ چٹان میں کسی جگہ پر نصب بدھ کا کوئی مج یا کوئی اور چیز.....!“ محسن نے کہا۔

وہ ایک بار پھر میگزیم کی تلاش میں غار کی چٹان کو ٹٹولنے لگے..... لیکن دو تین گھنٹوں کے بعد بھی انہیں مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کسی چٹان میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تھی جسے میگزیم سمجھا جاتا۔ تھک ہار کر وہ غار میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔

غار میں روشنی اب کم ہو رہی تھی۔ پہلے جب سورج اوپر تھا تو غار کی چھت کے سوراخوں سے روشنی اندر تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن اب شاید سورج ڈھل رہا تھا جس سے روشنی کم گئی تھی۔ وہ سب کچھ عجیب سا محسوس کر رہے تھے جیسے پاتال میں پہنچ گئے ہو، اور دور...

بہت دور وہ روشن سوراخ نظر آ رہا تھا۔

وہ سب بری طرح تھک گئے۔ بھوک نے بھی انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ قابوس نے خوراک کے ذخیرے میں سے ان سب کو صرف اتنا کھانا دیا جس سے کچھ سہارا ہو سکے۔ اچانک کتے کے رونے کی آواز سن کر وہ سب چونک گئے اور وہ چاروں طرف دیکھنے لگے۔ کتے کے رونے کی یہ آواز غار میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن جب دوبارہ یہ آواز سنائی دی تو وہ سب اوپر دیکھنے لگے۔

”یہ کم بخت یہاں بھی پہنچ گیا.....!“ پانڈے نے کہا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔

گنبد نما غار کے چھت پر واقع سوراخ کے عین کنارے پر وہ سفید بھیڑیا کھڑا تھا جو اس سوراخ کے پس منظر کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تھوٹھنی آسمان کی طرف اٹھائے اس طرح کی آوازیں نکال رہا تھا جیسے رورہا ہو۔ پھر وہ گردن جھکا کر غار کے اندر جھانکنے لگا۔ اب اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

قابوس نے رائفل اٹھالی اور بھیڑیے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ لیکن عین اس وقت جب اس نے ٹرائیگر دبایا تھا بھیڑیا پیچھے ہٹ گیا۔ ویسے بھی گولی سوراخ کے قریب چھت کے کنارے پر لگی تھی اور چھوٹے چھوٹے پتھر ٹوٹ کر نیچے گرے تھے۔ غار گولی کی آواز سے گونج اٹھا اور بازگشت دیر تک غار میں سنائی دیتی رہی۔

اس کے بعد بھیڑیا نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن وقتاً فوقتاً اس کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ چٹان کے اس سوراخ کے آس پاس ہی ٹہل رہا تھا اور غالباً ان کے باہر آنے کا منتظر تھا.....

غار میں اب اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اب ان کے پاس کاربائیڈ لیمپ نہیں تھا جسے روشن کر لیا جاتا۔ صرف تین چار ٹارچیں تھیں۔ دو بڑی ٹارچیں تباہ شدہ کیمپ کے سامان میں سے نکالی گئی تھیں اور ایک پینل ٹارچ پانڈے کے پاس تھی۔ لیکن ان ٹارچوں کے فاضل سیل نہیں تھے۔ اس لئے وہ نہایت ضرورت کے وقت ہی انہیں استعمال کرنا چاہتے تھے۔

وہ اندھیرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تاریک غار میں ان کی ہلکی سی آواز بھی گونج پیدا کر رہی تھی اور بعض اوقات وہ اپنی ہی آواز سے ڈر جاتے تھے۔

جن کے قدم یہاں تک پہنچے تھے۔

ندیم اڑدھے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں بھی ایک چارنٹ چوڑی کھائی حائل تھی۔ لیکن بہر حال ان دونوں نے چھلانگ لگا کر یہ کھائی عبور کر لی اور اڑدھے کے قریب سے ہوتے ہوئے سامنے والے غار میں داخل ہو گئے۔ یہ دراصل ایک تنگ سی سرنگ تھی جو تقریباً بجاس گز تک چوخم کھاتی ہوئی ایک کشادہ جگہ پر ختم ہو گئی تھی۔

اس غار کے آخر میں ایک اونچا چوترہ تھا جسے بہت بڑے پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ چوترے پر چڑھنے کے لئے اس کے قریب تراشے ہوئے پتھر بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ پتھر کافی کشادہ تھے۔ ندیم اور موزیکا بیک وقت ان پتھروں کے ذریعے چوترے پر پہنچ گئے۔ یہ دراصل چوترہ نہیں تھا۔ ایک بہت بڑا حوض تھا یا یوں کہنا چاہئے کہ اس بڑے پتھر کو اندر سے بھی کاٹا گیا تھا۔ ندیم اور موزیکا اس حوض کے تقریباً ایک فٹ چوے کنارے پر کھڑے تھے۔ ندیم کے ہاتھ میں موجود نارچ کی روشنی آہستہ آہستہ ریگ رہی تھی۔ اور پھر نارچ کی روشنی جیسے ہی حوض کے اندر پہنچی غار جیسے جگہ گامٹھا۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

حوض کی تہ میں ہیرے جو اہرات کا انبار لگا ہوا تھا جو نارچ کی روشنی سے جگمگاٹھا تھا۔ لا تعداد ہیروں سے رنگ برنگی کر نیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ دونوں متوحش نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر موزیکا نے خوشی سے چیخنے ہوئے حوض میں چھلانگ لگا دی۔

حوض تقریباً چار فٹ گہرا تھا۔ ندیم بھی اندر آگیا۔ موزیکا خوشی سے تہتہ لگا رہی تھی۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر ہیروں کو اوپر اچھال رہی تھی۔ ہیروں اور آبدار موتیوں کی کئی مالا میں اس نے اپنے گلے میں ڈال لی تھیں۔ اتنی دولت دیکھ کر وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی تھی۔ ندیم کو ڈر تھا کہ وہ کہیں حواس نہ کھو بیٹھے۔

”پاگل ہو گئی؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ ندیم نے نارچ نیچے رکھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”ہاں..... میں واقعی پاگل ہو گئی ہوں۔ میرا دماغ چل گیا ہے۔“ موزیکا نے تہتہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اتنی دولت میں نے صرف فلموں میں دیکھی ہے۔ لیکن وہ سب کچھ ناممکن ہوتا ہے۔ اور یہ..... یہ..... خزانہ اصلی ہے۔“

انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کب شام ہوئی اور کب رات ختم ہوئی.....؟ وہ ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے سوتے جاگتے رہے۔

بھیڑیے کے رونے کی آواز سن کر قابوس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ چھت کے سوراخ میں اب بہت مدہم سی روشنی نظر آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ رات بیت گئی تھی اور دن نکل آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سب لوگ جاگ گئے۔ قابوس نے صبح کے ناشتے کے طور پر راشن تقسیم کیا۔ اور جب غار میں کسی قدر اجالا پھیل گیا تو انہوں نے ایک بار پھر راستے کی تلاش شروع کر دی..... وہ ایک بار پھر مختلف سرنگوں میں پھکر لگنے لگے۔

ندیم کے ساتھ اس مرتبہ موزیکا تھی۔ وہ دونوں مجسمے کے چوترے کے پیچھے چٹان کی ایک بہت تنگ سی غار میں داخل ہو گئے۔ یہ غار اس قدر تنگ تھا کہ اس میں ریگ کر ہی اندر داخل ہوا جاسکتا تھا۔ گزشتہ روز انہوں نے اس غار کو نظر انداز کر دیا تھا اور اب ندیم کے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا کہ ممکن ہے یہی تنگ سا غار انہیں پاتال سے نکالنے کا سبب بن جائے.....!

نارچ کی روشنی میں جائزہ لینے سے اندازہ ہوا تھا کہ یہ تنگ سا غار بالکل صاف تھا۔ پہلے ندیم سینے کے بل رینگتا ہوا غار میں داخل ہوا۔ پھر اس کے پیچھے موزیکا بھی اندر داخل ہو گئی۔ انہیں تقریباً دس فٹ تک سینے کے بل رینگنا پڑا تھا۔ پھر وہ تنگ سا غار بتدریج کشادہ ہوتا چلا گیا اور بالآخر وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چھت تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی۔ ندیم نارچ کی روشنی میں اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ چند گز آگے ایک اور غار تھا جس کے دہانے پر پتھر ہی سے تراشا ہوا ایک اڑدھا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ اڑدھا اس قدر نفاست اور خوبصورتی سے تراشا گیا تھا کہ بادی النظر میں بالکل اصلی ہی لگتا تھا۔ ندیم دل ہی دل میں ان لوگوں کی صنائی کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا تھا جنہوں نے یہاں اپنی مہارت کے جوہر بکھیرے تھے۔ چٹانی بل، اس کا میکینزم، غار کے دہانے پر نصب بدھ کے مجسمے، غار کے اندر بدھ کا قد آدم مجسمہ اور اب یہ اڑدھا..... انہیں دنیا کے بہترین شاہکار کہا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ شاہکار دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ایسی جگہ پر پڑے تھے جہاں کسی انسان کی رسائی ممکن نہیں تھی اور غالباً اسی لئے یہ حسین شاہکار اب تک محفوظ بھی تھے۔ اور صدیوں بعد یہ انسانوں کا پہلا گروہ تھا

ندیم نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ موزیکا اس سے لپٹ گئی۔

”میں بھی کتنی بے وقوف ہوں ندیم! جو پانڈے کی باتوں میں آگئی تھی۔“ موزیکا نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ ”وہ انڈیا کا ایجنٹ ہے۔ ایک خاص مقصد کے تحت اس مہم میں شامل ہوا تھا۔ وہ دراصل تم لوگوں کو لپٹا ویلی یا سیاچن کی طرف لے جانا چاہتا تھا جہاں تم لوگوں کی بہت اہم فوجی تنصیبات ہیں۔ اس کے پاس چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسمیٹر دراصل ایک بہت وسیع رینج والا ٹرانسمیٹر ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آقاؤں سے رابطہ رکھتے ہوئے ہے۔ اس ٹرانسمیٹر میں ایک بہت حساس کیمرہ بھی ہے جس سے وہ ان فوجی تنصیبات کی تصویریں لینا چاہتا ہے۔“

ندیم کو پانڈے پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا شبہ تو تھا اور اب موزیکا نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ وہر کے بغیر بولے جارہی تھی۔

”اسے پتہ چل گیا تھا کہ غار میں ڈھانچے کے لباس سے جو کاغذات ملے تھے ان میں بھارتی حکمرانوں کے عزائم کے بعض اہم راز تھے۔ اس نے اپنے آقاؤں کو ٹرانسمیٹر پر ان کاغذات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور اسے ہر قیمت میں یہ کاغذات حاصل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے مجھے بھارتی حکومت سے بہت بڑے انعام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور میں نے ایک رات تمہارے خیمے میں آکر وہ کاغذات چرانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن تم بہت چالاک ثابت ہوئے۔ پھر تمہیں یاد ہے.....“ موزیکا رکے بغیر بولے جارہی تھی۔ ”ایک رات تم پر کسی نے حملہ کیا تھا۔ وہ پانڈے ہی تھا۔ اس رات اس نے قبوے میں نیند کی دوا ملا دی تھی۔ سب لوگ گہری نیند سو گئے تھے مگر تم پر شاید اس خواب آور دوا کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا اور رات کے آخری پہر جب تم خیمے سے باہر گئے تھے تو وہ بھی تمہارے پیچھے ہی گیا تھا۔ اس نے تم پر حملہ کر کے تمہیں بے ہوش کر دیا تھا لیکن اسے تمہاری جیبوں سے وہ کاغذات نہیں ملے تھے۔ واپس آکر اس نے تمہارے سامان کی تلاشی بھی لی تھی مگر اسے سامان میں بھی کاغذات نہ پا کر بڑی مایوسی ہوئی تھی۔“

ندیم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ کاغذات اس نے اپنے خچر کی زین کے نیچے بہت اندر کر کے پھنسا دیئے تھے اور خچر برف کے تودے کے نیچے دب کر ختم ہو گیا تھا۔

ناظر وہ کاغذات بھی ٹٹوں برف کے نیچے دفن ہو گئے تھے۔ اس کا ندیم کو افسوس بھی ہوا۔ پاکستان کے خلاف بھارتی حکمرانوں کے عزائم کا ایک ثبوت ملا تھا وہ ضائع ہو گیا۔ پانڈے بہت خطرناک آدمی ہے۔“ موزیکا کہہ رہی تھی۔ ”اس کے پاس پستول بھی ہے۔ لالچ کے علاوہ وہ اکثر مجھے دھمکی بھی دیتا رہتا ہے کہ اگر میں نے اس کے بارے میں تم لوگوں سے کسی کو کچھ بتایا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تمہارا ساتھی راشد بھی بیڑوں کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اسے پانڈے ہی نے مارا تھا۔ راشد نے اسے ٹرانسمیٹر پر باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔ پانڈے خطرناک ہی نہیں بہت بد معاش آدمی بھی ہے۔ وہ مجھے ہر ناپے ساتھ رکھتا ہے کہ کہیں اس کا راز فاش نہ کر دوں۔ وہ کئی مرتبہ میری عزت سے لڑکھیل چکا ہے۔ میں ہی بے وقوف تھی جو اس سے ڈرتی رہی۔ لیکن اب مجھے اس سے بڑھ کر ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں اس کے بارے میں بتا دیا ہے۔“ موزیکا نے ایک بھر ندیم کو قریب کر لیا۔

ندیم دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ ہیرے جواہرات کی چمک اسے سچ بولنے پر مجبور کر رہی تھی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ پانڈے کے ساتھ مل کر وہ یہ دولت حاصل نہیں کر سکتی۔ ندیم کا ساتھ دے کر وہ اصل دولت کی مالک بن سکتی تھی کیونکہ ندیم اس ملک کا باشندہ اور اس دولت کو یہاں سے نکال سکتا تھا جبکہ پانڈے کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔

”پانڈے کے بارے میں مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تم نے اس کی تصدیق کر دی اس کے لئے تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ لیکن دوسروں کو اس سلسلے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ سب میں خوف پیدا ہو گا۔ لیکن مجھے حیرت ہے پانڈے نے آج تک میرے ساتھ کیسے چھوڑ دیا؟“ ندیم نے کہا۔

”اس کی دو وجوہات ہیں۔“ موزیکا نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ رہ کر ایک بار پھر فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اب وہ جیکو کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا چاہتا ہے کیونکہ وہ تم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اور اسی لئے پانڈے نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہے۔“ موزیکا چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی بولی۔ ”یہ دولت ہماری ہے ندیم! ہم دونوں کی۔ اسے ہم نے جتنا جتنا کیا ہے۔“

مونیکا پشت کے بل حوض کی دیوار سے ٹکرائی۔ وہ ہیرے جوہرات میں دھنسی ہوئی تھی۔ ایک طرف پڑی ہوئی نارنج کی روشنی اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔  
دفعۃً ندیم کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ مونیکا کے پیچھے حوض کے کنارے پر ایک سیاہ کوبرا مونیکا کی طرف ریگ رہا تھا۔  
”مونیکا! سانپ!....!“ ندیم چیخا۔

مونیکا نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا۔ لیکن ٹھیک اسی لمحے بلیک کوبرا اس کے کندھے سے ہوتا ہوا اس کے سینے پر گرا۔ سانپ نے اس کے برہنہ بدن پر ڈس لیا اور مونیکا کے منہ سے نکلنے والی خوفناک چیخ غار میں گونجتی چلی گئی۔

☆

ندیم نے لپک کر نارنج اٹھالی۔ اس کی نظریں سانپ پر مرکوز تھیں جو مونیکا کے جسم پر ریگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اور مونیکا کے پیٹ پر ڈسا۔ مونیکا کے جسم کو جھکا سا لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔

سانپ مونیکا کے پیروں سے ہوتا ہوا آگے آگیا تھا۔ ندیم اسے نارنج کی روشنی کے حلقے میں لئے ہوئے تھا۔ دفعۃً بلیک کوبرا ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اس کا سر تقریباً ڈیڑھ فٹ اوپر اٹھ گیا اور پھن پھیل گیا۔ اس کی سرخ و شاخہ زبان بار بار باہر کو لپک رہی تھی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس سانپ کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہوں۔

ندیم کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چاریل والی نارنج خاصی لمبی اور وزنی تھی۔ اس نے نارنج کو آخری سرے سے پکڑ لیا۔ اس کی نظریں سانپ کے پھن پر مرکوز تھیں۔ دفعۃً اس کے ہاتھ نے حرکت کی۔ نارنج کی روشنی کی لہریں بنی اور نارنج کا شیشے والا حصہ سانپ کے سر پر لگا۔

ندیم نے فوراً ہی نارنج سیدھی کر لی۔ سانپ حوض کے کنارے پر پڑا تھا اور اپنا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ندیم نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر نارنج ہی سے اس کے سر پر ایک اور ضرب لگائی۔ سانپ کا اٹھتا ہوا سر نیچے گر گیا۔ ندیم اس کے سر پر بھاری بوٹوں سے ٹھوکریں مارنے لگا۔ سانپ کا پورا جسم سو سو بل کھارہا تھا۔ ندیم اس وقت تک ٹھوکریں مارتا رہا جب تک سانپ کا سر پوری طرح نہیں پکا گیا۔

”نہیں مونیکا!“ ندیم مسکرا دیا۔ ”یہ دولت اور ان غاروں میں گوتم بدھ کے ہمارے ملک کی ملکیت ہیں۔ گوتم بدھ کے ان مجسموں کی دریافت دنیا میں تہلکہ مچا دے گا۔ آثار قدیمہ کے یہ شاہکار ہمارے ملک کا بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوں گے۔ اس ویرانے سے نکلنے ہی میں حکومت کو اطلاع دوں گا اور پھر کسی نہ کسی طرح یہ ساری دولت اور گوتم بدھ کے مجسمے یہاں سے منتقل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”او کم آن ندیم!“ مونیکا بولی۔ ”تم گوتم بدھ کے ان مجسموں کے بارے میں حکومت کو ضرور اطلاع دینا مگر یہ دولت..... اس پر تو ہمارا حق ہے۔ صرف ہم دونوں کا۔ اس کے بارے میں ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ اس ویرانے سے نکلنے کے بعد دوبارہ یہاں آئیں گے جدید ترین انتظامات کے ساتھ ہیلی کاپٹر پر۔“

مونیکا نے ایک ہاتھ سے اپنی جیکٹ کی زپ کھول دی۔ اس نے جیکٹ اتار دی جری اتارنے کے بعد چھوٹا سا میٹر بھی اتارنے لگی۔ ”یہاں تو گرمی لگ رہی ہے۔“

”موسم کے بارے میں مونیکا کا تبصرہ غلط نہیں تھا۔ یہاں واقعی گرمی تھی۔ اس کی شاید یہ تھی کہ یہ جگہ غار کے انتہائی اندر تھی۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ یہاں گھٹن کا احسا نہیں ہو رہا تھا۔ مونیکا کو دیکھ کر ندیم کچھ پریشانی محسوس کرنے لگا تھا۔

”پلیز ندیم!“ مونیکا بولی۔ ”یہ دولت اتنی ہے کہ تم اس کی بابت کا اندازہ نہیں سکتے۔ آنے والی کئی نسلیں عیش کریں گی۔“

مونیکا اس سے لپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ندیم سرک کر پیچھے ہٹ گیا۔ مونیکا کچھ تک اسے رام کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن جب ناز و ادا کا ہر حربہ ناکام ہو گیا تو وہ اپنی طرح غرائی۔ ”میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں۔ میں اس دولت سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔“

ندیم اس کا بدلا ہوا انداز دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ مونیکا نے اچانک ہی لپک اس کا گلاد بوج لیا اور اس کی شرگ پر ناخن گاڑنے لگی۔

مونیکا کا یہ حملہ ندیم کے لئے بالکل غیر متوقع تھا اس کی سانس رکنے لگی۔ آنکھیں حلقوں سے اٹپنے لگیں۔ مونیکا پوری قوت سے اس کا گلاد بارہی تھی۔ ندیم نے اپنے جسم تمام تر قوتیں مجتمع کر کے مونیکا کو پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔



”میں بھی اس غار سے باہر نکلنے کا راستہ ہی تلاش کرنے گیا تھا۔“ ندیم نے جواب دیا۔  
 ”لیکن افسوس کہ موزیکا اب ہم میں نہیں ہے۔“

”کیا مطلب..... کیا ہوا اسے؟“ قابوس نے پوچھا۔

”اسے ایک زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ اس کی لاش کو یہاں تک اٹھا کر لانا ممکن نہیں تھا۔ میں اسے وہیں چھوڑ آیا ہوں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”تم جھوٹ بکتے ہو۔“ پانڈے اس کی طرف دیکھ کر غرایا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم لوگ چاہو تو میرے ساتھ جا کر اس کی لاش دیکھ سکتے ہو۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”چلو! ہمیں وہاں تک لے کر چلو۔“ پانڈے نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شک کی جھلک تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ندیم کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ..... اپنا اپنا سامان یہیں چھوڑ دو۔ ہم واپس یہیں پر آئیں گے۔“ ندیم جواب دیتے ہوئے چبوترے کے پچھلی طرف چل پڑا۔

وہ تنگ سی سرنگ سے ریگ کر کشادہ جگہ پر آگئے۔ ندیم نارچ کی روشنی میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ کھاڑی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور نارچ کی روشنی دوسری طرف والے لگا۔ روشنی سب سے پہلے اژدھے کے جسم پر پڑی تھی۔ انسانی صنایع کا اس قدر حسین شاہکار دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”موزیکا کی لاش وہ پڑی ہے۔ مجھے کے دائیں طرف زمین پر۔“ ندیم نے نارچ کی روشنی کی لاش پر ڈالی۔ ”جھیکو!“ وہ جھیکو کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”تم شاید یہ کھائی عبور نہ کر سکو۔ یہیں رک جاؤ! میں ان لوگوں کو لاش دکھا کر آتا ہوں۔“

ندیم، پانڈے، محسن اور قابوس چھلانگ لگا کر کھائی کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ موزیکا جیسے پر نیلا ہٹ تھی۔ ندیم نے جھک کر اس کی جیکٹ کی زپ کھول دی اور سویٹر اور شیش کر سینے تک اٹھا دی۔ موزیکا کا پورا جسم نیلا ہو رہا تھا۔

”اس سرنگ میں چند قدم آگے بے شمار سانپ ہیں۔“ ندیم نے آگے والی سرنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”سانپوں کو دیکھ کر ہم واپس پلٹے۔ موزیکا کا پیر پھسل گیا۔ اٹھنے کی کوشش بار بار پھسلتی رہی۔ میں اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھا تو لا تعداد سانپ ہماری

ندیم کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکن خوفناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ سانس بے ربط ہو رہا تھا۔ اسے اپنے حواس پر قابو پانے میں کئی منٹ لگ گئے۔ اور بالآخر جب وہ سنبھلا تو اس کی نظر موزیکا کی طرف اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

موزیکا کے جسم پر نیلا ہٹ سی پھیل رہی تھی۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ سانپ بہت زہریلا تھا۔ موزیکا تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی جب سانپ نے اسے ڈسا تھا اور اب سانپ کا زہر اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔

ندیم نے نارچ ایک بار پھر اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی موزیکا پر پڑتی رہے۔ وہ اٹھ کر موزیکا کے قریب آگیا۔ اس نے بڑی مشکل سے موزیکا کو سویٹر اور جیکٹ وغیرہ پہنائی اور اسے کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے پتھر کے اس حوض سے نکال کر کنارے پر لٹا دیا۔ اس نے جھک کر نارچ اٹھائی۔ پھر کچھ سوچ کر چند ہیرے اٹھا کر اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لئے اور اچک کر کنارے پر آگیا۔ پھر نچلے پتھر پر کھڑے ہو کر اس نے موزیکا کی لاش کندھے پر لادی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس جانے والے راستے پر چل پڑا۔

اسے واپسی کا راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اژدھے کے مجسمے کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ اس نے موزیکا کی لاش نیچے رکھ دی۔ اس سے آگے تقریباً چار فٹ چوڑی وہی کھائی تھی جسے عبور کر کے وہ اس طرف آئے تھے۔ موزیکا کی لاش کو کندھے پر لاد کر وہ خطرناک کھائی عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کوشش میں عین ممکن تھا کہ لاش کے ساتھ وہ بھی کھائی میں جا گرتا۔

ندیم نے نارچ کی روشنی میں موزیکا کی لاش کی طرف دیکھا اور چھلانگ لگا کر وہ کھائی عبور کر لی اور پھر اس تنگ سی سرنگ سے ہوتے ہوئے اس ہال نما غار تک پہنچا اس کے لئے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا جہاں اس کے باقی ساتھی موجود تھے۔

”ہم نے اس غار سے نکلنے کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ اور موزیکا کہاں ہے؟“ محسن نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ سامنے گوتم بدھ کے مجسمے والا چبوترہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے تنگ سی سرنگ سے برآمد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکے تھے۔

ش دفنانے کے لئے گڑھا کھودنا ممکن نہیں تھا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ موزیکا کی لاش کو یہیں پھونسا جائے۔

”یہ اڑھا خاصا جسیم ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”کیوں نہ موزیکا کی لاش کو اٹھا کر اس جگہ کے اوپر رکھ دیا جائے؟“

”میرا خیال ہے یہ بہتر رہے گا۔“ ندیم نے کہا۔

ان چاروں نے مل کر موزیکا کی لاش کو اٹھا کر اڑھے کی کنڈلی پر رکھ دیا اور کھائی جگہ کر جھیکو کے پاس آگئے اور پھر واپسی کا راستہ طے کرنے لگے۔

”ہاں! تو وہ راستہ کہاں ہے جو تم لوگوں نے اس غار سے باہر جانے کے لئے تلاش کیا ہے؟“ ندیم نے گوتم بدھ کے مجسمے والے ہال میں پہنچ کر پوچھا۔

”وہ اوپر ایک چھوٹا سا غار دیکھ رہے ہو؟“ محسن نے زمین کی سطح سے تقریباً چھ فٹ اوپر پار میں ایک چھوٹے سے غار کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہی باہر جانے کا راستہ ہے۔ ہم ان غاروں پر چڑھ کر اس غار میں داخل ہو سکتے ہیں۔“

ندیم نے ان دو بڑے پتھروں کی طرف دیکھا جو اس غار کے عین نیچے پڑے ہوئے تھے۔ ان پتھروں کے ذریعے اس غار تک واقعی آسانی سے پہنچا جاسکتا تھا۔

”چلو..... پھر دیکھو کس بات کی ہے؟ اپنا اپنا سامان اٹھاؤ۔“ ندیم بولا۔

انہوں نے اپنا اپنا سامان اٹھا لیا۔ سب سے پہلے محسن پتھروں پر چڑھ کر اوپر پہنچا۔ پھر ندیم کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ اور اس کے بعد ندیم وغیرہ بھی اس دو چھتی نما غار میں داخل ہوئے۔

تو انہیں جھک کر بل کھاتے ہوئے اس غار میں چلنا پڑا۔ پھر یہ غار اتنا بڑا ہوا کہ وہ سیدھے ہو کر آسانی سے چل سکتے تھے۔ راستہ مسلسل بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ سانس پھول رہے تھے۔

☆

طرف لپکے۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹا تو سیاہ رنگ کے ناگ نے موزیکا کو ڈس لیا۔ دو تین ناگ میرے پیچھے بھی لپکے۔ مگر میں نے دوڑ کر کھائی کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید اس وقت میری لاش بھی یہاں پڑی ہوتی، لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ میرا پیچھا کرنے والے سانپ اڑھے کے اس مجسمے تک پہنچ کر واپس لوٹ گئے تھے۔ ان سانپوں کے غار کے اندر دینی جھے میں غائب ہوتے ہی میں دوڑ کر موزیکا کی لاش کو یہاں اٹھا لایا۔ اس وقت بھی چند سانپوں نے میرا پیچھا کیا تھا۔“

ندیم نے موزیکا کی موت کے سلسلے میں انہیں ایک دلچسپ کہانی سنادی۔ خزانے کا تذکرہ وہ گول کر گیا تھا۔ پانڈے جیسے خطرناک شخص کی موجودگی میں وہ خزانے کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو موزیکا کو اس طرح نہ مرنے دیتا۔“ پانڈے نے کہا۔

”اگر ایک دو سانپ ہوتے تو موزیکا واقعی نہیں مر سکتی تھی۔ لیکن وہاں تو سینکڑوں کی تعداد میں خطرناک سانپ رینگ رہے ہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو صرف پچاس گز آگے جا کر تسلی کر لو۔“ ندیم نے کہا۔

پانڈے یہ چیلنج قبول کرنے کی ہمت نہیں کر سکا، نہ ہی اسے اب ندیم کی بات پر کوئی شبہ رہا تھا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ موزیکا کی موت کسی بہت ہی زہریلے سانپ کے ڈسنے سے واقع ہوئی تھی۔

”اڑھے کا یہ مجسمہ شاید اس بات کی علامت ہے کہ یہاں سے آگے سانپوں کی حکمرانی ہے۔ گویا یہ مجسمہ خطرے کی علامت کے طور پر یہاں رکھا گیا ہے۔“ قابوس نے قیاس آرائی کی۔ وہ بھی شاید ندیم کی بات کا یقین کر چکا تھا۔

”ہاں! اور ہم اس علامت کو نہیں سمجھ سکے تھے۔“ ندیم بولا۔

وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر یہ موضوع زیر بحث رہا کہ موزیکا کی لاش کا کیا کیا جائے۔ اسے غار سے باہر لے جانا واقعی ممکن نہیں تھا کیونکہ غار کا کم از کم بیس گز حصہ ایسا تھا جہاں سے وہ خود رینگتے ہوئے آئے تھے اور ایک لاش کو گھسیٹ کر وہاں سے لے جانا ناممکن ہوگی۔ بالفرض وہ لاش کو اگر کسی نہ کسی طرح بڑے ہال میں لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہاں بھی یہ مسئلہ ہو تا کہ اسے دفن کیسے کیا جائے۔ وہاں بھی پتھر جلی زمین میں

رہے تھے۔ بالآخر ندیم کو ایک ایسا راستہ بھی نظر آ گیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ مدیوں پہلے گوتم بدھ کے پیروکار اس غار میں آمد و رفت کے لئے یہی راستہ استعمال کرتے ہوں گے۔

دفعۃً غراہٹ کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ یہ سفید بھیڑیے کی غراہٹ تھی جسے وہ بھول ہی گیا تھا۔ وہ مڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر بھیڑیا اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ ندیم کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کے پاس رائفل بھی نہیں تھی کہ بھیڑیے کے حملہ آور ہونے کی صورت میں اس پر فائر کر سکے۔ ایک رائفل قابوس کے پاس اور دوسری محسن کے پاس تھی۔

بھیڑیے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ویرانہ فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ ندیم دوڑتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں محسن نہیں تھا۔ بھیڑیے کی آواز سن کر وہ سب بھی خائف ہو گئے تھے اور گولی ظاہر ہے محسن ہی نے چلائی ہو گی جو ان میں نہیں تھا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد محسن ایک جانور کی ٹانگ پکڑے اسے گھسیٹتا ہوا لارہا تھا۔ وہ لوگ یہی سمجھے کہ محسن نے بھیڑیا شکار کر لیا ہے جو کئی روز سے بدروح کی طرح ان کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ بھیڑیا نہیں مار خور تھا۔

قابوس نے جیب سے چاقو نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مار خور کی کھال اتار دی اور اس کا پیٹ چاک کر کے ساری آلائشیں بھی نکال دیں۔ قرب و جوار کی چٹانوں میں موٹی ٹانخوں والی جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ وہ جھاڑیاں توڑ توڑ کر جمع کرنے لگے۔ جھاڑیاں اگرچہ گیلی تھیں لیکن وہ انہیں آگ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

سالم مار خور انہی جھاڑیوں میں آگ پر بھونا گیا۔ اس وقت دوپہر ہو گئی تھی۔ انہوں نے پتھر سے گوشت پر دعوت اڑائی۔ بچا ہوا گوشت بانٹ کر اپنے اپنے تھیلوں میں رکھ لیا اور ندیم کی رہنمائی میں ڈھلان اترنے لگے۔

نیشب میں دور دور تک کسی چھوٹی سی بستی کے آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سب ہی لوگ سوچ رہے تھے کہ گوتم بدھ کے پیروکار اس غار تک کیسے پہنچے ہوں گے۔ ندیم تو اس خزانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو غار کے انتہائی اندرونی حصے میں اس سارے مونیکانے دریافت کیا تھا۔

ندیم سوچ رہا تھا کہ اگر یہ غار بدھ کے پیروکاروں کی عبادت گاہ تھی تو وہ یہاں تک پہنچے کیسے ہوں گے؟ اور پھر غار کے انتہائی اندرونی حصے میں پوشیدہ وہ خزانہ؟ گوتم بدھ کے پیروکاروں کو دولت سے کیا سروکار؟ گوتم بدھ نے سادگی کا درس دیا تھا۔ اس کے پیروکاروں نے کبھی دولت سے محبت نہیں کی تھی۔ یہ گوتم بدھ کے کیسے پیروکار بنے جنہوں نے اس غار میں قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ ندیم کے خیال میں اس خزانہ مالیت کھربوں روپے ضرور رہی ہو گی اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ اگر مزید تلاش کیا جائے تو ان غاروں میں ایسے اور بھی بہت سے خزانے پوشیدہ ہوں گے۔

سریگ کئی موڑ لئے ہوئے تھی۔ سوگڑ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد غار میں ہلکی سی راز محسوس ہونے لگی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ محسن سب سے آگے تھا۔ مارخور کے ہاتھ میں تھی جس کی روشنی سے وہ سب کو راستہ دکھاتا ہوا چل رہا تھا۔ لیکن اب نے مارخور بھادی کیونکہ اب انہیں راستہ آسانی سے نظر آ رہا تھا۔ بالآخر وہ غار سے باہر نکلے۔

باہر دن کی تیز روشنی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ سریگ مسلسل چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ بری طرح تھک گئے تھے۔ غار سے نکلتے ہی مختلف بیٹھ گئے۔ جب حواس قابو میں آئے تو ندیم اٹھ کر صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مارخور چوٹی پر تھے جس کے غاروں سے نکل کر وہ آئے تھے۔ یہاں بھی دو تین مختلف چوٹیاں گوتم بدھ کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔

ندیم ایک چھوٹی سی چٹان کی آڑ سے نکل کر دوسری طرف آ گیا۔ اب اسے سامنے نیشب میں ایک وسیع و عریض وادی نظر آرہی تھی۔ ہر طرف بکھری ہوئی نظریں دکھانا مشکل ہو رہا تھا۔ برف کی اس وادی میں کہیں کہیں چٹے کے درخت

کر دیکھ بغیر اپنی جیبوں میں ٹھونس لئے۔ ندیم یا کسی اور نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مہربند خوراک قابل استعمال تھی۔ ان سب نے مختلف چیزوں کے ڈبے اٹھائے اور طیارے میں کچھ اور تلاش کرنے لگے۔ قابوس سب سے پہلے طیارے سے باہر آیا اور ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اسے سامان نما چٹان کے نیچے ایک تیسرا ڈھانچہ بھی نظر آگیا۔ اس کے جسم پر بھی پائلٹ آفیسر کی وردی تھی جس پر جا بجا خون کے دھبے تھے جو سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس تباہ شدہ جہاز سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر سامان نما اس چٹان کے نیچے آکر ختم ہو گیا۔

آگے جانے کی بجائے انہوں نے وہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاز کے ڈھانچے میں وہ کم از کم سردی سے توقع ہی سکتے تھے۔ اور یہاں کھانے کو بھی بہت کچھ تھا۔ کھانا انہوں نے شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی کھالیا تھا کیونکہ اب ان کے پاس روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ ندیم اور محسن جہاز سے باہر آگئے اور ایک پتھر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

”حیرت ہے کہ یہ جہاز یہاں کیسے گر کر تباہ ہوا؟“ محسن بولا۔

”اس جہاز میں مہربند خوراک، ادویات، کمبل اور خیمے وغیرہ ہیں اور اس جہاز کا تعلق بھی بھارتی فضائیہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جہاز کسی فوجی کیمپ کے لئے سپلائی لے کر جا رہا تھا۔“ ندیم نے کہا۔

”لیکن اس طرف بھارت کا کوئی فوجی کیمپ کیسے ہو سکتا ہے؟“ محسن بولا۔

”تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ کشمیر کی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اور پھر سیاجن، جو کئی برسوں سے پاکستان اور بھارت کے درمیان محاذ جنگ بنا ہوا ہے۔ لیکن ٹرانسپورٹ طیارے کا سیاجن پر جانا ممکن ہی نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ جہاز سامان لے کر نیگار کی طرف جا رہا ہو لیکن راستہ بھٹک گیا ہو اور کسی فنی خرابی کے باعث یہاں گر کر تباہ ہو گیا ہو۔“ ندیم نے کہا۔

”ہاں..... یہ ممکن ہو سکتا ہے۔“ محسن بولا۔ ”لیکن ان چٹانوں پر گوتم بدھ کی مورتی اور غاروں میں گوتم بدھ کے مجسموں والی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ یہاں تو نیوں دور تک کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر گوتم بدھ کے پیروکاروں نے یہاں کوئی عبادت گاہ بنا رکھی تھی تو وہ کھاتے پیتے کیا ہوں گے؟“

وہ چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے گرد چکر کاٹتے ہوئے نشیب میں اترتے رہے۔ ایک چٹان کے گرد گھومتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی اور وہ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس چیز کی طرف دوڑ پڑے جسے دیکھ کر وہ چوٹے تھے۔

وہ ہوائی جہاز کا ایک ڈھانچہ تھا۔ پہلے تو وہ لوگ یہی سمجھے کہ یہ اسی طیارے کا ڈھانچہ ہے جس کی تلاش میں وہ نکلے تھے۔ لیکن جلد ہی ان کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔

ڈھانچے کا جائزہ لینے کے بعد انکشاف ہوا کہ یہ بھارتی ایئر فورس کا ٹرانسپورٹ طیارہ تھا جس پر بھارتی فضائیہ کا مخصوص نشان بنا ہوا تھا۔

پانڈے سب سے پہلے طیارے کے ڈھانچے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ندیم تھا جس نے رائفل سنبھال رکھی تھی۔ پھر قابوس اندر آیا۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ پانڈے طیارے کے ڈھانچے پر بھارتی فضائیہ کا نشان دیکھ کر جس طرح بے قرار ہوا تھا اس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے تھے۔

طیارے کے اس ڈھانچے میں مختلف قسم کا سامان پڑا ہوا تھا جس میں کمبل، شامیانے، ادویات اور مہربند ڈبوں پر مشتمل خوراک کا ذخیرہ موجود تھا۔ کچھ سامان تباہ شدہ جہاز کے آس پاس بھی بکھرا ہوا تھا۔ ندیم نے ایک ڈبہ اٹھا کر دیکھا۔ یہ سیب کے مربے کا ڈبہ تھا جس پر مینو فیکچرنگ کی تاریخ ڈیڑھ سال پرانی تھی۔ ایکسپائرنگ ڈیٹ نہیں تھی لیکن یہ ہدایت درج تھی کہ دو سال کے اندر اندر استعمال کر لیا جائے۔

سیب کے مربے کے اس ڈبے سے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ یہ مربے ڈیڑھ سال پہلے بنا تھا لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ خرید اکب گیا تھا اور اس جہاز کو حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ سیب کے ڈبے پر درج تاریخ سے محض اندازے کی بنا پر ندیم نے یہ رائے قائم کی کہ اس ٹرانسپورٹ طیارے کو یہ حادثہ کم از کم ایک سال پہلے پیش آیا ہو گا۔ طیارے کے کچھ بے ہوئے ٹکڑے آس پاس بکھرتے ہوئے تھے۔

طیارے میں دو ڈھانچے بھی تھے۔ دونوں ڈھانچے کاک پٹ والے حصے میں تھے دونوں بھارتی فضائیہ کی یونیفارم میں تھے۔ ایک ڈھانچے کی یونیفارم کے پیچ سے اندازہ لگا جاسکتا تھا کہ وہ فائٹ لینٹینٹ تھا۔ جبکہ دوسرا پائلٹ آفیسر تھا۔

پانڈے ان ڈھانچوں کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔ اور ان کی جیبوں سے کاندات نکالے۔

اگر ہم اسلام آباد زندہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو میں سب سے پہلے حکومت سے رابطہ قائم کر کے اس خزانے اور بدھ کے مجسموں کے بارے میں اطلاع دوں گا۔ میں نے تمہیں اس راز سے اس لئے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ اس علاقے کو ذہن میں رکھنا۔ اگر میں زندہ نہ رہ سکا تو یہ ذمہ داری تمہیں نبھانی ہوگی۔“

”مطمئن رہو! میرا خیر بھی اسی مٹی سے اٹھا ہے۔ میں اپنی ذمہ داری نبھانے کی پوری کوشش کروں گا۔“ محسن نے جواب دیا۔ ”لیکن پانڈے! مجھے اس پر شک ہے۔ اس نے جہاز کے کاک پٹ میں ڈھانچوں کے لباس سے تمام کاغذات نکال کر اپنے قبضہ میں کر لئے ہیں۔ حالانکہ ان کاغذات سے ہمیں یہ پتہ بھی چل سکتا ہے کہ یہ جہاز کہاں سے پرواز کر کے آیا تھا اور اسے کہاں لینڈ کرنا تھا۔“

”پانڈے بہت دنوں سے میری نگاہ میں ہے۔“ ندیم نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”وہ ایک خاص مقصد کے تحت ہماری ٹیم میں شامل ہوا تھا۔ وہ بھارتی جاسوس ہے اور ہمیں راستے سے بھٹکا کر وادی لیپا یا سیاجن کی طرف لے جانا چاہتا تھا تاکہ ان علاقوں میں ہماری فوجی تنصیبات کا جائزہ لے سکے۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے پاس وہ ڈرائسٹر دراصل بہت طاقتور ریڈیو ٹرانسمیٹر ہے اور اس میں ایک بہت حساس کیمرہ بھی فٹ ہے۔ اس کے پاس ایک پستول بھی ہے جو اس نے اوستور سے خریدا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے موزیکا نے بتائی تھیں۔ اس نے موزیکا کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ وہ اس کے ذریعے وہ کاغذات حاصل کرنا چاہتا تھا جو کئی روز پہلے غار کے ایک ڈھانچے کے لباس سے ملے تھے۔ ان کاغذات میں بھارت کے اہم فوجی راز ہیں۔“

”اور وہ کاغذات کہاں ہیں؟“ محسن نے پوچھا۔

”میں نے وہ کاغذات حفاظت کے خیال سے اپنے خچر کی زین کے اندر چھپا دیئے تھے۔“

”وہ خچر ہزاروں من برف کے نیچے دب چکا ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”اچھا ہوا، تم نے مجھے پانڈے کے بارے میں بتا دیا۔“ محسن بولا۔ ”لیکن یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ گوتم بدھ کے پیروکار یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟“

”وہ تارک الدنیا قسم کے لوگ تھے۔“ ندیم بولا۔ ”نیکسلا کسی زمانے میں بدھ تہذیب کا

بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ نیکسلا کے آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بھی بدھ تہذیب کے

”ان پہاڑوں میں مار خور بکثرت ہیں۔ ہو سکتا ہے انہی کے شکار پر گزارہ کرتے ہوں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”لیکن وہ مجھے!“ محسن بولا۔ ”میں نے لاہور میوزیم میں اور دوسری جگہوں پر بھی بدھ کے بہت سے مجسمے دیکھے ہیں۔ لیکن ان غاروں اور چٹانوں میں پڑے ہوئے مجسمے تو فنی سنگ تراشی کا شاہکار ہیں۔ یہ صدیوں پرانے ہیں۔ ان کی مالیت کروڑوں روپے تو ضرور ہوگی۔“

”ان قیمتی مجسموں کے علاوہ بھی ان غاروں میں بہت بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔“ ندیم نے یہ کہتے ہوئے محتاط نگاہوں سے جہاز کی طرف دیکھا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”یہ بات صرف تم تک ہی رہنی چاہئے۔ اس غار میں ایک بہت بڑا خزانہ موجود ہے۔ ہیرے، جواہرات، نوادرات اور پتہ نہیں کیا کیا اس خزانے میں شامل ہے۔“

”تم شاید مذاق کر رہے ہو۔“ محسن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

ندیم نے جیکٹ کی جیب سے چند ہیرے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ ”یہ ہیرے میری بات کی سچائی کا ثبوت ہیں۔ اس غار کے انتہائی اندرونی حصے میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے ہیرے موجود ہیں۔ اتنا بڑا خزانہ میں نے صرف فلموں میں دیکھا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے کوئی شاہی خزانہ لوٹ کر اس غار میں چھپا دیا ہو۔“ ندیم چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ پھر بولا۔ ”غار کے اندر یہ خزانہ میں نے اور موزیکا نے دریافت کیا تھا۔ اس خزانے کو دیکھ کر موزیکا کی نیت بدل گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس خزانے کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔ ہم لوگ ان پہاڑوں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم دونوں بیک کا پیڑ پر آکر یہ خزانہ لے جائیں گے۔ لیکن میرے انکار پر پہلے تو اس نے اپنے حسن و شباب کا لالچ دے کر مجھے رام کرتھنے کی کوشش کی مگر میں پھر بھی اس کی بات ماننے پر تیار نہیں ہوا تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ میرا گلا گھونٹنا چاہتی تھی۔ یہ دیکھو! میرے گلے پر اس کے ناخنوں کے نشان موجود ہیں۔“ ندیم نے گلے پر لپٹا ہوا مفلتر ہٹا کر اسے موزیکا کے ناخنوں سے لگنے والی خراشیں دکھائیں۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اپنے آپ بچانے کے لئے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اور پھر اسے ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔“

موزیکا کو سانپ نہ ڈستا تو میں اسے گلا گھونٹ کر ختم کر دیتا۔ یہ خزانہ ہماری قومی ملکیت ہے

چھلانگ لگادی۔ اس مرتبہ اس کے پیر کی ٹھوکر بھڑیئے کے منہ پر لگی۔

سفید بھڑیئے کے منہ کو انسانی خون لگ چکا تھا۔ وہ کئی روز سے ان کا پیچھا کر رہا تھا اور ان کے کئی ساتھیوں کا خون پی چکا تھا۔ اس وقت شاید وہ بھڑیا بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ نہتے ہیں اس لئے پلٹ پلٹ کر ان پر حملے کر رہا تھا اور ندیم کا سیکھا ہوا مارشل آرٹ اس وقت اس کے کام آ رہا تھا۔ وہ بھڑیئے پر پے درپے فلائنگ کلکس لگا رہا تھا۔ اس دور ان محسن بھی سنبھل گیا۔ ندیم کی جرات مندی سے حوصلہ پا کر اس نے بھی بھڑیئے پر ٹھوکروں سے حملے شروع کر دیئے۔

لیکن وہ سفید بھڑیا ان سے زیادہ نڈر اور خوفناک ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مادہ بھڑیا تھا۔ اس کا زانہ بی لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ شاید انتقام کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔

سفید بھڑیئے نے موقع پاتے ہی گرے ہوئے ندیم پر حملہ کر دیا۔ ندیم اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھڑیئے کو اپنے اوپر آتے دیکھ کر اس نے بڑی پھرتی سے ایک طرف لوٹ لگادی۔ بھڑیئے کا پیچہ اس کے پیر پر لگا۔ اس کا بوت اُدھر گیا مگر وہ خود بچ گیا۔

شور کی آواز سن کر قابوس اور پانڈے بھی دوڑتے ہوئے جہاز سے باہر آ گئے۔ قابوس نے دو تین فائر کر دیئے۔ سفید بھڑیا فائر کی آواز سن کر بھاگ نکلا۔ محسن نے دوڑ کر ندیم کو اٹھایا۔

”تم ٹھیک ہونا؟“ محسن نے پوچھا۔

”ہاں..... ندیم نے سر ہلایا۔ کم بخت بہت ہی خطرناک شے ہے۔“

”قابوس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“ محسن بولا۔ ”یہ مادہ ہے۔ جب تک اپنے نر کے قتل کا انتقام نہیں لے لے گی اس وقت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہ ہم سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دے گی۔“

قابوس اور پانڈے بھی دوڑتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ محسن اور ندیم کو سلامت دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ طیارے کے ڈھانچے میں واپس آ گئے۔

یہ سی 130 وائیڈ باڈی والا طیارہ تھا لیکن حادثے نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ انہیں اس ذلت پر بھی حیرت تھی کہ یہ طیارہ ان چٹانوں میں گر کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کیوں

آثار موجود ہیں۔ گلگت اور ہنزہ میں بھی جگہ جگہ بدھ تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بدھ کے پیروکاروں کا کوئی گروہ بینک کر اس طرف آنکلا ہو اور انہوں نے اس پہاڑ کے غار کو اپنا مسکن بنالیا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس طرف آنے والے بدھ کے پیروکاروں کا تعلق وادی لدانخ سے ہو سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ درہ زوچی لا اور کارگل کے درمیان کسی علاقے میں گوتم بدھ کی ایک بہت بڑی عبادت گاہ ہے جسے دیکھنے کے لئے پوری دنیا سے گوتم بدھ کے پیروکار آتے ہیں۔ لدانخ کی سرحدیں تبت سے ملتی ہیں اور تم جانتے ہو تبت گوتم بدھ کے پیروکاروں کا مرکز ہے۔ تبت میں لہاسہ کے مقام پر واقع پونا لا محل بدھ مت کا دنیا کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ گوتم بدھ کے پیروکار لدانخ ہی کے راستے گلگت اور نیکسلا کی طرف پہنچے ہوں گے۔ اور پھر کوئی گروہ بینک کر اس طرف آنکلا ہو گا جنہوں نے اس غار میں بسیرا کر لیا۔“

”تمہاری معلومات بہت وسیع ہیں۔“ محسن نے توصیفی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

ندیم کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ دائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر دو انگارے سے چپکتے دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ہلکی سی غراہٹ بھی سنائی دی تھی۔ وہ سفید بھڑیا تھا جو گھات لگائے بیٹھا تھا۔ بھڑیئے کی غراہٹ سن کر محسن بدحواس سا ہو کر اچھل پڑا اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور پتھر سے گر کر ڈھلان پر لڑھکنے لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

دوسرے ہی لمحے ندیم بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا کیونکہ سفید بھڑیئے نے ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے محسن کی طرف چھلانگ لگادی تھی۔ ندیم کے پاس راتقل نہیں تھی۔ وہ دونوں تو یونہی جہاز کے ڈھانچے سے باہر آ گئے تھے۔

ندیم اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر وہ خونی بھڑیا محسن تک پہنچ گیا تو محسن کی خیر نہیں۔ ندیم بھی ڈھلان پر تیزی سے محسن کی طرف دوڑنے لگا اور ٹھیک اس وقت جب بھڑیئے اور محسن میں صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا ندیم اپنی جگہ سے ہوا میں اچھلا اور اس کے دونوں پیر بھڑیئے کے پہلو پر لگے۔ بھڑیا بلبلاتا ہوا ڈھلان پر لڑھکنے لگا لیکن فوراً ہی سنبھل کر دوبارہ محسن کی طرف لپکا۔ ندیم بھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے دوبارہ بھڑیئے پر

نہی۔ اور پھر اچانک ہی کسی کی آواز سن کر وہ رُک گیا اور پوری توجہ سے وہ اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ پانڈے کی آواز پہچان گیا تھا اور اسے یہ سمجھنے میں دیر بھی نہیں لگی تھی کہ پانڈے ٹرانسمیٹر پر بات کر رہا تھا۔

”دیس سر! طیارے کے کریو میں ایک فلائٹ لیفٹیننٹ اور دو پائلٹ آفیسر تھے۔ جی ہاں! ان کے لباس سے برآمد ہونے والے کاغذات میں نے اپنے قبضہ میں لے لئے ہیں..... جی..... ایک سال پہلے..... میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ یہ حادثہ کم از کم ایک سال پہلے پیش آیا ہو گا۔ کارگل جا رہا تھا.....؟ اوہ..... لیس سر! میں وہ کاغذات حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ جناب وہ فرانسیسی لڑکی بھی مر گئی ہے جسے میں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ جی..... وہ بہت چالاک آدمی ہے..... جی نہیں! کسی کو ابھی مجھ پر شبہ نہیں ہو سکا..... لیس سر..... آج میں رات کو ایک بار پھر کوشش کروں گا۔ اور اینڈ آل.....“

موزیکانے پانڈے کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا ٹرانسمیٹر پر پانڈے کی اس گفتگو سے اس کی تصدیق ہو گئی تھی..... پانڈے ٹرانسمیٹر بند کر چکا تھا۔ ندیم واپس گھوم گیا اور تیزی سے رینگتا ہوا طیارے کے قریب پہنچ گیا۔ جب وہ طیارے پر چڑھا تو پانڈے اس وقت بھروسے کی آڑ سے نکل رہا تھا۔

ندیم بڑی پھرتی سے رینگتا ہوا اپنے بستر پر پہنچ گیا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا مگر پھر اس خیال کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے بستر میں گھس گیا۔

ندیم کا خیال تھا کہ پانڈے اس کے فوراً ہی بعد طیارے میں داخل ہو گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ منٹ پر منٹ گزرتے چلے گئے مگر پانڈے طیارے میں نہیں آیا۔ وہ شاید باہر ہی رُک گیا تھا۔ ندیم کو یقین تھا کہ وہ آج رات ایک بار پھر اس سے کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ مگر پانڈے طیارے کے باہر ہی رُک رہا۔ ندیم کے دماغ پر غودگی طاری ہونے لگی۔ وہ جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیند غالب آگئی اور وہ سو گیا۔

ندیم کو نیند میں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے اوپر سے کمبل اتارا ہو۔ ندیم کا ذہن ایک دم بیدار ہو گیا۔ لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ویسے اسے اندازہ ہو چکا تھا

نہیں بدل گیا تھا یا اس میں آگ کیوں نہیں لگی تھی۔ اس کے برعکس طیارے کے بازو اور دم والا حصہ اگرچہ تباہ ہوا تھا لیکن کاک پٹ اور پاؤں کا بیشتر حصہ ٹھیک ہی تھا۔

انہوں نے کھرا ہوا سامان سمیٹ کر جگہ بنالی تھی اور کمبل اٹھا کر بچھائے تھے۔ اوڑھنے کے لئے بھی لا تعداد کمبل مل گئے تھے۔ طیارے کے ڈھانچے اور کمبلوں کی وجہ سے وہ ہوا سے بچ گئے تھے۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ آج کئی روز بعد انہیں پوری طرح آرام کرنے کا موقع ملا تھا۔ گرم کمبلوں کا بستر اور اوڑھنے کے لئے بھی کئی کئی کمبل۔ لیکن اس حقیقت کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ آس پاس اس آدم خور بھیڑیے کی موجودگی کی وجہ سے وہ غیر محفوظ تھے۔ لہذا ایک بار پھر پہرے داری کا نظام قائم کرنا پڑا۔

وہ رات کا نچانے کون سا حصہ تھا کہ ندیم کی آنکھ کھل گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی لیکن اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی بات ضرور تھی۔ طیارے کے اندر تاریکی تھی۔ وہ کچھ دیر تک تاریکی میں گھورتا رہا۔ پھر سٹکے کے نیچے سے نارچ نکالنے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے نارچ وہیں رہنے دی اور بڑی آہستگی سے بستر سے نکل آیا۔

اب اس کی آنکھیں کسی حد تک تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ وہ بستروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بستر خالی تھا اور یہ وہی جگہ تھی جہاں رات کے ابتدائی حصے میں پانڈے سویا تھا۔ ندیم کے ذہن میں خیال آیا کہ ممکن ہے اس وقت پہرے داری کی ڈیوٹی پانڈے کی ہو اور وہ باہر کہیں بیٹھا ہو۔

ندیم بستر سے نکل کر رینگتا ہوا جہاز کی کھڑکی کے قریب آ گیا۔ کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ باہر جھانکنے لگا۔ باہر برف کی وجہ سے قدرے اجالا سا لگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ طیارے کا دروازہ ٹوٹ کر کہیں گر چکا تھا اور اس طرح ایک کشادہ خلا سامنے گیا تھا۔

ندیم بڑی احتیاط سے طیارے سے نیچے اتر آیا۔ وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پانڈے اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ دفعۃً دائیں کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ وہ اس طرف دیکھنے لگا لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ بڑی احتیاط سے اس طرف رینگتے لگا جس طرف سے پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی

”مم..... میں ہوں۔“ ندیم بولا۔ ”میرے گلے میں تکلیف ہو رہی ہے۔“  
 ”کیا ہوا.....؟“ جیکو اٹھ کر بیٹھ گئی اور تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر ندیم کو ٹٹولنے لگی۔  
 ندیم اپنے پانڈے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔  
 ”کچھ نہیں! شاید سوتے میں گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔“ ندیم نے جواب دیا۔  
 وہ دونوں کچھ دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ پھر جیکو تو سو گئی مگر ندیم جاگتا رہا..... اب اس کے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔  
 تقریباً ایک گھنٹے بعد پانڈے پھر جہاز کے ڈھانچے میں داخل ہوا۔ اس مرتبہ وہ کھانسا ہوا اور قدموں کی آواز پیدا کرتا ہوا اندر آیا تھا۔ ندیم بے حس و حرکت اپنے بستر میں دبکا رہا۔ پانڈے محسن کے بستر کے قریب رُک گیا اور آہستہ آہستہ اسے ہلانے لگا۔  
 ”محسن..... اٹھو..... اب تمہاری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے۔“

محسن ایک دو مرتبہ کسمنایا اور پھر اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ جہاز کے ڈھانچے کے دروازے میں بیٹھا ڈیوٹی دے رہا تھا اور پانڈے اپنے بستر میں گھس گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ندیم اس کے خراٹوں کی آواز سن رہا تھا۔ ندیم کو اس پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ پانڈے واقعی اتنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے ندیم کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور اس طرح اطمینان سے سو گیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو حالانکہ اس کے ذہن میں یہ خوف ضرور ہونا چاہئے تھا کہ ندیم اپنے ساتھیوں کو جگا کر اس کے بارے میں بتا دے گا اور وہ لوگ اسے سوتے میں دبوچ لیں گے۔ لیکن اسے شاید ایسا کوئی خوف نہیں تھا۔

ندیم نے محسن پر بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ اب بہر حال اسے غمینان ہو گیا تھا کہ محسن ڈیوٹی دے رہا ہے اور اسے کوئی خطرہ نہیں تھا اور شاید یہ اطمینان اسے کچھ دیر بعد اس کی بھی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ بھی سو گیا۔

ندیم کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہو گا کہ دفعۃً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے سر سے ساقی بھی جاگ گئے تھے۔ وہ غرابٹوں اور دھازنے کی آوازیں تھیں جنہوں نے سب کو جاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سب متوحش لگا ہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگے۔

جہاز کے باہر دن کا مدھم سا اجالا پھیل رہا تھا۔ محسن جہاز کے دروازے میں رائفل

کہ وہ پانڈے تھا جو اسے خواب غفلت میں پا کر اس کی جیبوں میں کاغذات تلاش کرنے آیا تھا۔

ندیم نے تین کبل اوڑھ رکھے تھے۔ پہلے ایک کبل اس کے سینے پر سے ہٹا تھا۔ پھر دوسرے دونوں کبل بھی ہٹ گئے۔ ندیم کے ذہن میں اب تک یہی بات تھی کہ پانڈے اس کی جیبوں سے کاغذات تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب ندیم کو اپنی گردن پر ہاتھوں کے لمس کا احساس ہوا تو وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ پانڈے اس کے گلے پر گرفت جما چکا تھا اور اس کے انگوٹھے اس کا زرخرہ دبا رہے تھے۔

ندیم اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن پانڈے اس کے سینے پر سوار تھا اور ندیم کے گلے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

ندیم کی سانس رُک رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہوں۔ لیکن اس کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال ابھرا..... اب یا کبھی نہیں۔ اسی ایک خیال کے تحت اس نے اپنے جسم کی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے اپنی ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ ٹانگوں کے جھینکے سے پانڈے اس کے سینے پر سے ذرا سا اچھلا تھا اس طرح ندیم کے گلے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ندیم نے اپنے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ پانڈے اس کے سینے پر سے دائیں طرف الٹ گیا۔ ندیم کی گردن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ ندیم نے ایک بار پھر پورے زور سے ٹانگ چلا دی۔ اس کے پیر کی ٹھوک پانڈے کی پشت پر لگی اور اس کے ساتھ ہی پانڈے نے جہاز کے دروازے کی طرف چھلانگ لگ دی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اٹھانچ کی آواز سن کر ندیم کے ساتھ والے بستر میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔

اسی لمحے ندیم کو کھانسی اٹھی۔ مگر اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گلا سہلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ساتھ والے بستر میں سوئی ہوئی جیکو کو جھنجھوڑ دیا۔  
 ”جیکو! گڑبڑا کر اٹھ گئی۔“

”سبک..... کون ہے..... کیا ہوا؟“ جیکو کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔



نہ نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پتھر سے اتر آیا۔ ندیم اور پانڈے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ندیم کو پانڈے پر اب بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ گزشتہ رات اس نے کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی ندیم کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

وہ لوگ جہاز کی طرف چلنے لگے۔ پانڈے سب سے پہلے تھا۔ ندیم نے جہاز کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پانڈے نے جھک کر زمین سے کوئی ہوا سا پتھر اٹھایا تھا۔ پھر اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا، پھر جیب میں ڈال لیا۔

ندیم کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں کل شام سے پہلے وہ نن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور گوتم بدھ کے مجسمے والے غار میں پوشیدہ خزانے کی کہانی سناتے ہوئے ثبوت کے طور پر اسے اپنی جیب سے چند ہیرے نکال کر دکھائے بھی تھے۔ نن اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیروں کا جائزہ لے رہا تھا کہ سفید بھیڑیے نے ان پر حملہ کر دیا اور ہیرے محسن کے ہاتھ سے گر گئے تھے۔ بھیڑیے کے چکر میں پڑ کر اس نے ندیم کو بھول گیا تھا لیکن اب پانڈے کو زمین سے کچھ اٹھا کر جیب میں لے کر دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی ہیرا ہی پانڈے کی نظروں میں آ گیا تھا۔ نن اٹھا کر اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔

ندیم کے دماغ میں سنسناء سی ہونے لگی۔ اگر پانڈے کو کسی طرح ہیروں کے بارے میں پتہ چل گیا تو یہ بڑی خطرناک بات ہوگی۔ وہ یقیناً اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

کچھ دیر بعد پانڈے بھی جہاز میں آ گیا۔ اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے ان خزانوں میں ہیرا یا ہیرے جیسی کوئی چیز ملی ہے۔ وہ اپنے بستر کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی مرتبہ عجیب سی نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھا تھا۔

جہاز کے اندر وہ تیز ہوا سے بچ گئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ کنبلوں میں سٹے بیٹھے رہے۔ اور جب جسموں میں کچھ حرارت پیدا ہوئی تو وہ جہاز میں بکھرے ہوئے خوراک کے ڈبے کھانے لگے۔ شدید سردی کی وجہ سے ڈبوں کے اندر خوراک جمی ہوئی تھی۔ وہ ڈبوں کو

سنجھالے بیٹھا بار بار گردن باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ غراہٹوں کی آوازیں بگڑتی تیز ہو گئی تھیں۔ ندیم اٹھ کر اپنی پشت کی طرف جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

ایک دلچسپ منظر اس کے سامنے تھا۔ دو جانور ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ ایک تو وہی سفید بھیڑیا تھا اور دوسرا برفانی چیتا۔ ندیم کے دوسرے ساتھی بھی کھڑکیوں سے یہ دلچسپ منظر دیکھنے لگے اور سب دل ہی دل میں بھیڑیے کی ہلاکت کی دعا مانگنے لگے جس نے کئی روز سے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ حالانکہ برفانی چیتا، بھیڑیے سے زیادہ خونخوار تھا لیکن اس وقت ان سب کی ہمدردیاں برفانی چیتے کے ساتھ تھیں وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ سفید بھیڑیے اور برفانی چیتے کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔

مگر ان سب کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بھیڑیا چیتے کے ہر حملے سے بچ رہا تھا۔ وہ چیتے سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہو رہا تھا۔ برفانی چیتا بار بار دھاڑتا ہوا بھیڑیے پر حملہ کرتا مگر بھیڑیا ہر مرتبہ صاف بچ نکلتا۔

تقریباً دس منٹ تک وہ لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ سفید بھیڑیا، چیتے کو بچاتا پھر رہا تھا۔ دفعۃً قابوس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے لپک کر رائفل اٹھائی اور اس کی نال جہاز کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی پر رکھ کر بھیڑیے کا نشانہ لینے لگا۔

وہ دونوں درندے جہاز سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر تھے اور ایک ہی جگہ پر اچھل کود کر رہے تھے۔ قابوس بھیڑیے کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھیڑیے کی اچھل کود کے ساتھ رائفل کی نال بھی دائیں بائیں حرکت کر رہی تھی۔ اور بالآخر قابوس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور قابوس کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سفید بھیڑیے کی بجائے برفانی چیتا اوپر آ گیا تھا۔ گولی چیتے کے سر میں لگی تھی اور وہ برف ڈھیر ہو گیا تھا۔ سفید بھیڑیا اچھلتا ہوا ایک طرف پتھروں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

”بچ گیا کم بخت!“ قابوس بڑبڑایا۔

وہ لوگ جہاز سے باہر آ کر مردہ چیتے کا جائزہ لینے لگے۔ گولی ٹھیک اس کی کھوپڑی میں لگی تھی جس نے اس کا بھیجا بھی اڑا دیا تھا۔ اس کے خون سے آس پاس کی برف سرخ ہو رہی تھی۔

قابوس ایک چٹان نما پتھر پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سفید بھیڑیے کا دور

ایک دوسرے پر مار مار کو ان ڈبوں سے برآمد ہونے والی خوراک سے پیٹ کی آگ بجھانے لگے۔

سورج طلوع ہوا تو دھوپ سے پوری وادی چمک اٹھی۔ وہ اگر چاہتے تو جہاز میں موجود خوراک کے سہارے یہاں کئی روز گزار سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے وہ تفریح کے لئے نہیں نکلے تھے۔ وہ آگے جاتے کی تیاری کرنے لگے۔ اس جہاز کے سامان میں ایسے بیگ بھی موجود تھے جن میں سامان بھر کر کندھوں پر لاداجا سکتا تھا۔ دو، دو کمبلوں کے علاوہ انہوں نے بیگز میں خوراک کے ڈبے بھی بھر لئے تھے۔ اور پھر وہ ایک ایک کر کے جہاز کے ڈھانچے سے نکلنے لگے۔ پانڈے اس مرتبہ بھی سب سے پیچھے تھا۔ سب لوگ جہاز سے اتر چکے تھے۔ پانڈے ایک جگہ رُک گیا۔ اسے جہاز کے فرش پر چمکتے ہوئے دو پتھر نظر آئے تھے۔ اس نے ان پتھروں کو اٹھا کر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے جیب میں ڈال لیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں رات کو ندیم نے بستر لگایا تھا۔ پانڈے کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ چمکتے ہوئے قیمتی پتھر ندیم کی جیب سے گرے تھے اور باہر سے اس نے جو پتھر اٹھایا تھا وہ بھی ندیم کی جیب ہی سے گرا ہوا گا۔

پانڈے کوئی جوہری نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک عام پتھر اور ہیرے میں پہچان کر سکتا تھا۔ اس نے کل بھیڑیے کے حملے سے پہلے محسن اور ندیم کو اس جگہ بیٹھے سرگوشیاں کرنے دیکھا تھا جہاں سے اسے پہلا ہیرا ملا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ندیم یا محسن نے کوئی خزانہ دریافت کر لیا تھا جسے دوسروں سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اور اگر واقعی کسی خزانے کا وجود تھا تو وہ گوتم بدھ کی عبادت گاہ کے غار ہی میں کسی جگہ ہو سکتا تھا۔ اسے ندیم پر زیادہ شبہ تھا جو مونی کا ساتھ غار کے کسی انتہائی اندرونی حصے میں چلا گیا تھا اور مونی کا کوئی ناگ نے ڈس لیا تھا۔ ندیم انہیں مونی کا لاش والی جگہ سے آگے نہیں لے کر گیا تھا۔ اب پانڈے سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے ندیم نے مینیوں ساپوں والی کہانی اپنے دل سے غمزہ ہو تاکہ وہ لوگ مزید آگے نہ جاسکیں اور اس کے دریافت کردہ خزانے تک نہ پہنچ سکیں۔ پانڈے کو نجانے کیوں یقین ہو چلا تھا کہ یہ ہیرے کسی خفیہ خزانے ہی کا حصہ تھے اور خزانہ گوتم بدھ والے غار ہی میں کسی جگہ پوشیدہ تھا۔

وہ جہاز سے باہر نکلا تو جچیو، قابوس اور محسن آگے نکل چکے تھے البتہ ندیم اس جگہ

بچا رہا تھا جہاں پانڈے کو پتھروں میں ہیرا پڑا ہوا ملا تھا۔ اس نے کوئی چیز اٹھا کر جیب میں بھی ڈالی تھی۔ پانڈے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا ہوا.....؟ کچھ تلاش کر رہے ہو؟“ پانڈے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اوہ..... کچھ نہیں! یونہی رُک گیا تھا تمہارے انتظار میں۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”چلو! وہ لوگ کافی دور نکل چکے ہیں۔“ پانڈے بولا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ اسے سمجھے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ندیم کو ہیروں کی تلاش تھی۔

وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ گئے۔ قابوس اپنی بان میں کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔ اس کے بول کے اکاؤ کا الفاظ ہی ندیم کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ قابوس کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی۔

”او بھائی! آہستہ گاؤ۔ کہیں وہ خوشخوار بھیڑیا تمہارے گیت کو دعوت نامہ سمجھ کر اس رف نہ آجائے۔“ محسن نے یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ لیکن قابوس نے واقعی اپنی آواز اہم کم کر دیا۔

”ہم لوگ کس طرف جا رہے ہیں؟“ نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پانڈے رُک کر کہا۔ وہ پچیس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”راستے کا تعین کیسے ہو سکتا ہے؟“ ندیم بولا۔ ”چلتے رہو! کہیں نہ کہیں تو پہنچ ہی جائیں گے۔ کوئی ایسا راستہ مل ہی جائے گا جو ہمیں کسی منزل تک پہنچا دے۔“

وہ جس راستے پر چل رہے تھے وہ بتدریج بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک تنگ سے سے گزر کر وہ ایک بار پھر کشادہ ویلی میں پہنچ گئے۔ وہ ایک چٹانی دیوار کے ساتھ نکلا۔ کشادہ راستے پر چل رہے تھے۔ یہ راستہ تقریباً بیس فٹ چوڑا تھا اور حیرت انگیز پر بالکل ہموار تھا۔ اس راستے کے ایک طرف تو چٹانی دیوار تھی اور دوسری طرف ایک بڑے کازو یہ بناتی ہوئی ڈھالان، جو نشیب میں واقع برقانی میدان کی طرف چلی گئی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ہموار سڑک پر چل رہے ہوں۔ چٹان کے ساتھ سڑک بھی بتدریج بلندی کی طرف جا رہی تھی۔

بلندی کی وجہ سے وہ بری طرح تھک گئے تھے۔ چیکو کی تو بری حالت ہو رہی

تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑاہی تھی اور کبھی ندیم اور کبھی دوسرے ساتھی اسے سہارا دے رہے تھے۔ انہیں مسلسل چلتے ہوئے تقریباً چار گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ابھی تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی جہاں کچھ دیر کوڑک سکتے۔

مزید ایک میل کا فاصلہ انہوں نے بڑی مشکل سے گرتے پڑتے طے کیا تھا۔ اب ان میں ایک قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ بالآخر انہیں چٹانی دیوار میں ایک کشادہ سی کھوہ نظر آگئی اور وہ لوگ اسی جگہ ڈھیر ہو گئے۔ یہاں تیز ہوا سے بھی بچت ہو گئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ اس کھوہ میں بے سدھ سٹے سٹے سے پڑے رہے۔ ان پر اس قدر تھکن طاری تھی کہ کسی میں بولنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اور بالآخر جب حوالہ بحال ہوئے تو سب سے پہلے چیکو ہی نے زبان کھولی تھی۔

”سب نکلیں گے ہم اس جہنم سے۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ مایوسی تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ ہم لوگ زندگی بھر اس سرد جہنم میں بھٹکتے رہیں گے اور بالآخر چاروں طرف بکھری ہوئی یہ برف ہمیں ختم کر دے گی۔“ محسن نے جواب دیا۔

”ایسی باتیں مت کرو۔“ قابوس نے کہا۔ ”ہمارا مذہب مایوسی کی اجازت نہیں دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ضرور مل جائے گا جو ہمیں کسی بستی تک دے گا۔“



”صبر و برداشت کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔“ محسن بولا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم دگ پاگل نہ ہو جائیں۔ یہ سردی ہمارے دماغ منجمد نہ کر دے۔“

”میرا خیال ہے ہم سب پر تھکن سوار ہو چکی ہے اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا جائے۔ شاید ہمارے حواس ٹھکانے آجائیں اور ہم ایسی مایوسانہ اور بہکی بہکی باتوں سے بچ جائیں۔“ قابوس نے کہا اور اپنے بیگ میں سے ایک ڈبہ نکال لیا۔

بھوک تو واقعی سب کو لگ رہی تھی۔ انہوں نے بھی خوراک کے ڈبے نکال لئے اور انہیں پتھروں سے توڑ کر ان سے برآمد ہونے والی خوراک سے پیٹ بھرنے لگے۔

قابوس کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد انہوں نے مایوسانہ باتیں سوچنا چھوڑ دی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ اس جگہ قیام کرنے کے بعد انہوں نے اپنے اپنے بیگ کندھوں پر لا دے اور کھوہ سے نکل کر آگے روانہ ہو گئے۔

”لگتا ہے یہ کوئی باقاعدہ سڑک ہے اور کسی زمانے میں یہاں بسیں چلا کرتی تھیں۔“ قابوس نے کہا۔ اس کا مقصد مذاق کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

”بسیں نہیں، ٹرامیں کہو۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”ہاں! شاید ٹرام ہی چلتی ہوگی۔ اس کی پٹری غالباً کوئی اکھاڑ کر لے گیا ہو گا۔ لوہا تو پانے زمانے میں بھی کارآمد ہی رہا ہو گا۔ آج کل جیسے بڑے شہروں میں گٹروں کے ڈھکنے چرالے جاتے ہیں اُس زمانے میں بھی سب کچھ ہوتا ہو گا۔“ قابوس نے جواب دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی کباڑیے ہی سب سے زیادہ دولت مند ہوں گے۔“ یہ بات محسن نے کہی تھی۔

قابوس نے مذاق میں اس سڑک پر بسوں کے چلنے والی جوابات کہی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ اب سب ہی لوگ اس گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ لہذا ان کے ذہنوں پر

طاری جمود ختم ہو گیا تھا اور اب انہیں راستہ طے کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ وہ لوگ چلتے چلتے بالآخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ راستہ اچانک ہی ختم ہو گیا تھا۔ آگے بہت گہرا کھڈ تھا اور دوسری طرف کی چٹان تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ ندیم نے کھڈ میں جھانک کر دیکھا۔ کھڈ بچاس فٹ گہرا تھا اور نیچے قد آور جھاڑیاں اور پودے نظر آرہے تھے۔ جس جگہ وہر کے تھے وہاں بھی جھاڑیاں موجود تھیں۔

ندیم کھڈ کے کنارے پر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جس چٹان پر وہ کھڑے تھے اس کے دائیں طرف تقریباً تین فٹ چوڑی ایک نگر سی بنی ہوئی تھی۔ یہ نگر چٹان کے ساتھ ایک کارنر کی طرح باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی۔

”اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔“ پانڈے نے اس نگر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”یا تو ہم واپس جا کر کوئی اور راستہ تلاش کریں یا اس نگر پر سے ہو کر چٹان کی دوسری طرف پہنچنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے اس طرف سے سامنے والی چٹان تک جانے کا کوئی راستہ موجود ہو۔“

”لیکن یہ راستہ بہت تنگ سا ہے۔ اس پر چلنا مشکل ہو گا۔ اگر کوئی پتھر پیر کے نیچے سے نکل گیا تو جانتے ہو کیا حشر ہو گا؟“ محسن بولا۔

”رسمک تو لینا ہی پڑے گا۔ میں اس نگر پر سب سے آگے چلنے کو تیار ہوں۔“ پانڈے نے کہا۔

”ہم لوگ تو پتہ نہیں کب سے اپنی زندگیاں داؤ پر لگائے ہیں۔ وہ خوش قسمت تھے جو زندگی کی بازی ہار کر نجات پا گئے۔ چلو.... آگے بڑھو! شاید کسی اور کو بھی زندگی کی اس اذیت سے نجات مل جائے۔“ محسن نے کہا۔

پانڈے آگے بڑھا مگر ندیم نے اسے روک لیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر نگر پر پیر رکھ دیا اور دونوں ہاتھ چٹانی دیوار پر جما کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ چٹان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں۔ وہ ان جھاڑیوں کو بھی سہارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رُک گیا اور اس نے پانڈے کو اشارہ کیا۔ پانڈے نے بھی نگر پر پیر رکھ دیا۔ اسے آتے دیکھ کر ندیم پھر آگے بڑھنے لگا۔ مزید

پانڈے کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کشادہ جگہ پر پہنچ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پانڈے کا اندازہ درست تھا۔ اس طرف اس کھڈ کی چوڑائی کم تھی۔ ندیم کے اندازے کے مطابق یہ چوڑائی چند فٹ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لیکن کھڈ کے دونوں کناروں پر بوئے قد والے درخت تھے۔ زمین پر پڑے ہوئے پھل دیکھ کر ندیم کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ انجیر کے درخت تھے۔ اس نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا۔ اس رف ڈھلان تھی اور ڈھلان پر بہت سے درخت نظر آرہے تھے۔ وہ پھر کھڈ کے کنارے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ تقریباً چھ فٹ چوڑے اس کھڈ کو چھلانگ لگا کر پار کرنا ممکن بن تھا۔ البتہ دونوں کناروں پر درختوں کی بعض موٹی شاخیں آپس میں اس طرح الجھی لی تھیں کہ ان شاخوں پر لنگ کر دوسری طرف پہنچا جاسکتا تھا۔

اس نے پانڈے کی طرف دیکھا جو نگر کے آخری حصے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیچھے جیکو جس کا چہرہ خوف سے کچھ اور زرد ہو گیا تھا۔ جیکو کے پیچھے محسن اور سب سے آخر میں وہ تھا۔

مگر والا مرحلہ بخوبی طے ہو گیا تھا۔ وہ لوگ درختوں کی شاخوں کے سہارے اس کھڈ کو رکنے کے سلسلے میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر ندیم ہی نے یہاں بھی پہل کی۔ وہ ایک شاخ پر ہاتھ جما کر لنگ گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ آدھا راستہ طے کرنے بعد اس نے دوسری طرف والے درخت کی شاخ پکڑ لی۔ درختوں کی شاخوں میں چلک

وہ آہستہ آہستہ جھولتا ہوا دوسری طرف بڑھتا رہا اور بالآخر دوسری چٹان پر پہنچ گیا۔ ندیم کے ساتھیوں نے اپنے اپنے بیگ کندھوں سے اتار کر ندیم کی طرف اچھال دیے۔ سب بیگ دوسرے کنارے پر گرے مگر جیکو کا بیگ چٹان کے کنارے سے ٹکرا کر ٹھکڑا ہوا۔ ندیم کے بعد محسن نے جیکو کو سہارا دے کر درخت کی شاخ سے لٹکا دیا۔ خوف موت سے جیکو کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا تھا اور وہ لٹکی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے جسم کی تمام تر قوت ہاتھوں میں سمٹ گئی۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ اگر اس کا ہاتھ درخت کی شاخ سے پھسل گیا تو کھڈ میں گر کر اس کی جان کا سرمہ بن جائے گا۔ لیکن اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ وہ خیریت سے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد پانڈے اور محسن بھی آگئے۔ آخر میں قابوس تھا۔

وہ ان سب میں قدرے بھاری بھر کم تھا۔

کھڈ کے وسط میں آکر قابوس نے دوسری طرف والے درخت کی شاخ پکڑ لی۔ وہ شاخ اس کے بوجھ سے کچھ زیادہ جھکی تھی اور اس کے ساتھ ہی چرچاہٹ کی ایک مخصوص آواز ابھری تھی جسے سن کر قابوس کے دماغ میں تیز سنناٹا ہونے لگی تھی۔

چرچاہٹ کی یہ آواز ندیم وغیرہ نے بھی سن لی تھی۔ ان کے چہرے بھی دھواں ہو گئے۔ اس آواز سے ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ قابوس کے بوجھ سے وہ شاخ ٹوٹ رہی تھی۔ وہ شاخ اپنے مرکزی تنے سے اکھڑ رہی تھی اور قابوس آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جارہا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

”قابوس!“ محسن چیخا۔ ”اس دوسری شاخ کو پکڑ لو... دائیں طرف۔“

قابوس نے ایک ہاتھ سے دوسری شاخ کو پکڑنا چاہا مگر پھٹیلی پسینے سے تر تھی۔ اس شاخ پر گرفت نہیں جم سکی۔ اسی لمحہ کڑک کی زوردار آواز ابھری۔ شاخ اپنے تنے سے الگ ہو گئی تھی اور قابوس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ سیدھا موت کی آغوش میں جا رہا ہے۔

چٹان سے نکلے ہوئی ایک جھاڑی اچانک ہی قابوس کے ہاتھ میں آگئی۔ قابوس نے بالکل غیر ارادی طور پر اس جھاڑی کو گرفت میں لے لیا اور پھر دوسرا ہاتھ بھی جھاڑی پر دیا۔ درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ چٹانی دیوار کے ساتھ الجھتی شور مچاتی نیچے جا رہی تھی۔

قابوس نے نیچے دیکھا اور پھر سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ وہ جھاڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا اور ٹانگوں کو حرکت دیتے ہوئے پیروں کو چٹان

دیوار پر کسی جگہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا پیر باہر کی طرف ابھرے ہوئے ایک پتھر پر جم گیا۔ اس نے دوسرا پیر بھی ایک پتھر پر جمالیا اور اوپر والی جھاڑی کو مضبوطی سے پکڑے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت اس جھاڑی

پر جم کر مڑ رہا تھا۔ اگر وہ جھاڑی اپنی جگہ سے اکھڑ گئی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت موت کے میں جانے سے نہیں روک سکے گی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے اندازے

مطابق وہ تقریباً دس فٹ نیچے آگیا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے جو کنارے پر لیٹے نیچے جھٹک رہے تھے۔ قابوس کو یوں لگا جیسے اس کے ساتھی

کی بلند یوں پر کھڑے نیچے جھٹک رہے ہوں اور وہ خود تخت الثریٰ میں ہو۔

”قابوس!“

قابوس کو ندیم کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”میں ایک جھاڑی سے اٹکا ہوا ہوں مجھے باہر نکلنے کی تدبیر کرو۔“ قابوس چیخا۔

اس کی آواز ندیم اور اس کے ساتھیوں نے سن لی۔ ندیم نے جلدی سے اپنا نیک کھول

کر اس میں سے بستر کی ایک چادر نکالی۔ یہ چادر اس نے کمبلوں کے ساتھ جہاز کے ڈھانچے

سے اٹھائی تھی۔ چادر کافی مضبوط تھی۔ وہ دو دو بانشت کی چوڑی پٹیاں پھاڑنے لگا۔ محسن اور

بائے ان بیٹوں کو گرہیں دے کر آپس میں باندھ رہے تھے۔ چاروں بیٹوں کی لمبائی میں

بائیں فٹ کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔ انہوں نے رسی کی طرح بل دے کر دونوں کناروں پر

گراہیں لگا دیں تاکہ بل نہ کھل سکیں۔

ندیم ایک بار پھر سینے کے بل کھڈ کے کنارے پر لیٹ کر قابوس کو آوازیں دینے لگا۔

دوباب میں قابوس کی آواز سن کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ قابوس کس طرف ہو سکتا ہے

یونکہ جھاڑیوں کی وجہ سے قابوس اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

”قابوس!“ ندیم نے چیخ کر کہا۔ ”میں رسی لٹکا رہا ہوں۔ اسے پکڑ لینا۔ ہم تمہیں اوپر

ٹھیکس گئے۔“

وہ چادر کی بیٹوں سے بنائی ہوئی رسی کھڈ میں لٹکانے لگا۔ جھاڑیوں کی وجہ سے رسی کو

نیچے تک پہنچانے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ندیم جھٹکے دے دے کر رسی کو نیچے

جا رہا تھا۔ اور بالآخر اسے یوں محسوس ہوا جیسے قابوس نے رسی پکڑ لی ہو۔

ندیم کا خیال درست تھا۔ قابوس نے ایک ہاتھ جھاڑی پر جمائے رکھا اور دوسرے ہاتھ

رسی کو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اس نے رسی کو اتنا کھینچ لیا کہ وہ رسی سے اپنے گرد ایک بل دے

دیا۔ اس نے رسی کو کمر پر پلیٹ کر بٹلوں کے نیچے سے نکال لیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب کھینچو اوپر۔“ قابوس نے اوپر کی طرف رخ کر کے چیخ کر کہا۔ اس

رسی کا سر اوپر اتارنے میں دبا لیا اور دونوں ہاتھوں سے رسی کو کچھ اوپر سے مضبوطی سے پکڑ

کر لیا اور محسن وغیرہ رسی کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنے لگے۔ اور بالآخر تین منٹ بعد وہ

کوباہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ قابوس زمین پر لیٹا لے لے سانس لینے لگا۔ اس

بازارت کا نجانے کون سا وقت تھا کہ ندیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے غار میں ادھر ادھر  
سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر سو رہے تھے مگر پانڈے نہیں تھا۔ ممکن ہے چوکیداری کی  
نہایتی ہو اور وہ غار کے باہر بیٹھا چہرہ دے رہا ہو۔ ندیم اپنے کمرے سے نکل کر بڑی

”آج پہلی بار تجربہ ہوا ہے کہ زمین واقعی گول ہے۔“ محسن نے مسکراتے ہوئے اور بیگ کندھے سے اتار کر زمین پر پھینک دیا اور نیکی کی طرح اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سب لوگ اپنے اپنے بیگ پھینک کر ڈھیر ہو گئے۔ ان کے چہروں پر ایک بار بھرنا عود کر آئی تھی۔ قسمت انہیں دوبارہ اسی جگہ لے آئی تھی جس جگہ سے وہ تین دن پہلے

اور جب اس سرنگ کے اختتام پر وہ ایک کشادہ جگہ پر پہنچا تو نارچ کی روشنی میں اسے یہ  
سمجھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ایک اور کشادہ غار میں پہنچ گیا تھا۔ یہ غار گوتم بدھ کے مجسمے والے  
بڑے چھوٹا تھا۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اس غار کے سامنے والی دیوار میں بھی ایک سرنگ تھی۔ وہ اس سرنگ میں داخل ہو  
کر سرنگ بھی بل کھاتی ہوئی اس دیوار پر ختم ہو گئی تھی۔ یہ چٹانی دیوار تقریباً چار فٹ  
بلندی تھی۔ اس سے اوپر چھت تک خلا تھا۔ ندیم اس دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف بھی  
بل غار تھا۔ وہ دیوار سے دوسری طرف کود گیا۔ آگے ایک بہت تنگ سی دراڑ تھی اور وہ  
دیوار سے رگڑ کھاتا ہوا چل رہا تھا۔

تقریباً پندرہ گز آگے جا کر یہ دراڑ کشادہ ہو گئی تھی۔ ندیم کو یہ بھی خوف تھا کہ وہ  
وہاں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جائے۔ لیکن اس خوف کے باوجود وہ آگے بڑھتا  
اس غار کا ایک موڑ گھومتے ہی اس نے نارچ بجھادی اور بہت دے قدموں آگے  
بڑھ گیا۔ اس نے غار کے کسی حصہ میں کوئی ہلکی سی آہٹ سنی تھی جس سے وہ محتاط ہو گیا  
۔ پھر گز کے بعد غار کا ایک اور موڑ آیا۔ وہ اس موڑ پر رک گیا۔ دوسری طرف اسے کسی  
ہلکی ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی لیکن وہ جھانکنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔

وہ تقریباً دس منٹ تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی جو بتدریج معدوم  
ناپید ہو گئی۔ اب دوسری طرف روشنی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ قدموں کی آواز بھی  
غائب ہو چکی تھی۔ ندیم سرنگ سے نکل آیا۔ اور جب اس نے نارچ جلائی تو حیرت سے  
دیکھا۔ وہ اس غار میں کھڑا تھا جہاں پتھر کے بہت بڑے حوض میں وہ خزانہ بھرا ہوا تھا۔  
ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پانڈے اس خزانے تک پہنچ گیا تھا اور اب وہ واپس جا  
رہا تھا۔ ندیم کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ اسی راستے پر چل رہا تھا جہاں سے وہ مونیکا  
تھیں۔ اس خزانے تک پہنچا تھا۔

اس نے نارچ بجھادی تھی۔ وہ اسی راستے سے پہلے بھی آچکا تھا اس لئے بھٹکنے کا کوئی  
شک نہیں تھا۔ وہ چٹان کی دیوار کو ٹوٹا ہوا دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر ایک  
پہنچ کر وہ رُک گیا۔ دوسری طرف ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی جو اس جگہ پانڈے کی  
لٹکان کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔

آہستگی سے غار کے دہانے پر آگیا۔ باہر برف کی سفیدی میں تاریکی کا احساس نہیں ہو رہا تھا  
لیکن پانڈے اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ دوبارہ غار میں آگیا اور محسن کو آہستگی سے جگہ  
کر غار کے دہانے پر آگیا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم لوگ محض اتفاق سے دوبارہ اس جگہ پہنچے ہیں؟“ ندیم نے سرگوشی  
کی۔

”اور کیا کہا جاسکتا ہے؟“ محسن نے جواب دیا۔  
”لیکن میں اسے اتفاق ماننے کو تیار نہیں۔ ہمیں مس گائیڈ کر کے یہاں لایا گیا ہے اور یہ  
حرکت پانڈے کی ہے۔ آج سارا دن وہی ہماری رہنمائی کرتا رہا تھا۔“ ندیم نے جواب دیا۔  
”اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟“ محسن نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
”اسے غالباً مجسمے والے غار میں پوشیدہ خزانے کے بارے میں شبہ ہو گیا ہے۔“ ندیم  
نے کہا اور پھر اسے ہیرے کے بارے میں بتانے لگا جو اس نے پانڈے کو اٹھاتے دیکھا تھا۔  
”اس رات اس نے میرا گلا گھونٹ کر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اور مجھے یقین  
ہے کہ اس نے ہماری باتیں بھی سن لی ہوں گی اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس  
وقت مجسمے والے غار کے اندر خزانے کی تلاش میں گیا ہو گا۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں بھی اس  
کے پیچھے جا رہا ہوں۔ اگر وہ آجائے تو کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے اسے شبہ ہو جائے۔  
بس یہی کہہ دینا کہ آنکھ کھل گئی تھی۔ میرے بارے میں پوچھتے تو کہہ دینا کہ میں.....“  
ندیم نے چھوٹی انگلی اٹھادی۔

ندیم نے اپنے بیگ میں سے نارچ نکال لی اور غار سے باہر آگیا۔ وہ غار زیادہ دور نہیں  
تھا جو گوتم بدھ کے مجسمے والے غار تک جانے کا راستہ تھا۔ اسے غار میں داخل ہو کر صرف  
ایک مرتبہ نارچ جلانا پڑی تھی۔ وہ نارچ بجھا کر راستہ ٹوٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

ندیم کا خیال تھا کہ یہ غار اسے سیدھا اس جگہ لے جائے گا جہاں سے اسے کود کر بننے  
والے غار میں داخل ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ غار کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا  
تھا۔ اس غار میں کئی موڑ آئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر نارچ روشن کر لی اور ادھر ادھر  
دیکھنے لگا۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس سے وہ غار سے باہر آگئے تھے لیکن بہر حال وہ اس غار میں  
آگے بڑھتا رہا۔

”میرا خیال ہے اب تمہاری ڈیوٹی کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ ویسے تو تمہارے بعد شاید تاپوس کا نمبر ہے۔ مگر اسے سونے دو، اور تم دونوں بھی جا کر سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔“ ندیم نے کہا۔

وہ دونوں اٹھ کر غار کے اندر چلے گئے تھے۔ ندیم چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اس نے محسن سے رات بھر بھی لے لی تھی، گمبل بھی لپیٹ لیا تھا۔ شدت کی سردی تھی۔ ندیم نے گمبل اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ ہوا کے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اونی ٹوپی اور منظر سے سر، گردن اور چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ سردی سے بچاؤ کا اتنا انتظام ہونے کے باوجود سردی اسے ہڈیوں کے گودے تک میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد اُفق پر روشنی پھیلنے لگی۔ ندیم ایک پہاڑی کی چوٹی پر چھائے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھنے لگا۔ صبح کی طلوع ہوتی ہوئی روشنی میں روئی کے گالوں کی طرح پہاڑی کی چوٹی پر بکھرے ہوئے یہ بادل بہت بھلے لگ رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سورج نکل آیا۔ سورج اس پہاڑ کے عقب سے طلوع ہوا تھا جس کے غار کے دہانے پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ دھوپ سامنے کی پہاڑیوں پر پڑ رہی تھی۔ برف کی جگہ سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

دس منٹ بعد غار کے اندر آہٹ سن کر ندیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ پانڈے تھا جو گمبل لپیٹے باہر آ رہا تھا۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رات کا باقی حصہ پانڈے نے جاگ کر گزارا تھا۔ اگر وہ سویا ہوتا تو اس کے خراٹوں کی آواز ضرور سنائی دیتی۔ یہی اس کی پہچان تھی کہ وہ نیند میں سب سے زوردار خراٹے لیتا تھا۔ لیکن ندیم نے اس کے خراٹوں کی آوازیں نہیں سنی تھیں اس کا مطلب تھا کہ اس نے رات کا باقی حصہ جاگ کر گزارا تھا۔

ندیم کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ پانڈے غار کے اندر سے بہت سارے ہیرے جیہوں لے کر بھر کر لایا ہو گا اور ان ہیروں ہی کی وجہ سے وہ جاگتا رہا تھا۔ لیکن ندیم کو ایک بات پر حیرت تھی کہ پانڈے نے موزیکا کی لاش کا کیا، کیا تھا۔ ظاہر ہے ان کی عدم موجودگی میں اونی اور تو اس غار میں جا نہیں سکتا تھا۔ اس پرانے میں تو وہ اپنے علاوہ کسی اور انسان کی موت دیکھنے کو ترس گئے تھے۔ موزیکا کی لاش کو کون غائب کر سکتا تھا۔ اب پانڈے ہی اس

اس مرتبہ ندیم کو تقریباً پندرہ منٹ وہاں رُکنا پڑا۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ پانڈے وہاں سے جا چکا ہے تو وہ موڑ گھوم کر سامنے آ گیا۔

ندیم غار میں گھومتا ہوا جب اڑدھے والے مجسمے کے قریب پہنچا تو وہ اُچھل پڑا۔ موزیکا کی لاش وہاں سے غائب تھی۔ وہ نارج کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ موزیکا کی لاش کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ندیم تنگ سی سرنگ میں سینے کے بل رینگتا ہوا بدھ کے مجسمے والے غار میں آیا۔ وہ گہری تاریکی میں کھڑا کسی قسم کی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ دو منٹ گزر گئے۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ غار میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے تو اس نے نارج روشن کر لی۔ کچھ دیر تک وہ نارج کی روشنی میں غار کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر چٹانی دیوار پر واقع قدرے بلندی پر اس سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھنے لگا جس کے ذریعے وہ پہلے بھی اس غار سے باہر نکلے تھے۔

سرنگ سے باہر آ کر وہ کچھ دیر تک ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا دھردھ دیکھتا رہا۔ نارج اس نے غار سے نکلنے سے پہلے ہی بجھا دی تھی۔ وہ پتھروں کی آڑ لیتا ہوا بڑی احتیاط سے ڈھلان اُترنے لگا۔ اور پھر تقریباً نصف میل کا چکر لگا کر وہ بالکل مخالف سمت سے اس غار کی طرف آ گیا جہاں انہوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

محسن اور پانڈے غار کے دہانے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسے اپنی طرف آنے والے کچھ کر دونوں ہوشیار ہو گئے تھے۔ ندیم نے بھی دور ہی سے کھانسنے کی آواز سنی تھی۔ آگاہ کر دیا تھا۔

”تم اس شدت کی سردی میں کہاں مٹر گشت کر رہے ہو بھائی؟“ پانڈے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ندیم نے چھوٹی انگلی اٹھا دی۔ ”جب سے طیارے کے ڈھانچے سے ملنے والے ڈیول خوراک کھا رہے ہیں پیٹ میں گڑبڑ ہنے لگی ہے۔“

”اپنا بھی یہی حال ہے۔“ پانڈے نے جواب دیا۔ ”میں بھی تھوڑی دیر پہلے اس طرف نکل گیا تھا۔“ پانڈے نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ اسے بالکل یہ شبہ نہیں ہو سکا تھا کہ ندیم بدھ کے مجسمے والے غار میں اس کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔



غار میں داخل ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے لاش غار کے اندر کھڈ میں دھکیل دی ہو۔  
”ندیم جی!“

”اوہ!“ ندیم پانڈے کی آواز سن کر اپنے خیالات سے چونک گیا۔

”اب تو لگتا ہے کہ ہم لوگ کہیں واقعی پاگل نہ ہو جائیں۔ اس ویرانے سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہئے۔“ پانڈے نے کہا۔

”تو تمہارا خیال ہے کہ ہم یہاں پنک منار ہے ہیں؟“ ندیم نے اسے گھورا۔ ”ہم جو مقصد لے کر آئے تھے وہ پورا نہیں ہوا۔ نہ طیارے کا پتہ چلا اور نہ ہی اس کے مسافروں کا۔ اس کے برعکس ہماری ٹیم کے سات آدمی برف کے اس جہنم کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب ہم پانچ رہ گئے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ ہم میں سے کسی کو دوبارہ انسانوں کی بستی میں پہنچنا نصیب ہوتا ہے یا ہم بھی اس سرد جہنم میں بھستے ہوئے ختم ہو جائیں گے۔“

”ایسا مت بولو ندیم بھائی.....“ پانڈے بولا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا ہو گا۔“

”ہاں! کوئی نہ کوئی راستہ تو تلاش کرنا ہی ہو گا۔“ ندیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

اتنے میں قابوس بھی اٹھ کر آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔ تھوڑی دیر بعد چیکو اور محسن بھی بیدار ہو گئے اور اس کے ایک گھنٹے بعد وہ لوگ وہاں سے چل پڑے۔ اس مرتبہ انہوں نے بالکل سامنے نشیب میں پھیلی ہوئی وادی کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وسیع و عریض وادی کے دوسری طرف پہاڑوں پر افق کو چھوتی ہوئی ایک سیاہ لکیر سی نظر آرہی تھی۔ ندیم کو یقین تھا کہ وہ درخت تھے۔ اگر وہ ان پہاڑوں تک پہنچ جائیں تو ممکن ہے دوسری طرف انہیں بستی نظر آجائے یا کسی بستی کی طرف جانے والا کوئی راستہ مل جائے۔

وہ اس برف پوش وادی میں چلتے رہے۔ دوپہر کو صرف ایک گھنٹہ کے سنے کے تھے۔ شام سے ذرا پہلے وہ ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ جھیل کی سطح پر شیشے کی طرح چمکتی ہوئی برف کی تہہ جی ہوئی تھی..... وہ پہاڑ اب بھی میلوں دور نظر آرہے تھے۔ انہوں نے جی ہوئی جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات گزارنے کے بعد صبح ہوتے ہی وہ چل پڑے اور شام کے وقت کسی حادثے کے

بغیر بلند پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں انہیں ایک کھوہ مل گئی۔ انہوں نے اسی کھوہ کے اندر پڑاؤ ڈال دیا۔ شام کا اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ وہ مہربند خوراک کے ذبے نکال کر پیٹ پوجا کرنے لگے۔ ندیم نے تلے ہوئے مٹروں والا ایک ڈبہ چیکو کی طرف بڑھا دیا۔

”مجھے نہیں چاہئے یہ خیرات!“ چیکو نے چیختے ہوئے ڈبہ پھینک دیا۔ اگر قابوس پھرتی ہے ایک طرف نہ جھک جاتا تو ڈبہ اس کے منہ پر لگتا۔ ”کب تک تم لوگوں کے رحم و کرم پر زندہ رہوں گی۔ تم لوگوں نے مجھے اپنا قیدی کیوں بنا رکھا ہے؟ مجھے جانے دو۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”کیا کہہ رہی ہو چیکو؟“ ندیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ویرانے کی دہشت رنگ لانے لگی تھی۔ وہ کئی روز سے اس برف پوش ویرانے میں تنہا رہے تھے۔ اور بالآخر چیکو کے اعصاب بکھر گئے تھے۔ ”تمہیں کس نے قیدی بنا رکھا ہے؟ اور تم اپنے آپ کو ہمارے رحم و کرم پر کیوں سمجھتی ہو؟ ہم تمہارے دوست ہیں۔ سب بھگ گئے ہیں اور گھر جانے کا راستہ ہی تو تلاش کر رہے ہیں۔“

”نہیں..... تم لوگوں نے مجھے اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔ تم لوگ انسان نہیں، وحشی ہو۔ میں گھر جاؤں گی اور ابھی جاؤں گی۔“ چیکو نے کہا اور اٹھ کر چیختی ہوئی غار سے باہر نکل گئی۔

وہ چاروں چند لمحے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر چاروں اٹھ کر ڈبے کے پیچھے لپکے۔ چیکو غار سے نکل کر چیختی ہوئی نشیب کی طرف دوڑ رہی تھی اور وہ ان سے تقریباً پچاس گز آگے نکل چکی تھی۔ وہ چاروں اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

ندیم کو اندیشہ تھا کہ وہ کہیں چٹانوں کی طرف نہ نکل جائے۔ اگر وہ چٹانوں میں پہنچ کر انہوں سے اوچھل ہو گئی تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا اور وہ سردی سے ٹھٹھڑ کر مر جائے گی۔

دفعۃً چیکو کو ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گری اور ڈھلان میں برف پر لڑھکنے لگی۔ وہ ال دوڑ رہے تھے۔ محسن دبا دپتا ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا۔

بالکل ٹھیک ٹھاک باتیں کرتے دیکھ کر قابوس کے چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔  
وہ لوگ خود بھی کھانے لگے۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جارہے تھے۔ لیکن کسی نے جیکو کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے بھاگی تھی اور اسے بڑی مشکل سے قابو کیا گیا تھا۔ ندیم کے خیال میں جیکو کے دماغ کو دیوانگی کا ایک جذبہ کا سالگا ہو گا۔ لیکن وہ سنبھل گئی تھی۔

یہ صورت حال ان کے لئے خطرناک تھی۔ جیکو کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ اس کی قوت برداشت ختم ہو رہی تھی۔ اسی قسم کی دیوانگی کا دوسرا جھکا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

جیکو نے مچھلی کے چند ہی ٹکڑے کھائے تھے اور پھر لیٹ کر سو گئی تھی۔ دو کمبل اس کے نیچے بچھے ہوئے تھے اور چار کمبل اس کے اوپر تھے۔ ان لوگوں کے پاس دو کمبل ہی نیچے تھے۔ ایک کمبل قابوس اور پانڈے نے اوڑھ لیا اور دوسرا کمبل محسن اور ندیم نے مل کر لپیٹ لیا۔ دو دن سے نہ تو انہوں نے بیڑیے کی آواز سنی تھی اور نہ ہی اسے دیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بیڑیا کسی اور طرف نکل گیا ہو گا۔ اس لئے انہوں نے آج رات پہرے داری کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر جو سوئے تو ان کی آنکھ صبح کو بھی کھلی تھی۔

لیکن جب وہ غار سے باہر نکلے تو انہیں ایک اور خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ برف باری کا موسم نہیں تھا۔ ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی برف تو وہ تھی جو برف باری کے موسم میں تہہ در تہہ جمع ہو گئی تھی۔ اور اب تو برف پگھلنے کا موسم آ رہا تھا۔ البتہ بارش کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اگر بارش ہو گئی تو ان کے کہیں نہ جانے کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔

وہ لوگ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں سے چل پڑے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں چٹانوں میں ایک ایسا راستہ مل گیا تھا جو زیادہ دشوار گزار نہیں تھا۔ وہ اس پگڈنڈی نما راستے پر مسلسل بلندی کی طرف جاتے ہوئے دل ہی دل میں بارش نہ ہونے کی دعا مانگتے رہے۔ تقریباً تین گھنٹے مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ آدھے گھنٹے کے لئے ر کے اور پھر چلنے لگے۔ جیکو کے پاس اگرچہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ مگر ندیم اسے سہارا دیے ہوئے تھا اور

وہ ان سے کئی گز آگے نکل چکا تھا۔ اور پھر وہی سب سے پہلے جیکو کے قریب پہنچا تھا۔ محسن نے چھلانگ لگا کر جیکو کو عین اس وقت روک لیا تھا جب وہ اس ڈھلان سے تقریباً بیس فٹ نیچے ایک دوسری ڈھلان پر گرنے والی تھی۔

قابوس اور ندیم وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ وہ چاروں جیکو کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر جیکو بری طرح چلا رہی تھی۔ اس کی چیخیں ویرانے میں گونج رہی تھیں۔ لیکن بالآخر وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔

جیکو بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اسے اٹھا کر غار تک لاسکے تھے۔ ان چاروں نے اپنا ایک ایک کمبل نکال لیا۔ وہ کمبل غار کے فرش پر بچھا کر جیکو کو لٹا دیا اور باقی دو کمبل اس کے اوپر ڈال دیئے۔

وہ سب پریشان تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ جیکو پاگل نہ ہو گئی ہو اور یہ برف پوش ویرانہ کہیں انہیں بھی پاگل نہ کر دے۔ ندیم، پانڈے کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ پانڈے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہیں یہ ویرانہ ان سب کو پاگل نہ کر دے۔

تھکن اور بھوک سے ان کی بری حالت تھی لیکن جیکو کی صورت حال نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ وہ کچھ کھائے بغیر چٹان کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ ندیم، جیکو کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جیکو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ندیم نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔

”کیا ہوا..... تم لوگ اس طرح خاموش کیوں بیٹھے ہو؟“ جیکو نے پوچھا۔  
”میری طبیعت.....؟“ جیکو کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”میں ٹھیک تو ہوں۔ کیا ہوا تھا مجھے؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔ اٹھو..... کچھ کھا لو..... تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔“ ندیم بولا۔

”بھوک؟ ہاں! مجھے بھوک لگ رہی ہے اور میں بہت تھک گئی ہوں۔“ جیکو نے کہا۔  
”مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”کچھ کھا لو۔ پھر سو جانا۔“ ندیم نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔  
قابوس نے اپنا ڈبہ جیکو کی طرف بڑھا دیا۔ اس میں تلی ہوئی مچھلی کے پیس تھے۔ جیکو کو

ہاتھ سے پکڑے تقریباً کھینچتا لئے جا رہا تھا۔

بادلوں کی وجہ سے فضا میں شام ہونے سے پہلے ہی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اندھیرے میں سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں ایک غار مل گیا۔

غار میں داخل ہو کر ندیم نے جائزہ لینے کے لئے نارچ جلائی۔ نارچ کے سیل کمزور ہو گئے تھے۔ روشنی مدہم تھی۔ روشنی کا دائرہ غار میں رینگتا ہوا ایک جگہ رُک گیا اور اس کے ساتھ ہی ندیم کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

وہ غار کا کونہ تھا جہاں تین بڑے بڑے پتھر رکھ کر چولہا بنا ہوا تھا اور اس چولہے میں جلی ہوئی لکڑیاں اور کونکے پڑے ہوئے تھے۔ لکڑیوں اور کونکوں پر اگرچہ گرد جمی ہوئی تھی لیکن یہ جلی ہوئی لکڑیاں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں کہ یہاں ان سے پہلے انسان کے قدم پہنچ چکے تھے اور غالباً ان لکڑیوں کو جلے ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ جلی ہوئی لکڑیوں کو دیکھ کر ان سب کے چہروں پر رونق سی آگئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ کسی صحیح راستے پر آگئے تھے اور یہ راستہ انہیں ضرور انسانوں کی کسی بستی تک لے جائے گا۔

غار میں ایک طرف بہت سی خشک لکڑیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ندیم نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا اور قابوس کے ساتھ مل کر کچھ لکڑیاں پتھروں سے بنے ہوئے چولہے پر جمع کر لیں۔ ان کے نیچے کچھ تیلی لکڑیاں اور جھاڑیاں وغیرہ ڈال دیں اور اپنے بیگ میں سے ماچس تلاش کرنے لگا۔ بڑی جستجو کے بعد اسے بالآخر بیگ میں ماچس مل ہی گئی۔ اس نے تیلی جلائی اور پتھروں کے چولہے پر رکھی ہوئی لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ یہ لکڑیاں نہ جانے کب سے اس غار میں پڑی تھیں۔ بے حد خشک تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔

لکڑیوں کے جلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد غار کی فضا میں حرارت بڑھ گئی۔ غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ آگ کی گرمی نے فوراً ہی درجہ حرارت تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے جسموں پر لپٹے ہوئے کبل وغیرہ اتار کر ایک طرف ڈال دیئے اور آگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ ندیم بار بار جھیکو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ ندیم کو خوشی اس بات کی تھی کہ آج دن میں سفر کے دوران جھیکو نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی

جس سے اس کی دماغی صحت پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا۔

قابوس نے اپنے بیگ میں سے خوراک کے دو ڈبے نکال لئے تھے۔ ان میں سلا ہوا خشک گوشت تھا۔ اس نے ایک ڈبہ جھیکو کی طرف بڑھا دیا۔ ندیم وغیرہ نے بھی اپنے اپنے ڈبے نکال لئے تھے۔ اب ان کے پاس صرف اتنی خوراک رہ گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کل شام تک گزارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ انہوں نے ابھی نہیں سوچا تھا۔ پانڈے بھی اس وقت تلے ہوئے خشک گوشت کے قتلے ہی چبا رہا تھا۔

”تم لوگ تو گوشت نہیں کھاتے۔ لیکن تم تو بڑے مزے لے لے کر کھا رہے ہو۔“

قابوس نے پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے ازارہ مذاق کہا۔

”سوال جب زندگی اور موت کا ہو تو جانور تو کیا انسان کا گوشت بھی کھایا جاسکتا ہے۔“

پانڈے نے جواب دیا۔

”تم تو بڑے خطرناک ہو۔ اب تم سے بچ کے رہنا پڑے گا۔“ قابوس ہنسا۔

پانڈے نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ دوسرے لوگ خاموشی سے کھاتے رہے۔ اس دوران وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ آگ میں ایک آدھ لکڑی ڈال دیتے جس سے آگ مسلسل روشن تھی اور غار کی اندرونی فضا بڑی خوشگوار ہو گئی تھی۔

وہ سب لوگ باری باری اپنی کوئی نہ کوئی کہانی سنارہے تھے۔ قابوس بتا رہا تھا کہ دنیا بھر سے ہم جو ناگاپربت کی چوٹی کو سر کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ اکثر نیمیں انہی کے گھاؤں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ وہ خود بھی دو تین ٹیوں کے ساتھ گائیڈ یا مزدور کی حیثیت سے جایزہ کاٹتا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ راستہ بھٹکے ہوں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اس وقت ان کا مقصد پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنا ہوتا تھا اور کوہ پیادوں کی ہر ٹیم وہی ایک راستہ استعمال کرتی تھی جو آسان ترین سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی لگے بندھے راستے تھے بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہاں صورت حال مختلف ثابت ہوئی تھی۔ وہ ناگاپربت کی چوٹی سر کرنے نہیں نکلے تھے۔ ان کا مقصد تو اس طیارے کو تلاش کرنا تھا جو ان کے خیال میں ان برف پوش وادیوں میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ قابوس، کوہ پیادوں کی ٹیوں کے ساتھ ناگاپربت کے دامن کے آس پاس ہی رہا تھا۔ لیکن طیارے کی تلاش میں وہ خود بھی اس

جیسے ہی یہ احساس ہو گا کہ اب کسی بستی تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے تو وہ انہیں چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے کہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ان چاروں کو گولیوں سے بھون ڈالے۔

مونیکا نے مرنے سے پہلے پانڈے کا سارا منصوبہ اسے بتا دیا تھا۔ وہ بھارتی جاسوس تھا اور ان لوگوں کو دھوکے سے لپیٹا یا چین کی جانب لے جانا چاہتا تھا تاکہ پاکستان کی اہم فوجی نصیبات کے متعلق معلومات حاصل کر کے اپنی حکومت کو فراہم کر سکے۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح بیدار ہونے کے بعد سب نے ڈبوں میں سے تھوڑی تھوڑی خوراک نکال کر کھائی اور سفر شروع کر دیا۔

مختلف جگہوں پر رکتے ہوئے اور اونچے نیچے راستے طے کرتے ہوئے بالآخر شام کے وقت وہ اس جگہ پہنچ گئے جو دور سے سیاہ لکیر نظر آتی تھی۔

☆

برف پوش ویرانے میں گم ہو کر رہ گیا تھا اور کئی روز سے وہ موت سے آنکھ پھولی کھیل رہے تھے۔

پانڈے جنوبی ہند کا رہنے والا تھا۔ یہ علاقہ جنگلوں سے اٹا پڑا تھا جن میں شیر، چیتا اور اس قسم کے خوفناک درندے آباد تھے۔ یہ خوفناک درندے جنگلوں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں پر حملے کرتے رہتے تھے یا کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ان کا شکار بننے رہتے تھے۔ شکاریوں کی اکثر پارٹیاں شیر یا چیتے کے شکار کے لئے ان جنگلوں میں جاتی رہتی تھیں۔ پانڈے بھی کئی شکاری پارٹیوں کے ساتھ ان جنگلوں میں گیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے خوفناک جانور دیکھے تھے۔ ایک شیرنی کا قصہ تو اسے اب تک یاد تھا جس نے تقریباً چھ مہینوں تک تباہی مچائے رکھی تھی۔ یہ شیرنی لا تعداد انسانوں کو چیر پھاڑ چکی تھی۔ پانڈے بھی پارٹی کے ساتھ اس شیرنی کے شکار کو لکھا تھا۔ وہ تقریباً دو مہینوں تک اس شیرنی کے تعاقب میں ان جنگلوں میں بھٹکتے رہے تھے۔ کبھی اطلاع ملتی کہ شیرنی فلاں بستی سے ایک آدمی کو اٹھا کر لے گئی تھی۔ جب وہ لوگ اس بستی میں پہنچتے تو پتہ چلتا کہ شیرنی نے وہاں سے چالیس پچاس کو س دور کسی انسان کو چیر پھاڑ ڈالا ہے۔

”ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اس شیرنی میں کوئی بدروح حلول کر چکی ہے جو کبھی ایک جگہ اور کبھی میلوں دور دوسری جگہ پر دیکھی جاتی۔ لیکن بالآخر وہ ہماری گولیوں کا نشانہ بن گئی۔۔۔۔۔ مگر یہ سفید بھیڑیا۔۔۔۔۔ لگتا ہے اس بھیڑیے میں واقعی کوئی بدروح حلول کر چکی ہے۔“

”ارے بھائی!“ قابوس نے پانڈے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس کا نام مت لو۔۔۔۔۔ وہ بھیڑیا تین دن سے نظر نہیں آیا۔ ایسا نہ ہو کہ یاد کرنے پر دوبارہ ٹپک پڑے۔“

قابوس کی اس بات پر سب ہی نے بڑے زور کا تہقہہ لگایا تھا۔ بہر حال ان سب کو یقین تھا کہ وہ سفید بھیڑیا بھٹک کر کسی اور طرف نکل گیا ہے۔

چیکو ایک کمبل اوڑھ کر سو چکی تھی۔ محسن بھی اونگھنے لگا تھا۔ قابوس نے دو تین موٹی موٹی لکڑیاں اٹھا کر آگ میں ڈال دیں اور وہ بھی کمبل لپیٹ کر چٹان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد اونگھنے لگا۔ کچھ دیر بعد پانڈے بھی سو گیا۔

ندیم جاگتا رہا۔ وہ پانڈے کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ پانڈے کو

جیل قیدی کرنے جا رہے ہو؟“  
جواب میں پانڈے نے چھوٹی انگلی اٹھا دی۔

پانڈے چٹانوں میں کافی دور نکل گیا تھا۔ ندیم اپنا بیگ لے کر چیکو کے قریب آگیا۔  
پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا بیگ اس طرف اچھال دیا جہاں وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ پانڈے  
چیکو کے قریب رکھا ہوا تھا۔ ان سب کے بیگ ایک ہی جیسے تھے۔ مونے کپڑے  
براون رنگ کے۔ یہ بیگ انہوں نے تباہ شدہ جہاز کے ڈھانچے کے سامان میں سے  
لے تھے اور ایسے بیگ فوج ہی میں استعمال ہوتے تھے۔

ندیم نے پہلے پانڈے کے بیگ کی طرف دیکھا اور پھر قابوس کے بیگ کی طرف جو  
بہی پڑا تھا۔ اس نے بڑے غیر محسوس انداز میں دونوں بیگ بدل دیئے۔ اب پانڈے  
بلڈ قابوس کا بیگ رکھا ہوا تھا اور قابوس کی جگہ پانڈے کا۔ ندیم اٹھ کر دوبارہ اپنی جگہ پر  
بٹ۔

پانڈے کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی اپنے بیگ پر سر رکھ کر لیٹ  
اس نے دونوں کمبل اپنے جسم پر لپیٹ لئے تھے اور کچھ ہی دیر بعد اس کے خراٹے سنائی  
پڑے۔

ندیم تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔ تمام لوگ سو چکے تھے۔ ندیم جاگتے رہنے کی  
شکر رہا تھا لیکن بالآخر وہ بھی سو گیا۔

محسن نے ندیم کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ ندیم ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ ندیم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔  
پانڈے اور چیکو غائب ہیں۔“ محسن بولا۔

”تھا...؟“ ندیم کا دماغ جھک سے اڑ گیا۔ اس کے ذہن پر طاری نیند کا خمیر کافور ہو  
پانڈے کے بارے میں اس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔

محسن نے بتایا۔ پانڈے کا بیگ بھی نہیں ہے اور وہ ایک رات نفل بھی لے گیا  
محسن نے بتایا۔

ندیم نے اپنے جسم پر پلٹا ہوا کمبل اتار کر ایک جھینکے سے پھینک دیا اور اٹھ کر قریب کی  
پڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی برف پوش چٹانیں پھیلی

یہ چیز کے درخت تھے جنہیں تنے پر تقریباً تین فٹ اوپر سے کاٹا گیا تھا۔ صاف ظاہر  
ہو رہا تھا کہ ان درختوں کو کلہاڑے سے کاٹا گیا تھا اور اگر یہ درخت خود ہی گرے ہوتے تو  
وہیں پر موجود ہوتے۔ انہیں سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگی کہ یہ درخت یہاں سے کاٹ کر  
کہیں اور لے جائے گئے تھے۔ گوکٹے ہوئے درختوں کے نشان بتا رہے تھے کہ انہیں بہت  
عرصہ پہلے کاٹا گیا ہو گا لیکن اس سے اس بات کا ثبوت ضرور ملتا تھا کہ قرب وجوار میں کوئی  
انسانی بستی ضرور موجود ہے۔

انہوں نے ان کٹے ہوئے درختوں کے قریب ہی ایک چٹان کے دامن میں پڑاؤ ڈال  
دیا۔ یہاں کوئی ایسا غار نہیں ملا تھا جس میں وہ پناہ لے سکتے۔ انہیں کھلی فضا میں ڈیرہ جمانا پڑا  
تھا۔

ندیم اب پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ آج رات پانڈے کے فرار ہونے کے  
امکانات زیادہ تھے۔ کیونکہ اسے بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قرب وجوار میں کوئی بستی موجود  
ہے یہاں سے اسے آگے جانے میں مدد مل سکتی ہے۔

یہ غنیمت تھا کہ ہوا نہیں چل رہی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے گہرے بادلوں کی وجہ  
سے سردی بھی کچھ کم تھی لیکن بہر حال ان کے چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ سردی  
کی شدت سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پانڈے، محسن کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس سے آگے قابوس بیٹھا تھا جو خوراک  
کے ایک ڈبے کو انگلیوں سے چاٹ رہا تھا۔ اب ان کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں بچا تھا  
اور ندیم سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کل کوئی مدد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو برف کے  
اس ویرانے میں بھوک سے ایڑھیں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔ جب پانڈے اپنی جگہ سے  
اٹھ کر ایک طرف جانے لگا تو قابوس خالی ڈبے ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال

ہوئی تھیں اور ان دونوں کا دور تک کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

”جلدی کرو! وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔“ ندیم نے کہا۔ وہ بڑی عجلت میں اپنے کبل تہہ کر رہا تھا۔

”لیکن ہم انہیں کیسے تلاش کریں گے؟ ہر طرف تو چٹانیں ہی چٹانیں ہیں۔ وہ آہٹل سے چھپ سکتے ہیں۔“ محسن نے جواب دیا۔

”برف پر ان کے قدموں کے نشان ہماری رہنمائی کریں گے۔“ ندیم کبل اپنے بیک میں ٹھونکتے ہوئے بولا۔

”ارے! یہ کیا؟“ قابوس کی آواز سن کر وہ دونوں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اپنے سامنے کھلے ہوئے بیک کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ میرا بیک تو نہیں ہے۔“ قابوس بولا۔

”یہ پانڈے کا بیک ہے۔“ ندیم نے کہا۔ مجھے پانڈے پر شبہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی وقت ہمیں دھوکہ دے کر بھاگنے کی کوشش کرے گا اور آج رات تو میرا شبہ یقین میں بدل چکا تھا اس لئے میں نے موقع پاتے ہی رات کو تمہارا اور اس کا بیک بدل دیا تھا۔“

”کیوں؟ اس میں ایسی کیا قیمتی چیز ہو سکتی ہے؟“ قابوس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس بیک کو اچھی طرح چیک کرو۔ تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ اس میں کیا ہے۔“ ندیم مسکرا دیا۔

قابوس بیک میں بھری ہوئی چیزیں نکال نکال کر پھینکنے لگا۔ تین چار جوڑے کپڑے نکلے اور وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی موجود تھا جسے پانڈے ہر وقت اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ لیکن کپڑوں کے نیچے سے جو کچھ بھی برآمد ہوا اسے دیکھ کر قابوس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

”یہ..... یہ ہیرے.....“ اس نے بیک سے مٹھی بھر کر ہیرے نکال لئے۔

”یہ لمبی داستان ہے۔ راستے میں بتاتا رہوں گا۔“ اب جلدی سے چل پڑا۔

لوگ زیادہ دور نہ نکل جائیں۔“ ندیم نے کہا۔

قابوس تمام چیزیں دوبارہ بیک میں ٹھونے لگا۔ پھر بکل بند کر کے بیک کندھے پر لٹا دیا۔

دو تین منٹ بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ کو اس کے ساتھ کیوں چلی گئی؟“ قابوس بولا۔

”وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”اسے یہ غمال بنا کر لے جایا گیا پانڈے کو یہ اندیشہ بھی ہو گیا ہو گا کہ اگر ہمارے گھیرے میں آگیا تو مجھ کو ذریعے مل کر کے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ رات نقل اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ وہ ہمارے بیک خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”جب اسے بیک کی تبدیلی کا پتہ چلے گا تو وہ یقیناً اپنا بیک حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے گا کیونکہ اس بیک میں ہیروں کے علاوہ اس کا ٹرانسمیٹر بھی موجود ہے۔“ محسن بولا۔

”ہاں پانڈے اور مجھ کے قدموں کے نشانات بہت واضح تھے اور وہ تینوں یہ نشانات ہوئے تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برف خاصی دبیز تھی۔ ان کے پیر برف پر چل رہے تھے اور زیادہ تیز چلنا ممکن نہیں تھا۔“

”اور یہ ہیروں کا کیا قصہ ہے؟ پانڈے کے پاس یہ ہیرے کہاں سے آئے؟“ قابوس پوچھا۔

”یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ان ہیروں کی خاطر موزیکا بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو گیا۔“ ندیم نے کہا اور پھر اسے مجھے والے غار میں خزانے کی دریافت کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”جب ہم تباہ شدہ ڈھانچے میں پناہ گزین تھے تو غالباً پانڈے کو اس خزانے کے بارے میں شبہ ہو گیا تھا۔ دراصل میں محسن کو وہ ہیرے نکال کر بھڑیے نے حملہ کر دیا۔ ہیرے محسن کے ہاتھ سے گر کر پتھروں میں بکھر گئے۔ بعد میں وہیں سے پانڈے کو ایک دو ہیرے مل گئے تھے جس سے اسے شبہ ہوا کہ یہ اصل راستے سے بھٹکا کر دوبارہ اس غار والے پہاڑ پر لے آیا تھا اور پھر اسی غار میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا تھا اور غار کے اس حصے تک پہنچنے میں مدد مل گئی تھی۔ یہ خزانہ موجود ہے۔ یہ ہیرے اس نے جیبوں میں بھر لئے تھے جس مقصد سے ہماری ٹیم میں شامل ہوا تھا اس کا وہ مقصد تو پورا نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بعد مجھے شبہ تھا کہ وہ ہمیں دھوکہ دے کر بھاگنے کی کوشش کرے گا۔“

”بہت ہی غبیث آدمی ہے۔“ قابوس نے کہا۔

مڑا تھا۔ محسن اور ندیم جھیکو کے قریب رُک گئے۔ جھیکو بے حس و حرکت پڑی تھی اور اس کی ہائیں پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا۔

محسن نے جھیکو کی پتلون کا پانچہ اوپر چڑھا دیا۔ اس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی لیکن جھیکو کی نمت اچھی تھی کہ گولی پنڈلی کی کھال کو جھیلی ہوئی نکل گئی تھی اور زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ندیم نے اپنا بیک کھولا۔ اسے اور تو کچھ نہیں ملا، اپنی قمیص پھاڑ کر ایک پٹی زخم پر باندھ دی اور ایک ذرا اوپر تاکہ خون بہنا بند ہو جائے۔

چٹان کے دوسری طرف فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ پھر ایک خاموشی چھا گئی اور اس کے چند منٹ بعد قابوس بھی واپس آ گیا۔

”بھاگ گیا کم بخت۔“ قابوس نے کہا۔ ”اچھا ہوا وہ میرے ہاتھوں نہیں مرا۔ سردی اور بھوک سے خود ہی مر جائے گا۔“

ندیم، جھیکو کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ چند ہی منٹ بعد جھیکو ہوش میں آگئی۔ وہ چند لمحے دیران سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ ہر چیخ مار کر ندیم سے لپٹ گئی جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

”وہ..... وہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے بچا لو اس سے۔“ جھیکو چیخ رہی تھی۔

”ڈرو نہیں جھیکو!“ ندیم نے اسے تسلی دی۔ ”وہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ بھاگ آیا ہے وہ۔“

ندیم نے بڑی مشکل سے اسے اپنے سے الگ کیا۔ جھیکو روتے ہوئے انہیں اپنی داستان سناتے ہوئے رہی تھی۔

”رات کو اس نے مجھے سوتے میں جگا دیا تھا۔ میں نے بولنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور رائفل کے اشارے سے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا..... وہ مجھے گھسیٹا ہوا لے جا رہا تھا۔ دن چڑھنے پر پھر تھوڑی دیر کے لئے ایک جگہ رکے تھے۔ وہ ایک بار پھر سے اٹھ کھڑا ہوا چلنے لگا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔ مجھ سے ایک قدم نہیں چلا جا رہا تھا لیکن وہ مجھے تیز تیز چلنے پر مجبور کرتا رہا۔ میں بار بار گر رہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی سفید بھیڑیے نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میں نے ایک طرف چھلانگ لگا کر بھیڑیے سے جان بچائی۔ پانڈے بھی بھیڑیے کی

اور پھر دفعہ تینوں چوک گئے۔ فضا میں گڑگڑاہٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ تینوں آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلے تو وہ لوگ یہی سمجھے کہ بادل گرج رہے ہیں لیکن گڑگڑاہٹ بادلوں کی نہیں تھی۔ وہ کسی جہاز کی آواز تھی۔ وہ تینوں آسمان کی طرف دیکھ رہے لیکن جہاز بہت بلندی پر اور بادلوں میں تھا جو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف اس کی آواز ہی سن سکتے تھے۔

وہ تینوں دل موس کر رہ گئے۔ اگر آسمان پر بادل نہ ہوتے تو شاید جہاز کا پائلٹ انہیں دیکھ لیتا۔ لیکن قسمت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

اچانک فائر کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر چوک گئے۔ گولی کی آواز اگرچہ بہت دور کی تھی لیکن اس کی بازگشت پوری وادی میں پھیل گئی تھی۔ ان تینوں نے معنی خیر نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور برف پر قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے مزید تیز چلنے کی کوشش کرنے لگے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فائر کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ آواز قریب سے آئی تھی۔ وہ تینوں دوڑنے لگے۔ دو تین چٹانوں کے چکر کاٹتے ہوئے وہ جیسے ہی ایک جگہ پہنچے ٹھٹھک کر رُک گئے۔ سامنے والی چٹان سے ایک انسانی جسم برف پر نرہٹا ہوا اپنے آگے تھا۔ انہوں نے سیاہ جیمز کی وجہ سے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ جھیکو تھی۔ اس کی چیخیں بھی سن دے رہی تھیں۔

اسی وقت چٹان پر پانڈے بھی نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ چٹان رُک کر ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی جھیکو کو نشانے پر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے گولی دی۔ گولی جھیکو سے چند فٹ آگے برف میں لگی اور برف کے ذرات اُڑنے لگے۔ رائفل اس وقت قابوس کے پاس تھی۔ پانڈے نے غالباً ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔ قابوس نے رائفل کا رخ پانڈے کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ گولی اگرچہ پانڈے سے فٹ دور برف میں لگی تھی مگر پانڈے ان کی موجودگی سے آگاہ ہو گیا تھا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی اس نے چٹان کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔

وہ تینوں دوڑ پڑے۔ قابوس دوڑتا ہوا اس چٹان پر چڑھنے لگا جہاں کچھ دیر پہلے

لوگوں نے چرالئے ہیں۔ اس نے دھکی دی تھی کہ تم لوگوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”وہ ہیرے اس کے باپ کی ملکیت نہیں تھے۔“ قابوس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”وہ ہیرے تو کیا ہمارے ملک سے ایک معمولی سا کنکر بھی اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا۔“

”میرا خیال ہے اب ہمیں چل دینا چاہئے۔ یہ باتیں راستے میں بھی ہوتی رہیں گی۔ تم چل سکتی ہونا چیکو؟“ ندیم نے آخری الفاظ چیکو کی طرف دیکھ کر کہے تھے۔

”ہاں! آہستہ آہستہ چل لوں گی۔“ چیکو قریب کھڑے ہوئے قابوس کا سہارا لے کر اٹھ گئی۔

وہ ایک بار پھر چٹانوں میں چلنے لگے۔ قابوس کے پاس را نقل تھی اور وہ محتاط لگا ہوں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔

وہ تقریباً تین گھنٹوں تک چلتے رہے۔ اس دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن تھکن کے ساتھ اب انہیں بھوک بھی ستانے لگی تھی۔

”ان درختوں کی طرف چلو! شاید وہاں سے کوئی راستہ مل جائے۔“ ندیم نے دائیں طرف کچھ فاصلے پر چڑھنے کے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف مڑ گئے۔ لیکن ابھی تقریباً پچاس گز چلے ہوں گے کہ نفاذ فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی محسن کے سر کے قریب سے گزری تھی۔ ان چاروں نے بڑی بھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

قابوس نے پانڈے کو ایک چٹان کی آڑ میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ وہ را نقل سنبھالے انہی طرف دیکھ رہا تھا۔ قابوس نے ٹرائیگر دبا دیا اور پھر خاموش ویرانہ فائرنگ کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

پانڈے نے صرف تین گولیاں اور چلائی تھیں۔ اور پھر وہ چٹان کی آڑ میں ہو گیا۔ قابوس کی نظریں سرچ لائٹس کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ لیکن جب دیر تک پانڈے نظر نہیں آیا اور نہ ہی گولی چلی تو قابوس دوڑتا ہوا سامنے والی چٹان پر پہنچ گیا۔ چٹان کے اترنی طرف ڈھلان کی برف پر قدموں کے نشان دیکھ کر قابوس کو سمجھنے میں دیر نہیں

زد میں آتے آتے بچا تھا۔ بھیڑ یا اچھل اچھل کر پانڈے پر حملہ کرتا رہا۔ پانڈے را نقل کو لو کی طرح گھما رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دوڑنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں برف پر قدموں کے نشانات پر دوڑتی رہوں گی تو تم لوگوں تک پہنچ جاؤں گی۔ اچانک گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں سمجھی تھی کہ پانڈے نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ لیکن مجھے گولی نہیں لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پانڈے نے گولی دراصل سفید بھیڑیے پر چلائی تھی۔ گولی بھیڑیے کو بھی نہیں لگی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا چٹانوں میں غائب ہو گیا۔ پانڈے چیختا ہوا میرے پیچھے دوڑا۔ وہ مجھے رکنے کو کہہ رہا تھا لیکن میں نہیں رکی۔ اور اس چٹان پر چڑھنے لگی۔ پانڈے نے گولی چلا دی جو میری ٹانگ میں لگی۔ میں گر پڑی لیکن اٹھ کر پھر دوڑنے لگی۔ میں نے ایک اور گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”پانڈے نے وہ آخری گولی بھی تم پر ہی چلائی تھی لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی کہ نہ صرف پانڈے کی گولی سے بچ گئیں بلکہ ہم بھی یہاں پہنچ گئے اور پانڈے بھاگ نکلا۔“ ندیم نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”اب تم بالکل محفوظ ہو۔ پانڈے کی گولی تمہیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکی۔ زخم بہت معمولی ہے۔“

چیکو ایک ہاتھ سے اپنی پنڈلی دبانے لگی۔ اسے یقیناً تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ تینوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان تینوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی۔ سفید بھیڑیا..... تین چار روز اس بھیڑیے سے بے خوف و خطر ہو کر گزرے تھے لیکن اب وہ پھر کہیں سے ٹپک پڑا تھا۔

”اب ہمیں دو بدردحوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔“ قابوس نے کہا۔ ”پانڈے بھی ہمارے لئے اس سفید بھیڑیے سے کم خطرناک ثابت نہیں ہو گا۔“

”اسے جب اپنے بیگ کی تبدیلی کا پتہ چلے گا تو وہ اور بھی خطرناک ہو جائے گا۔“ محسن نے کہا۔

”اسے بیگ کی تبدیلی کا پتہ چل گیا۔“ چیکو نے کہا۔ ”اس نے بیگ کی ایک ایک چیز نکال کر پھینک دی تھی۔ وہ بیگ کی تبدیلی پر پاگل ہو رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کے بیگ میں لاکھوں ڈالر مالیت کے ہیرے تھے جو تم



لگی کہ پانڈے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ پانڈے بہت ہی عیار آدمی تھا۔ اس نے جو ہیرے جوہرات چرائے تھے وہ ان کے قبضے میں تھے اور وہ آسانی سے ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

قابوس کچھ دیر تک چٹان پر کھڑا دھر دھر دیکھتا رہا۔ پھر پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ لوگ بھی چٹان پر آگئے اور آہستہ آہستہ دوسری طرف اترنے لگے۔ مزید دو گھنٹوں میں وہ تین چار میل ہی کا فاصلہ طے کر پائے تھے۔ اگر راستہ ہموار ہوتا تو ممکن ہے زیادہ فاصلہ طے ہو جاتا۔ لیکن انہیں بار بار ٹیلوں پر چڑھنا پڑ رہا تھا اور ویسے بھی دیز برف پر چلنے میں زیادہ قوت استعمال ہو رہی تھی۔ چیکو کی ٹانگ کا زخم بھی تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے بھی چلنے کی رفتار سست رہی تھی۔

قابوس ان میں سب سے آگے تھا۔ اس کے پاس رائفل تھی اور وہ ان کے محافظ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ ہر چند قدم کے بعد وہ رک کر چاروں طرف دیکھ لیتا اور پھر چلنے لگتا۔ اب وہ باقاعدہ لڑکھڑاہے تھے۔ تھکن اور بھوک نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ اس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں پناہ مل سکتی۔

دفعۃً چیکو لڑکھڑا کر گری۔ ندیم اور محسن نے اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا مگر وہ پھر گر گئی۔

”اب..... میں نہیں چل سکتی۔“ چیکو ہانپتے ہوئے بولی۔ ”مم..... مجھے چھوڑ دو۔“ اگر صرف تھکن ہی ہوتی تو کچھ دیر تک آرام کیا جاسکتا تھا مگر انہیں بھوک کے عفریت نے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

”تھوڑی سی ہمت کر لو چیکو۔“ ندیم نے کہا۔ بھوک سے اس کی اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ پیٹ میں گریں سی پڑ رہی تھیں جس سے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ ”وہ درخت دیکھ رہی ہو؟“ اس نے سامنے اشارہ کیا۔ ”مجھے یقین ہے وہاں ہمیں کچھ کھانے کو مل جائے گا۔“

”نن..... نہیں۔“ چیکو کراہی۔ ”میری ٹانگوں میں اتنی سکت نہیں رہی کہ اٹھ کر کھڑی ہو سکوں۔“

بعض تمہیں سہارا دے کر لے چلتے ہیں۔ تھوڑی سی ہمت کر لو۔“ ندیم نے کہا۔

ندیم اور محسن نے چیکو کو بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھایا اور اسے برف پر گھسیٹتے ہوئے درختوں کی طرف چلنے لگے۔ ندیم کا خیال تھا کہ وہ چڑ کے درخت زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہوں گے لیکن چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے ارد گرد چکر کاٹتے ہوئے انہیں تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔

وہ درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ اس سے آگے مسلسل نشیبی علاقہ تھا اور چڑ کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے فوجی جوان صف در صف مستعد کھڑے ہوں۔

درختوں کے نیچے برف نہیں تھی۔ پہلے درخت کے نیچے پہنچتے ہی محسن اور ندیم نے چیکو کو چھوڑ دیا۔ وہ بھد سے نیچے گری اور کراہنے لگی۔ محسن ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ چونک گیا اور ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”قا..... قابوس کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ بھی تو کہیں ہمیں دھوکہ دے کر بھاگ تو نہیں گیا.....؟ رائفل اور ہیرے اس کے پاس ہیں۔“

”قابوس ایسا نہیں کر سکتا۔“ ندیم ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک محبت و وطن اور وفادار آدمی ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتا۔“

”دولت بڑے بڑے پار سالوگوں کا ایمان متزلزل کر دیتی ہے اور اس کے پاس تو کرڈوں ڈالر مالیت کے ہیرے ہیں۔“ محسن بولا۔

”نہیں! میں قابوس کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتا۔“ ندیم نے پروٹوق لہجے میں کہا۔

”اس وقت ہم لوگ بے یار و مددگار ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”اگر وہ سفید بھیڑیا پانڈے ان طرف آگیا تو اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہمارا کیا انجام ہو گا۔ پانڈے ہمارے لئے اس بھیڑیے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔“

اس سے پہلے کہ ندیم کوئی جواب دیتا فضا فار کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ آواز کس سمت سے آئی تھی۔ وہ دونوں بدحواس سے ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ندیم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ اگر وہ پانڈے ہوا تو ان کے لئے مہلکی خطرناک ثابت ہو گا۔ اسی لمحہ ایک اور گولی چلی۔ چیکو اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی ان دونوں

کے قریب آگئی۔

”یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ جیکو کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔

”گولیاں چل رہی ہیں۔“ محسن نے جواب دیا۔ ”اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق تمہیں جتنی بھی دعائیں یاد ہیں ان کا ورد شروع کر دو کیونکہ اگر یہ پانڈے ہو تو یہ ہماری زندگی کی آخری گھڑیاں ہوں گی۔“

”تت..... تم..... مجھے ڈر ہے ہو؟“ جیکو کا چہرہ کچھ اور پیلا سا ہو گیا۔

”میں خود ڈرا ہوا ہوں تمہیں کیا ڈراؤں گا۔“ محسن نے جواب دیا۔

جیکو بھی درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بھوک سے اس کے پیٹ میں بھی درد ہونے لگا تھا۔ وہ سر اٹھا کر فلک بوس درختوں کی چھتری نما چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگی۔

”ان درختوں پر کوئی پھل نہیں لگتا؟“ اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

”پھل.....!“ محسن بولا۔ ”ان درختوں پر پھل لگتا تو ہے۔ تم نے بھی لٹو دیکھا ہے

بالکل اسی طرح کا پھل ہوتا ہے لیکن اس پھل میں بڑے سخت قسم کے پرت ہوتے ہیں اور ہر پرت کے اندر ایک چلغوزہ ہوتا ہے۔ چلغوزہ سمجھتی ہو نا؟“ محسن چند لمحوں کو خاموش

ہوا اور پھر اسے سمجھانے لگا کہ چلغوزہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ متحسنگا ہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پھر دفعۃً اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ تقریباً

پندرہ فٹ کے فاصلے پر اسے ایک لٹو سا پڑا ہوا نظر آ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ لٹو اٹھا لایا۔ وہ چیز کا پھل تھا۔ شکل میں لٹو کی طرح لیکن اس کا چھلکا چھوٹے چھوٹے پرتوں پر مشتمل

تھا جو کسی پھول کی پتیوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ لیکن یہ پرت بڑے سخت تھے۔ محسن ایک پتھر سے اسے توڑنے لگا۔ اس پورے پھل میں سے صرف دو چلغوزے نکلے تھے۔ اس نے

چلغوزے چھیل کر ان کی گری جیکو کی طرف بڑھادی۔ جیکو نے دونوں گریاں مر میں ڈال لیں اور انہیں دانتوں سے چبانے لگی۔

”بہت مزیدار ہے۔“ جیکو کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ”اور ڈھونڈ کے

لاؤ.... اگر بہت سارے پھل جمع کر لیں تو ان سے ہماری بھوک مٹ سکتی ہے۔“

محسن متحسنگا ہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ درخت ڈھلان پر تھے اور ان سے گرنے والے لٹو نما پھل ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے نشیب میں کہیں دور چلے جاتے ہوں گے

اور شاید اسی لئے اس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ محسن سوچ رہا تھا کہ اگر گھوم پھر کر تلاش کیا جائے تو کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ ابھی وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز سن کر اُچھل پڑا۔ کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

ندیم بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ جیکو بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے قابوس کی آواز پہچان لی تھی جو ان کے نام لے لے کر پکار رہا تھا۔ محسن اور ندیم بھی زور زور سے قابوس کا نام لے کر چیخنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی وہ متحسنگا ہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

تقریباً ایک منٹ بعد قابوس دائیں طرف کی گھاٹی سے اوپر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ جانور لٹکا رکھے تھے۔ ندیم اور محسن آگے بڑھ گئے۔ قابوس کے دونوں ہاتھوں میں سفید خرگوش تھے جن کی گردنوں پر خون بجا ہوا تھا۔

”اچھا ہوا تم لوگوں نے میری آواز سن لی ورنہ میں بھی بھٹکتا رہتا اور تم لوگ بھی۔“ قابوس نے قریب آ کر دونوں خرگوش زمین پر ڈال دیئے۔ ”دراصل میں نے اس طرف

ایک خرگوش کو دیکھ لیا تھا اور اس کے تعاقب میں کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا تھا۔ مجھے دو گولیاں تو ضائع کرنا پڑیں مگر یہ دو خرگوش ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان سے پیٹ کا جہنم تو بھرا جا

سکتا ہے۔ تم لوگ لکڑیاں جمع کرو میں ان خرگوشوں کی کھال اُتارتا ہوں۔“ قابوس زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر

جیکٹ کی جیب سے چاقو نکال کر خرگوشوں کی کھال اُتارنے لگا۔

ندیم اور محسن درختوں کے نیچے گھوم پھر کر لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ بے شمار شاخیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دو درخت گرے ہوئے تھے۔ ان کی سوکھی ہوئی شاخیں توڑ کر جمع

کر لیں گے۔ ندیم نے اپنے بیگ میں سے پاجس نکالی اور کچھ لکڑیاں الگ کر کے انہیں جھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تین دیا سلاخیاں ضائع کرنے کے بعد وہ بالآخر آگ جلانے

میں کامیاب ہو گیا۔

قابوس دونوں خرگوشوں کی کھالیں اُتار کر ان کی آلائش نکال چکا تھا۔ وہ دونوں خرگوشوں کو لکڑی کی چھریوں میں پرو کر آگ پر بھوننے لگا۔ جیکو آگ کے قریب ہی زمین

پڑی ہوئی تھی۔ گوشت بھونے جانے کی خوشبو اس کے نھنوں سے مکر رہی تھی۔ اس

حسن را نقل اٹھا کر درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ تقریباً تیس سیکنڈ بعد وہ متحرک ہوا۔ دوبارہ دکھائی دیا۔ حسن نے را نقل سیدھی کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ رات کا سناٹا فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ قابوس، چیکو اور ندیم ہڑبڑا کر رہ گئے۔

”کیا ہوا؟“ قابوس نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

”میرا خیال ہے پانڈے ہے۔ وہ ان درختوں میں اس طرف آ رہا تھا۔“ حسن کہتا ہوا اٹھ کر درختوں کی طرف دوڑا۔

اسی لمحہ فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ پانڈے نے فائر کیا تھا۔ گولی زن کی آواز کے ساتھ حسن کے سر کے قریب سے گزر گئی۔ حسن نے ایک طرف چھلانگ لگادی اور جس طرف سے اس نے شعلہ چمکتے دیکھا تھا اس طرف فائر کر دیا اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ بھی اس طرف دوڑنے لگا۔ اسے اگرچہ دوڑنے والا دکھائی نہیں دیا تھا لیکن کچھ آگے جانے کے بعد اس نے ایک اور فائر کر دیا۔

حسن دو تین منٹ وہاں کھڑا تارکی میں گھور تارہا۔ پھر واپس آگیا۔

”بھاگ گیا۔“ وہ اپنے ساتھیوں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔“ قابوس کچھ سوکھی ہوئی شاخیں آگ پر ڈالتے ہوئے بولا۔

راکھ کے نیچے دبے ہوئے کونے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک لکڑی سے راکھ کرید دی۔ اوپر الال جانے والی لکڑیاں سلگنے لگیں۔ ”وہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ اگر اسے مزید قریب آنے کا موقع مل جاتا تو ہم سب اس کے رحم و کرم پر ہوتے۔“

”وہ ہمارا خاتمہ کر چکا ہوتا۔“ حسن بولا۔ ”وہ تو محض اتفاق تھا کہ کسی پتھر کے لڑھکنے یا آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی اور میں نے تاریکی میں اس کا ہیولہ دیکھ لیا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ رات کا باقی حصہ ہم میں سے کسی ایک کو جاگ کر گزارنا پڑے گا۔“ قابوس نے کہا۔ پھر جمائی لیتے ہوئے بولا۔ ”اچھا! تم لوگ سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔“ اس نے حسن سے را نقل لے لی اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ تینوں بھی کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اونگھنے لگے۔ قابوس نے کوبلوں کو دبا دیا۔ بونے کچھ اور لکڑیاں ڈال دیں اور جھک کر کوبلوں پر پھونکیں مارنے لگا۔ اس کی شش رانگاں نہیں گئی۔ بھک کی آواز سے آگ بھڑک اٹھی۔

خوشبو سے بھوک کچھ اور بھڑک رہی تھی۔

بالآخر تقریباً ایک گھنٹے بعد خرگوش تیار ہو گئے اور وہ چاروں ان پر ٹوٹ پڑے۔ ایک خرگوش ندیم، چیکو اور ایک خرگوش قابوس اور حسن کے حصے میں آیا تھا۔ وہ اس قدر بھوکے تھے کہ ان خرگوشوں کی ہڈیاں تک چبا گئے لیکن بہر حال کچھ سہارا ہو گیا تھا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ انہوں نے وہیں ڈیرہ جمائے رکھا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں لکڑیاں ڈالتے رہے۔

”اگر پانڈے اس طرف نکل آیا تو جلتی ہوئی آگ دیکھ کر ہماری موجودگی سے آگاہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ گھات لگا کر کسی وارنٹک کے بغیر ہم پر فائرنگ کرنا شروع کر دے۔“ حسن نے کہا۔

”وہ پتہ نہیں بھٹک کر کس طرف نکل گیا ہو گا۔ اگر قرب و جوار میں کہیں موجود ہوا بھی تو رات کے وقت ان خطرناک چٹانوں میں نکلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس لئے کم از کم رات کے وقت ہمیں اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“ قابوس نے جواب دیا۔

لیکن قابوس کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ غالباً آدھی رات کا وقت تھا۔ وہ چاروں سو رہے تھے۔ اچانک حسن کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنی تھی اور پھریوں لگا تھا جیسے کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ خشک شاخوں کے پیروں کے نیچے دب کر چرچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ حسن آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ پہلے تو اسے تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دے سکا۔ پھر درختوں میں ایک متحرک سایہ دیکھ کر وہ چونک گیا۔

حسن پہلے تو سمجھا کہ وہ بھیڑیا ہو گا لیکن پھر اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ وہ بھیڑیا نہیں انسان ہیولہ تھا جو درختوں میں چھپتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ حسن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پانڈے تھا۔

حسن نے ادھر ادھر دیکھا۔ قابوس اس کے قریب ہی سو رہا تھا۔ اس نے پہلے سوچا کہ قابوس اور ندیم کو جگا دے لیکن پھر اس نے بڑی آہستگی سے قابوس کے قریب پڑی ہوئی را نقل اٹھائی۔ قابوس کا ایک ہاتھ را نقل پر تھا جسے اس نے بڑی آہستگی سے ہٹا دیا تھا۔

”تم لوگ یہیں رکو۔“ قابوس نے کہا۔ ”درختوں کی آڑ لے کر کھڑے رہو۔ میں آگے چل کر دیکھتا ہوں۔ ممکن ہے اس خبیث پانڈے نے یہاں پناہ لے رکھی ہو۔“

”ٹھیک ہے! مگر ہوشیار رہنا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔“ محسن نے جواب دیا۔

جیکو پہلے ہی ڈھیر ہو چکی تھی۔ بھوک اور تھکن کے علاوہ اب اسے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ پیچھڑوں میں ہلکا ہلکا سادرد رہنے لگا تھا۔ سانس لینے میں دشواری کی شکایت سب ہی کو تھی اور ندیم کا خیال تھا کہ وہ سطح سمندر سے اتنی زیادہ بلندی پر آگئے تھے جہاں ہوا کے دباؤ میں تبدیلی کی وجہ سے انہیں سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔

قابوس رانفل سنبھالے بہت محتاط انداز میں درختوں کے درمیان چلتا ہوا کیمین کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زمین پر بکھری ہوئی درختوں کی خشک شاخیں اس کے پیروں کے نیچے اکر چر مرا رہی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ اور بھی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ بالآخر وہ کیمین کے پھلی طرف پہنچ گیا تھا جہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی نظر آرہی تھی۔ اس نے محتاط انداز سے ٹرکی میں جھانک کر دیکھا۔ کیمین خالی تھا۔

قابوس دبے قدموں کیمین کے گرد گھومتا ہوا سامنے آگیا۔ اس نے پہلے چاروں طرف دیکھا پھر کیمین کے دروازے سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ وہ کسی گوریلے کی طرح انفل تانے اچھل کر کیمین کے اندر داخل ہو گیا لیکن اس کا غمٹہ بے بنیاد نکلا۔ کیمین میں ٹی نہیں تھا۔ فرش پر گرد کی ہلکی سی تہہ تھی جس پر کیڑوں مکوڑوں کے چلنے سے آڑھی جھی لکیریں سی تو بنی ہوئی تھیں لیکن اس قسم کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا جس سے ماضی رب میں یہاں کسی انسان کی آمد کا ثبوت ملتا ہو۔

قابوس کیمین سے باہر آکر ندیم وغیرہ کو آوازیں دینے لگا۔ وہ لوگ جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ یہاں بھی بہت سے درخت کٹے ہوئے نظر آرہے تھے اور پھر جلد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ یہ درخت کسی مقصد سے کاٹے گئے تھے۔

یہ کیمین گول تھا اور اس کی تعمیر میں درختوں کے تنے استعمال کئے گئے تھے۔ درختوں کا تنے اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر زمین میں گاڑے گئے تھے کہ ایک گول بن گیا تھا۔ چھت بھی درختوں کے تنوں کی تھی جس کے اوپر چھوٹی چھوٹی شاخیں

آگ کا روشن الاؤ اگرچہ ان کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ پانڈے دور ہی سے انہیں گولیوں کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن قابوس کو یقین تھا کہ پانڈے ڈر کر ان سے بہت دور چلا گیا ہو گا۔

رات گزرتی رہی۔ وہ تینوں سوئے رہے اور قابوس پہرہ دیتا رہا۔ کبھی وہ آگ کے سامنے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور کبھی اٹھ کر ٹھیلے لگتا۔ بالآخر رات گزر گئی اور دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ قابوس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دو دن سے چھائے ہوئے گہرے بادل اب چھٹ رہے تھے۔

وہ تینوں بھی اٹھ گئے اور دن کی روشنی پھیلنے ہی چل پڑے۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں پھر کٹے ہوئے درخت دکھائی دیئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان درختوں کو کھٹاڑوں سے کاٹا گیا تھا۔ سات درخت کٹے ہوئے تھے۔ دو کے تنے تو وہاں موجود تھے البتہ باقی غائب تھے۔ کٹے ہوئے درختوں کے نشان دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ انہیں بہت پہلے کاٹا گیا تھا۔

”یہ کٹے ہوئے درخت اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرب وجوار میں کوئی آبادی موجود ہے۔“ قابوس نے کہا۔

”دو دن پہلے بھی ہمیں ایسے کٹے ہوئے درخت دکھائی دیئے تھے لیکن ابھی تک ہم کسی آبادی تک نہیں پہنچ سکے۔“ محسن نے کہا۔

”ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب ہم جلد ہی کسی آبادی تک پہنچ جائیں گے۔“ قابوس نے جواب دیا۔

وہ آگے چلتے رہے۔ ان کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ مگر وہ لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے چلتے رہے۔ قابوس چلتے چلتے اچانک ہی رُک گیا۔

”کیا ہوا؟“ ندیم نے پوچھا۔

”وہ درختوں کے اس جھنڈ میں دیکھ رہے ہو؟“ قابوس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”واقعی کوئی کیمین ہے یا مجھے دھوکہ ہو رہا ہے۔“

”کیمین!“ ندیم چونک گیا اور قابوس کے ہاتھ کے اشارے کی سمت دیکھنے لگا۔

قابوس کی نظروں کا دھوکہ نہیں تھا۔ وہاں واقعی ٹکڑی کا ایک کیمین موجود تھا۔

دفعہ وہ جیکو کی چیخ سن کر چونک گئے۔ انہوں نے بیک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور پھر ہمدردی سے اچھل کر حلق میں آگیا۔ جیکو پانڈے کے شکم میں جکڑی ہوئی تھی۔ پانڈے نے ہڈیوں کی طرح اپنے سامنے رکھا تھا۔ اس نے بایاں بازو جیکو کے گلے پر لپیٹ رکھا تھا۔ انہیں ہاتھ میں را نقل تھی۔ قابوس نے اپنی را نقل سیدھی کرنا چاہی مگر رک گیا۔ اگر لی چلاتا تو پانڈے کا تو کچھ نہ بگڑتا البتہ جیکو اس کی گولی کا شکار ہو جاتی۔

”را نقل دور پھینک دو قابوس!“ پانڈے نے غراتے ہوئے کہا۔ ”اگر کسی نے چالاکی نے کی کو شش کی تو اس کا بھیجاؤ اڈوں گا۔“ پانڈے نے را نقل کی نالی جیکو کی کپٹی سے لی۔

قابوس نے را نقل پھینک دی۔

”تم تینوں کم از کم بیس قدم اس طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ پانڈے غریبا۔

علم کی قلیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ سے بیس بائیس قدم دور ہٹ گئے

طرح قابوس کی پھینکی ہوئی را نقل بھی ان کی دسترس سے مزید دور ہو گئی تھی۔ اور

بے مقصد بھی شاید یہی تھا۔

”بیرایک میرے حوالے کر دو۔“ پانڈے نے کہا۔

”تم بڑی غلطی کر رہے ہو پانڈے!“ ندیم نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ ہم سب برف کے

نیم میں بھٹک رہے ہیں اور وہ خونی بھیڑ یا اب بھی ہمارے تعاقب میں ہے۔ ہم مل کر

بہت سی کاراستہ تلاش کر رہے ہیں۔ تم اکیلے رہ کر زندہ نہیں رہ سکو گے۔“

”میں نے انسانوں کی بستی تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی

ت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح اس سرد جہنم سے نکلنے میں کامیاب

ہوں گا۔“ بیرایک میرے حوالے کر دو۔ میں تین تک گنوں گا۔“ پانڈے نے کہا اور

دفعہ کر دی۔

☆

ڈال دی گئی تھیں۔ دروازے میں کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا بس آمدورفت کے لئے اتنی جگہ

چھوڑ دی گئی تھی کہ ایک آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکے۔

محسن اور قابوس باہر سے کچھ جھاڑیاں اکھاڑ لائے اور کیمین کے فرش میں کچھ حصہ

صاف کر لیا۔ ندیم، جیکو کو بازو سے پکڑے گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور اسے فرش پر ڈال دیا۔

ان سب کے حلیے بگڑے ہوئے تھے۔ جب تک سامان تھا وہ شیو بھی بنا لیا کرتے تھے

لیکن جب ان کا سامان برف کے تودے کے نیچے دب گیا تو شیو بنانے کا سلسلہ بھی ختم ہو

گیا۔ اب ان تینوں کے چہروں پر داڑھی اور مونچھوں کے بال آپس میں مل رہے تھے۔ سر

کے بکھرے ہوئے بالوں اور بے ترتیب داڑھی مونچھوں نے ان کے حلیے بگاڑ کر رکھ دیئے

تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ جدید تہذیب سے ہزاروں سال پیچھے پتھر کے دور سے تعلق رکھتے ہوں

جب انسان شیو بنانے جیسی چیزوں سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ پتھر کے دور کے انسان کا صرف

ایک ہی مقصد تھا کہ جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتا رہے اور اپنے دشمنوں کے ہتھے

ادھیرتا رہے۔

یہ لوگ بھی عملی طور پر پتھر کے دور کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف

برف سے ڈھکی ہوئی سنگلاخ چٹانیں تھیں۔ دور دور تک ایسے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے

جس سے پتہ چلتا کہ وہ انسانی تاریخ کے جدید ترین دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

وہ چاروں بے سدھ سے کیمین کے فرش پر پڑے رہے۔ جیکو کی حالت ان سب سے

اتر تھی۔ ایک تو وہ پہلے ہی دہلی پتلی تھی۔ بھوک، تھکن اور مصائب نے اسے ہڈیوں کا

ڈھانچہ بنا دیا تھا۔ پچکے ہوئے رخسار اور اندر کو دھنسی ہوئی دیران آنکھیں۔ ٹانگ کا زخم بھی

اب کچھ زیادہ ہی تکلیف دینے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد ندیم اور قابوس کیمین سے باہر آگئے۔ قابوس متحسنگا ہوا۔ اسے چاروں

طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی جانور نظر آجائے جسے شکار کر کے پیٹ بھرا جاسکے۔

وہ ایک بار پھر چل پڑے۔ آسمان پر ہادل صاف ہو گئے تھے اور دھوپ نکل آئی تھی۔

برف کی چمک سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہ مسلسل نشیب کی طرف جا رہے

تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے گرد گھومتے ہوئے چل رہے تھے۔ جیکو حسب معمول سب

سے پیچھے تھی۔ وہ تینوں بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔

برف کی وجہ سے جھیکو کو اگرچہ کوئی چوٹ نہیں لگی تھی لیکن خوف سے اس کی بری ہو رہی تھی۔ وہ بار بار موت کے منہ میں جا کر لوٹ رہی تھی۔ وہ لوگ جھیکو کے وجہ سمجھ دیر وہاں رکے اور پھر آگے چلنے لگے۔ اب انہیں کم از کم پانڈے کی طرف سے خطرہ نہیں رہا تھا۔ اس کا بیگ اسے مل گیا تھا اور اب وہ ان کے قریب آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

انقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ ان کا رخ اسی طرف تھا جس طرف پانڈے گیا تھا۔ انے نے کہا تھا کہ اس نے کوئی راستہ تلاش کر لیا ہے۔ اگر وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا تو ممکن لوگ بھی اس راستے تک پہنچ جائیں۔

فستہ بھیڑیے کی غراہٹ کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ غراہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ لیکن کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ بھیڑیے کی اب نمایاں ہو رہی تھیں۔ ان آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے وہ غراتے ہوئے بار بار حملہ آور ہو رہا ہو۔ اور پھر جیسے ہی وہ ایک ٹیلے پر پہنچے، دوسری طرف کا منظر دیکھ کر ٹل پڑے۔

بڑا پانڈے پر حملہ آور ہو رہا تھا اور پانڈے راکفل کو لاشی کی طرح گھماتا ہوا بے پروا کر رہا تھا۔ اسے شاید راکفل سیدھی کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وگ مہبوت کھڑے یہ خوفناک منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر دفعۃً فضا فائر کی آواز سے ٹٹی۔ پانڈے کو راکفل سیدھی کرنے کا موقع مل گیا تھا اور اس نے گولی چلا دی۔ لیکن قابوس نے بھی اپنی راکفل سے ہوائی فائر کیا تھا۔

یاد برف پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اسے یقیناً پانڈے کی گولی لگی تھی۔ دوسری گولی کی آواز ٹٹے نے تیزی سے گھوم کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے برف پر پڑا ہوا اپنا بیگ مگر قابوس نے ایک اور فائر کر دیا۔ پانڈے بیگ اٹھائے بغیر اس ٹیلے کے دوسری حلالن پر بھاگ نکلا۔

یاد ہاں سے تقریباً پچاس گز دور تھا۔ قابوس نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ بھیڑیے یاد اس گز کے فاصلے پر پہنچ کر قابوس محتاط ہو گیا اور راکفل تانے بھیڑیے کی

اس نے جیسے ہی دو کہا، ندیم نے قابوس کو اشارہ کیا۔ قابوس نے بیگ کندھے سے اتار کر پانڈے کی طرف پھینک دیا۔  
”اے کھول کر دکھاؤ۔ لیکن کوئی چالاکی مت دکھانا۔“ پانڈے نے کہا۔

قابوس آگے بڑھ کر بیگ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بیگ کھول کر ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ہیرے بھی پانڈے کو دکھادیے۔ پھر بیگ وہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پانڈے جھیکو کو ڈھکا بنائے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے بڑی احتیاط سے بیگ اٹھا لیا۔ اب اگرچہ جھیکو اس کی گرفت میں نہیں تھی لیکن وہ اسے راکفل کی زد پر لئے آہستہ آہستہ ایک برف پوش ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ وہ ٹیلے پر پہنچ گئے۔ پانڈے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ موقع پر ایک لمحہ کے لئے اس کی راکفل کی نال جھیکو کی کنپٹی سے ہٹی تھی۔ جھیکو نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بڑی پھرتی سے نیچے جھک کر دونوں کہنیاں پانڈے۔ پیٹ پر مار دیں۔

پانڈے کراہ کر پیچھے الٹ گیا۔ راکفل کا ٹرانسنگر دب گیا تھا۔ گولی جھیکو کے سر قریب سے گزر گئی۔ اس نے پانڈے کو کہنیاں مارنے کے ساتھ ہی خود بھی سامنے ڈھکا پر چھلانگ لگا دی تھی۔

پانڈے ٹیلے کے پچھلی ڈھلان پر لڑھک رہا تھا۔ بیگ اور راکفل اب بھی اس کی گرد میں تھی۔ ندیم اور محسن لڑھکتی ہوئی جھیکو کی طرف دوڑے جبکہ قابوس اپنی راکفل طرف لپکا تھا۔ وہ جب راکفل اٹھا کر دوڑتا ہوا ٹیلے پر پہنچا تو پانڈے برف کے ٹیلوں غائب ہو چکا تھا۔

”اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں قابوس!“ ندیم چیخا۔

قابوس کچھ دیر تک وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر واپس آگیا۔

میں تھادی۔ اب ان کے پاس دور انگلیں تھیں۔ اور ندیم کو یقین تھا کہ پاٹے محض پستول کے بل بوتے پر ان کے زیادہ قریب آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے باوجود انہیں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ چالاک دشمن غیر مسلح بھی ہو تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔

وہ لوگ بھیڑیے کی لاش پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔ اس سفید بھیڑیے کی موت پر سب ہی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی چیکو کو ہوئی تھی جو کم از کم تین مرتبہ اس بھیڑیے کا شکار ہوتے ہوئے بچی تھی۔ لیکن ابھی ایک بھیڑیا باقی تھا۔۔۔۔۔ انسانی بھیڑیا۔۔۔۔۔ پاٹے کے روپ میں۔

شام سے ذرا پہلے وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے ایک کشادہ راستہ مسلسل ڈھلان کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ لوگ اس ڈھلوانی راستے پر اترتے رہے اور بالآخر ایک جگہ رک کر پڑاؤ ڈالنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگے اور بالآخر انہیں ایک کھوکھ نظر آگئی۔

وہ جیسے ہی کھوکھ میں داخل ہوئے ان کی نظریں سب سے پہلے جلتے ہوئے کونوں اور ادھ جلی لکڑیوں پر پڑیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر خشک لکڑیوں کا ابار لگا ہوا تھا۔ ان کونوں اور ادھ جلی لکڑیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا جیسے انہیں حال ہی میں جلایا گیا ہو۔

قابوس نے کچھ خشک لکڑیاں کونوں اور ادھ جلی لکڑیوں پر ڈال دیں اور ماچس کی ٹیلیوں سے انہیں جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر وہ آگ جلانے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے ہم کسی آبادی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی راستہ ہمیں کسی بستی تک پہنچا دے۔“

”میرا ابھی یہی خیال ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”اب ہمیں انی راستے پر چلتے رہنا چاہئے۔“ وہ رات بھی انہوں نے پہریداری کے نظام کے تحت گزاری۔ اب انہیں صرف ٹرے سے خطرہ تھا۔ مگر رات خیریت سے گزر گئی اور صبح ہوتے ہی وہ اس راستے پر چل پڑے۔

وہ دن بھر چلتے رہے۔ شام سے پہلے جس غار میں انہوں نے قدم رکھا تھا وہاں بھی ادھ جلی لکڑیاں اور کونے نظر آئے تھے۔ ان کونوں اور ادھ جلی لکڑیوں کو دیکھ کر

طرف دیکھنے لگا مگر بھیڑیے کے آس پاس کی برف سرخ ہو رہی تھی اور وہ اس طرح ٹانگیں کھینچ رہا تھا جیسے جانکنی کی کیفیت میں ہو۔ قابوس را نقل تانے محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا اور بھیڑیے سے دو تین قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

بھیڑیے کے جسم کو ایک آخری جھٹکا لگا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ قابوس نے ”یا ہو“ کا نعرہ لگایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر اشارہ کرنے لگا۔ لیکن ٹھیک اسی لمحے غار ہو اور گولی سننا تھی ہوئی قابوس کے سر کے قریب سے گزر گئی۔ قابوس نے ایک در زمین پر چھلانگ لگا دی اور دائیں طرف دیکھنے لگا جہاں پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر پاٹے کھڑا تھا۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ را نقل پھینک دو۔“ پاٹے دھاڑا۔

لیکن قابوس اچھل کر بھیڑیے کی لاش کی آڑ میں ہو گیا۔ پاٹے نے ٹرائیگر دبا دیا کھٹاک کی آواز ابھری لیکن اس مرتبہ را نقل سے گولی نہیں نکلی۔ اگلی را نقل کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ پاٹے نے گالی بکتے ہوئے را نقل پھینک دی اور ٹیلے کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ قابوس اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑا، لیکن پاٹے ٹیلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ قابوس، پاٹے والی را نقل اٹھا کر دوبارہ بھیڑیے کے قریب آگیا۔ ندیم وغیرہ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ندیم نے پاٹے والا بیگ برف سے اٹھا لیا تھا۔

”ہمیں اس لحاظ سے تو پاٹے کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اس عفریت کو ختم دیا جس نے ہمارے ذہنوں پر موت کا خوف طاری کر رکھا تھا۔“ ندیم بولا۔

”لیکن پاٹے ہمارے لئے اس بھیڑیے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ ابھی اس پاس پستول موجود ہے۔“ قابوس نے جواب دیا اور پاٹے والی را نقل محسن کی طرف دے دی۔

وہ لوگ دیر تک بھیڑیے کی لاش کا معائنہ کرتے رہے جس نے کئی روز تک ان کا کیا تھا۔ ان کے چند ساتھی اس کا شکار ہوئے تھے، جبکہ بھیڑیے کا ایک ساتھی بھی ان ہاتھوں مارا گیا تھا اور بالآخر وہ خود بھی شکار ہو گیا تھا۔

ندیم نے اپنے بیگ میں سے ایک بھرا ہوا میگزین نکال لیا۔ پاٹے والی را نقل کا میگزین نکال کر پھینک دیا اور اس میں نیا میگزین فٹ کر کے را نقل دوبارہ محسن کے

لگے۔ ویسے اب انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کے مصائب کا دور ختم ہونے والا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ کل وہ کسی نہ کسی بستی تک پہنچ جائیں گے۔ انہیں صحیح راستہ مل گیا تھا۔

وہ رات بھی پہرے داری کے نظام کے تحت گزاری گئی۔ رات کے آخری پہر محسن کی ڈبوئی تھی۔ وہ آگ کے قریب چٹائی دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ رات بھر آگ جلتی رہنے سے غار کی فضا خاصی خوشگوار ہو گئی تھی۔ محسن بیٹھے بیٹھے اد نگاہ کیا۔

ایک شہر کی آواز سن کر وہ جاگ گیا۔ ندیم وغیرہ بھی جاگ گئے تھے۔ غار کے باہر دن کی روشنی پھیل گئی تھی اور غار کے دہانے کے عین سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے لمبے لمبے بھالے تھے جن کے آگے لوہے کی برچھیاں لگی ہوئی تھیں۔ محسن نے جلدی سے اپنی رائفل اٹھالی۔

”نہیں!“ ندیم چیخا۔ ”گولی مت چلانا۔“

محسن نے رائفل ہاتھ سے چھوڑ دی اور غار کے سامنے کھڑے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کے حلیے دیکھ کر خوفزدہ ہونے کے باوجود محسن کے ہونٹوں پر خفت کی مسکراہٹ آگئی تھی۔ ان کا لباس تو عجیب تھا ہی چروں کی بیت بڑی مضحکہ خیز تھی۔ داڑھی نہ مونچھیں۔ گنجا سر اور بھنوں بھی نہ ارد۔

ان میں سے ایک آدمی نے بھالے کے اشارے سے انہیں ایک طرف جمع ہونے کو کہا اور دوڑتا ہوا غار کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا جبکہ دوسرے بھالے تانے کھڑے رہے۔ غار میں جانے والا شخص جلد ہی واپس آگیا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے عجیب سی زبان میں کچھ کہا۔ یہ زبان قابوس یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ قابوس نے شیناز بان اور دوسری زبانوں میں ان سے ”ہا ہا“ کر رہا اس کی بات نہیں سمجھ سکے۔ البتہ غار کا معائنہ کرنے والے اس شخص نے ناسلے سے اشارہ کیا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔

ان میں سے کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی کہ وہ تو پہلے ہی انسانوں کی صورت دیکھنے کو ترس گئے تھے۔ انہوں نے اپنا اپنا سامان سمیٹا اور بیگ کندھوں پر لاد کر ان کے ساتھ چل دیئے۔ گنجوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

چیکو خوفزدہ تھی۔ مگر ندیم وغیرہ اسے تسلی دے رہے تھے کہ اب ڈرنے کی ضرورت

تو اندازہ ہوتا تھا جیسے ایک دوروز پہلے ہی یہاں آگ جلائی گئی ہو۔

محسن نے لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ قابوس ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر غار کا معائنہ کرنے لگا۔ تقریباً دس گز آگے جا کر غار دائیں طرف مڑ گیا۔ قابوس جیسے ہی اس طرف گھوما اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ یہاں جانوروں کی کھالوں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ قابوس اور آگے بڑھ گیا اور کھالوں کو چھو کر دیکھنے لگا۔ یہ چیتے کی کھالیں تھیں اور حیرت انگیز طور پر نرم اور ملائم تھیں جیسے کسی کیمیکل کے ذریعے انہیں محفوظ کیا گیا ہو۔ قابوس نے چھو کر دیکھا لیکن ان کھالوں میں ذرا بھی بو نہیں تھی۔

قابوس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کا شعلہ کم ہو گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس آگیا اور اپنے ساتھیوں کو چیتوں کی کھالوں کے اس ذخیرے کے بارے میں بتانے لگا۔

”چیتوں کی کھالیں؟“ ندیم حیرت سے بولا۔ ”لیکن اس علاقے میں ہمیں تو کوئی چیتا نظر نہیں آیا۔“

”ہمیں کوئی چیتا نظر آیا نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس غار میں چیتوں کی کھالیں کس نے جمع کیں؟ ظاہر ہے یہ انسانوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم انسانوں کی کسی بستی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ آؤ! میں تمہیں وہ کھالیں دکھاؤں۔“ قابوس نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی الاؤ میں پھینک دی اور وہاں سے دوسری جلتی ہوئی لکڑی اٹھالی۔

ایک جلتی ہوئی لکڑی محسن نے بھی اٹھالی تھی۔ وہ سب ان شعلوں کی روشنی میں چلے ہوئے غار کے ایک دوسرے حصے میں آگئے۔ چیتوں کی کھالیں دیکھ کر وہ واقعی حیران ہوئے تھے۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس علاقے میں چیتے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ کسی چیتے سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔“ ندیم بولا۔

”یہاں کے چیتے اجنبیوں سے پردہ کرتے ہوں گے۔“ محسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہ لوگ دوبارہ غار کے بیرونی حصے میں آگئے اور تازہ صورت حال پر تبصرہ کرنے



بستی کے کچھ لوگ اور بچے اس پنجرے کے گرد جمع تھے لیکن شور کی آواز سن کر وہ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور پھر بچے اور بستی کے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ اس طرح ناچ رہے تھے جیسے انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہوں۔ اس بستی کے لوگوں کی ہیئت ان لوگوں سے مختلف نہیں تھی جو انہیں پکڑ کر لائے تھے۔ کلین شیو، گنبے سر اور بھنویں تک صاف تھیں۔ بچوں کی بھنویں بھی صاف تھیں اور ان کے سر بھی منڈے ہوئے تھے۔

انہیں بستی کے چوک میں روک لیا گیا۔ مچیکو ندیم کے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔ خوف سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ ندیم اور قابوس وغیرہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ہر مکان کے دروازے پر چیتے کی کھال لٹکی ہوئی تھی۔ ان کے گرد جو لوگ جمع تھے ان میں جوان لڑکیاں اور ادھیڑ عمر عورتیں بھی تھیں۔ عورتوں کے سر اور بھنویں بھی صاف تھیں اور انہیں جسم کی مخصوص ساخت ہی سے پہچانا جاسکتا تھا۔

بستی کے لوگوں کے لباس بھی چیتے کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔ جسم کے زیریں حصوں پر گھاگھرے تھے اور بالائی حصوں پر کھالیں اس طرح لپیٹی گئی تھیں جیسے ساڑھی کا پلو لپیٹا جاتا ہے۔ ندیم کے اندازے کے مطابق ایک لباس میں کم از کم چار کھالیں استعمال ہوئی تھیں لیکن ان سب کو حیرت تھی کہ بستی والوں کے پاس چیتوں کی کھالیں اتنی کثیر تعداد میں کہاں سے آگئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے یہاں چیتوں کی کھالیں تیار کرنے کی کوئی فیکٹری لگائی گئی ہو۔ انہوں نے اس غار میں بھی کھالوں کا ڈھیر دیکھا تھا جہاں انہوں نے پچھلے رات گزاری تھی۔ وہ سمجھنے انہیں غار سے پکڑ کر دن بھر کے سفر کے بعد اس بستی میں پہنچے تھے لیکن راستے میں انہیں کہیں بھی کوئی چیتا نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی ان پہاڑوں میں کہیں چیتے یا شیر کی دھاڑ سنائی دی تھی لیکن کھالوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ اس علاقے میں شیروں اور چیتوں کی بہتات ہوگی۔

انہیں چوک میں روک لیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد چند آدمی اس طرح کے دو بڑے بڑے پنجرے کہیں سے اٹھا کر وہاں لے آئے۔ ان پنجروں کو بھی پانڈے والے پنجرے کے قریب رکھ دیا گیا۔ ایک پنجرے میں مچیکو اور محسن اور دوسرے میں ندیم اور قابوس کو بند کر دیا گیا۔

نہیں۔ وہ ان گنبوں کے توسط سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ وہر کے بغیر پورا دن چلتے رہے۔ ان کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ مگر انہیں چلنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ بالآخر غروب آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے وہ ایک بستی میں پہنچ گئے۔ بستی کے لوگوں کو دیکھ کر انہیں مزید حیرت ہوئی۔ وہ سب کلین شیو اور گنبے تھے اور سب کی بھنویں غائب تھیں۔ وہ لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے اور بستی والے انہیں۔

بستی کے چوک پر پہنچ کر ان سب کو اپنے سینوں میں سانس رکھتے ہوئے محسوس ہونے لگی۔ چوک کے وسط میں لکڑی کی موٹی موٹی سلاخوں کا ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا اور اس پنجرے میں پانڈے قید تھا۔

☆

عجیب سی بستی تھی اور اس کے لوگ عجیب تر۔ وہ بستی پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل تھی اور گھروں کی ساخت بھی بڑی عجیب تھی۔ کراچی میں رہتے ہوئے ندیم کو ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے ساتھ قہر کے صحرائیں جانے کا موقع ملا تھا۔ اس قسم کے گھر اس نے قہر کے صحرائیں دیکھے تھے۔ جھاڑیوں کی شاخوں اور گھاس پھوس سے بنے ہوئے گول جھونپڑے جن کی چھتوں پر نوکدار جھاڑیاں اس طرح بندھی ہوئی تھیں کہ وہ دور سے مور کی کلنی کی طرح نظر آتی تھیں۔

اس بستی کے لوگ بھی بالکل اسی طرح کے تھے لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ قہر کے صحرائے جھونپڑے گھاس پھوس کے بنے ہوئے تھے اور اس بستی کے مکان چڑ کے درختوں کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور ان کی چھتیں نوک دار نہیں بلکہ ہموار تھیں۔ یہ چھتیں بھی درختوں کے تنوں ہی کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر بنائی گئی تھیں اور ان پر شاخیں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ دیکھنے میں آئی تھی کہ اس بستی کے یہ مکان بڑے سلیقہ سے بنائے گئے تھے۔ ان کے درمیان باقاعدہ راستے جھونپڑے گئے تھے اور درمیان میں ایک بہت بڑا چوک سا بن گیا تھا جہاں عام طور پر بستی کے لوگ جمع ہو کر گپ شپ کرتے ہوں گے یا بچے کھیلتے ہوں گے۔ لیکن اس وقت تو وہاں لکڑی کی موٹی موٹی سلاخوں کا ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا جس میں پانڈے بند تھا۔

لیکن اس زبان کا تو ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پتہ نہیں کون سی زبان بول رہے ہیں یہ لوگ..... گنجوں کے اس قبیلے کی بستی کے بارے میں تو کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ مختلف علاقوں کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن کسی سے کبھی اس بستی کا ذکر نہیں سنا۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے ہم کسی انجانی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

”اؤئے!“ پانڈے کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ ”دیکھو! وہ ان کا سردار آ رہا ہے۔ اگر تم لوگ اسے راکفل کی زد پر گرفت میں لے لو تو ہم لوگ ان پنجروں سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”ہم!“ قابوس نے ہلکا سا ہتھلہ لگایا۔ ”ہم لوگ تو شاید ان پنجروں سے نجات حاصل کر لیں لیکن تم یہیں رہو گے۔ ان کے پیٹ میں۔ میں سچ کہتا ہوں یہ لوگ تمہیں بھون کر کھا جائیں گے۔“

وہ لوگ دائیں طرف دیکھنے لگے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ گنجوں کی اس بستی کا سردار اپنے قبیلے والوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے سر پر سنہری بال تھے۔ لمبے ریشمی سنہری بال، جو عورتوں کی طرح اس کی پشت پر لہرا رہے تھے۔ اس کی بھنویں بھی سنہری تھیں۔ اور مونچھیں..... مونچھیں دیکھ کر تو ندیم بمشکل اپنی ہنسی روک سکا تھا۔ ہونٹوں کے دونوں گوشوں پر سنہری مونچھیں چوہے کی دم کی طرح اس کی ٹھوڑی پر لٹکی ہوئی تھیں۔ شیو خوب رگڑ رگڑ کر بنایا گیا تھا۔ ٹھوڑی پر ہلکا سا سبزہ پن جھلک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اس کے بال لمبے اور بالکل سیاہ تھے۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں اور موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے ہموار دانت۔ وہ بے حد حسین عورت تھی۔ وہ اپنی بستی کی تمام عورتوں سے دراز قامت تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ جبکہ سردار کی عمر چالیس سے زیادہ نہیں تھی۔

ان دونوں نے بھی چپیتے کی کھال کا لباس پہن رکھا تھا۔ عورت کا ایک شانہ برہنہ تھا۔ اگر وہ کسی مہذب علاقے میں ہوتی تو مردوں کی ہوس بھری نظریں اس پر مرکوز رہتیں۔ لیکن یہاں تمام مردوں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

سردار اور اس کے ساتھ نیلی آنکھوں والی حسین عورت، جو یقیناً اس کی ملکہ تھی ان کے پنجرے کے قریب آ کر رک گئے۔ قبیلے کے لوگ ان سے چند قدم دور ہی رک گئے

”یہ کون سی بستی ہے؟“ ندیم نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں نے تو اس قسم کی بستی کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔“ قابوس نے جواب دیا۔

”ہم کسی دوسرے سیارے پر تو نہیں پہنچ گئے؟“ دوسرے پنجرے سے محسن نے آواز لگائی۔

”یقیناً تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“ ندیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر پانڈے والے پنجرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم لوگوں کے پاس تو راکفلین تھیں ان کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟ حالانکہ تم لوگ انہیں آسانی سے قتل کر کے نکل سکتے تھے۔ یہ لوگ ہتھیاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی لئے تو تم لوگوں کو پنجروں میں بند کرتے ہوئے ان لوگوں نے راکفلوں پر قبضہ نہیں کیا۔“ پانڈے نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ پنجرے کی سلاخیں پکڑے بیٹھان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے پاس بھی تو پستول تھا۔ تم کیسے ان کے ہتھے چڑھ گئے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”میں نے ان کے دو آدمیوں کی لاشیں گرا دی تھیں۔ اگر میرا پستول خالی نہ ہوتا تو یہ لوگ میرے قریب نہیں آ سکتے تھے۔“ پانڈے نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں تو یہ لوگ اب زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شاید بھون کر کھا جائیں گے۔ وہ دیکھو! بستی کے لوگ جلانے کے لئے ایندھن جمع کر رہے ہیں۔“ قابوس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

کچھ گننے پنجروں سے کچھ فاصلے پر چوک میں موٹی موٹی لکڑیاں جمع کر رہے تھے۔ اس وقت اگرچہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ لیکن بہت سے بچے، مرد اور عورتیں اب بھی ان کے پنجروں کے گرد جمع تھے اور کسی عجیب سی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

”یہ کون سی زبان بول رہے ہیں، شینیا یا برشاسکی؟“ ندیم نے پوچھا۔

”میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔“ قابوس نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات صاف طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ ”یہ نہ تو برشاسکی زبان بول رہے ہیں اور نہ شینا..... میں بلنت، کشمیری اور لدانخی زبانیں بھی سمجھتا ہوں اور بول بھی سکتا ہوں

اور ملکہ کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک گھنٹے نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور ان دونوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اپنی رانگلیں لے کر بڑی پھرتی سے باہر آ گئے۔ ان کے بیک ابھی ان کے کندھوں پر ہی تھے۔

چوک میں اب الاؤ روشن کر دیا گیا تھا اور لوگ الاؤ کے گرد جمع ہو گئے تھے مگر ان سب کی نظریں اب بھی انہی پر مرکوز تھیں۔

وہ دونوں گھنٹے محافظ قابوس اور ندیم کو لے کر بستی سے نکل کر تقریباً پچاس گز دور ایک چٹان کی طرف چلے گئے۔ اس چٹان کے ساتھ ملا ہوا ایسا ہی لکڑی کا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ اس جھونپڑے کے دروازے پر بھی چیتے کی کھال کا پردہ پڑا ہوا تھا اور دائیں بائیں دو مشعلیں جل رہی تھیں۔ دروازے کے سامنے ایک گنجا محافظ بھی کھڑا تھا جس نے لوہے کی نالہ والا بھالا اٹھا رکھا تھا۔ ان کے قریب آتے ہی گھنٹے محافظ نے پردہ اٹھا دیا اور وہ دونوں اپنے ساتھ آنے والے محافظوں کے ہمراہ اندر داخل ہو گئے۔ ہٹ کے اندر زمین پر لٹائیں بیٹھی ہوئی تھیں اور پچھلی طرف چٹان کی دیوار میں ایک راستہ نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ اندر داخل ہو گئے اور پھر ان دونوں کی آنکھیں حیرت کے باعث کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

یہ کوئی قدرتی غار نہیں تھا بلکہ چٹان کے اندر سے کاٹ کر باقاعدہ مکان بنایا گیا تھا۔ دو دروازے دریاں اور کئی کمرے تھے۔ چٹانی دیواروں کو رگڑ رگڑ کر اس طرح چکنا چکنا دیا گیا تھا بے پلستر کیا گیا ہو۔ رباداریوں میں دیواروں پر جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں لیکن دھواں لکل نہیں تھا۔ غالباً چھت کی طرف ایسے طاقے سے بنے ہوئے تھے کہ دھواں ان کے تہ اوپر چھت میں کہیں غائب ہو رہا تھا۔

محافظ انہیں ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں سنہری بالوں والا قبیلے کا سردار اور اس کی ایک مسند پر براجمان تھی۔ فرش پر بھی کھائیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سردار کے اشارے پر لوگ بیٹھ گئے۔

”تم لوگ کون ہو اور اس طرف کیسے آئے؟“ سردار نے قابوس کی طرف دیکھا۔ قابوس چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے پوری داستان کہہ ڈالی۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم نکلے تو گمشدہ جہاز اور اس کے مسافروں کی تلاش میں تھے لیکن خود بھٹک گئے۔“

سے بہننے میں اس سفید بھیڑیے کا بھی بڑا ہاتھ ہے جو ہماری جان کا دشمن بن گیا تھا۔

تھے۔ البتہ سردار کے چار محافظ بھالے سنبھالے ان کے قریب مستعد کھڑے تھے۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟ اور ہمیں جانوروں کی طرح ان پنجروں میں بند کیوں کیا گیا ہے؟“ قابوس نے سردار کی طرف دیکھتے ہوئے یہ الفاظ پہلے شینا پھر برشا سکی اور پھر کئی مختلف زبانوں میں دہرائے تھے جو ان دادیوں میں بولی جاتی تھیں۔

سردار عجیب سی مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ندیم کی طرف دیکھا اور اگلے پنجرے کے پاس چلا گیا جس میں چیکو اور محسن بند تھے۔ چیکو کو دیکھ کر سردار کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر اپنے محافظوں کی طرف مڑ کر کچھ کہا۔

دو محافظوں نے آگے بڑھ کر پنجرہ کھول دیا اور چیکو کو پکڑ کر باہر کھینچے گئے۔ چیکو مزاحمت کرنے لگی۔ وہ خوف سے بری طرح چیخ رہی تھی۔ وہ اپنا بازو چھڑا کر پنجرے کے دوسری طرف سلاخوں سے جا لگی۔ گنجا محافظ اندر گھس گیا اور چیکو کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ سردار نے غصیلی آواز میں کچھ کہا۔ گنجا محافظ اب چیکو کو گھسیٹنے کی بجائے اسے اس طرح باہر لانے کی کوشش کرنے لگا کہ زیادہ کھینچا تانی نہ ہو۔ وہ اپنی زبان میں کچھ بولتا بھی جا رہا تھا۔ سردار کا اشارہ پا کر دوسرا محافظ بھی پنجرے میں گھس گیا اور وہ دونوں چیکو کو اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے پنجرے کے دروازے کے قریب لے آئے۔ باہر کھڑے ہوئے دو محافظوں نے چیکو کو سنبھال لیا اور اسے اٹھا کر جھونپڑوں میں کسی طرف غائب ہو گئے۔ سردار اور اس کی ملکہ دوبارہ ندیم اور قابوس والے پنجرے کے سامنے آ گئے۔

”تمہارا سردار کون ہے؟“ گنجوں کے سردار نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ الفاظ ملی جلی لداہنی اور شینا زبان میں کہے تھے۔

”یہ..... یہ ہے ہمارا سردار۔“ قابوس نے ندیم کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔ اب کم از کم یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھا سکیں گے۔

گنجوں کے سردار نے اپنے آدمیوں سے کچھ کہا اور ملکہ کو اشارہ کرتا ہوا واپس چلا گیا۔ چوک میں مکانوں کے سامنے جگہ جگہ مشعلیں روشن کر دی گئی تھیں جن سے عجیب ناگوار سی بو اٹھ رہی تھی۔ ان شعلوں میں غالباً کسی جانور کی چربی جلائی جا رہی تھی۔ سردار

اس سے بچنے کے لئے ہم راستے بدلتے رہے اور پھر ہمارا ایک ساتھی غداری پر اتر آیا۔ اس کی نیت شروع ہی سے خراب تھی اور وہ ایک خاص مقصد کے تحت ہماری پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ اس نے ہمارے ایک آدمی کو بھی کھڈ میں گرا کر مار دیا اور اب وہ ہم سب کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ ہمارا وہ ساتھی اب تمہاری قید میں ہے۔

”وہ واقعی برا آدمی ہے۔“ سردار نے کہا۔ ”اسے کل شام سے ذرا پہلے یہاں سے ایک میل دور چٹانوں میں پکڑا گیا تھا۔ ہمارے قبیلے کی ایک عورت چشماں پتھر جمع کرنے کے لئے ان چٹانوں میں گھوم رہی تھی کہ تمہارے آدمی نے اسے پکڑ لیا، اس کے ساتھ زیادتی کی اور جب ہمارے قبیلے کے قانون کے مطابق قتل کرنے والے کو تو تھوڑی سی سزا دے کر معاف کر دیا جاتا ہے لیکن غداری کرنے اور عورت کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جاتا۔ اس کے لئے بھی میں نے موت کی سزا تجویز کی ہے اور کل اسے موت کی سزا دے دی جائے گی۔“

”اسے ایسی ہی سزا ملنی چاہئے۔“ قابوس نے کہا۔ وہ ندیم کو بھی اردو میں سردار کی باتوں سے آگاہ کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سردار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے اس علاقے میں کوئی چیتا نہیں دیکھا لیکن یہاں چیتوں کی کھالوں کی بہتات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔“

”اس پہاڑ کے پیچھے چیتے اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔“ سردار نے جواب دیا۔ ”نشیب میں واقع وہ وادی بہت ہی خطرناک ہے۔ ہمارے آدمی اس وادی میں جا کر چیتوں کا شکار کرتے ہیں اور ان کی کھالیں جمع کر کے بیچ دی جاتی ہیں۔“

”کھالیں بیچ دی جاتی ہیں؟“ قابوس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”یہاں کھالیں کون خریدتا ہوگا؟ کیا قریب میں کوئی اور بستی بھی ہے؟“

”کھالوں کے سوداگر سال میں صرف ایک مرتبہ آتے ہیں۔ بہت دور سے کئی روزانہ مسافت طے کر کے قریب ترین بستی یہاں سے تین دن کی مسافت پر ہے۔ لیکن راستہ ان قدر دشوار اور خطرناک ہے کہ اس طرف کا کوئی آدمی یہاں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”جس طرف سے ہم آئے ہیں اس طرف تو ہم نے کوئی چیتا نہیں دیکھا۔ لیکن جس

ہمارے ہمیں پکڑا گیا تھا وہاں تو کھالوں کا انبار لگا ہوا تھا۔“ قابوس نے بتایا۔

”کیا۔“ سردار اچھل پڑا۔ اس کا چہرہ کچھ اور بھی سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے آواز دے کر ایک گنجنے محافظ کو اندر بلایا۔ اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ محافظ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ محافظ واپس آ گیا اس کے ساتھ محسن بھی تھا۔ یہ بات قابوس کو ندیم اور محسن ہی نے بتائی کہ ان چھ گنجنوں کو پنجرؤں میں بند کر دیا گیا تھا جو انہیں غار سے پکڑ کر لائے تھے اور چند منجے بستی سے باہر کہیں چلے گئے تھے۔

”ہمارے ساتھ جو عورت تھی وہ کہاں ہے؟“ قابوس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”وہ خیریت سے ہے۔ لیکن اب تم لوگ کل شام سے پہلے اسے نہیں دیکھ سکو گے۔“ سردار نے جواب دیا۔

”ایک بات پوچھوں سردار؟“ قابوس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں پوچھو!“ سردار نے کہا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اگر غار میں کھالوں کی موجودگی کی اطلاع غلط ثابت ہوئی تو تم لوگوں کو بھی بھوکے چیتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔ یہاں جھوٹ بولنے والے کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔“

قابوس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چیتے کی وہ کھالیں چوری کر کے اس غار میں بچھائی گئی تھیں اور اگر وہ کھالیں وہاں سے غائب کر دی گئی ہوں گی تو پھر اس کی خیر نہیں۔ اس نے ندیم اور محسن کو بھی سردار کے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا اور وہ انوں بھی دل ہی دل میں دعا مانگنے لگے کہ کھالیں اس غار سے نہ ہٹائی گئی ہوں۔

”تم کیا بات پوچھنا چاہتے تھے؟“ سردار نے قابوس کی طرف دیکھا۔

”آپ دونوں کے علاوہ اس بستی میں سب لوگ گنجنے کیوں ہیں؟“ قابوس نے کہا اور

نیا باری سردار اور اس کی ملکہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ ہمارے بزرگوں کا بنایا ہوا قانون ہے۔“ سردار نے جواب دیا۔ ”بال صرف قبیلے کا اور اس کی ملکہ ہی رکھ سکتی ہے اور کسی مرد یا عورت کو اس کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کا بڑا بیٹا اور قبیلے کی ایک لڑکی، جسے سردار اور ملکہ پسند کریں بال بڑھا سکتے ہیں جو اس کے بعد سردار اور ملکہ بن جاتے ہیں۔“

”اور اس قبیلے کے بزرگ؟ کون تھے وہ لوگ؟ کہاں سے آئے تھے اور انہوں نے

بہت ہی دشوار اور خطرناک ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے اس جگہ کو اپنے لئے محفوظ سمجھا اور یہیں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں درخت بھی تھے، پانی بھی تھا اور جانور بھی جن کے شکار سے پیٹ بھرا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی شادیاں کر دیں اور اس طرح یہاں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ بڑھتی ہوئی آبادی سے انہیں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ اس سے ایک تو خوراک کی قلت پیدا ہوگی اور پھر لوگ یہاں سے دوسرے علاقوں کا رخ کریں گے جس سے پہاڑوں میں چھپی ہوئی اس بستی کا راز فاش ہو جائے گا اور ان کا سکون برباد ہو جائے گا۔ لاما پوری کی عبادت گاہ کے راہب کی حرکتوں سے وہ دونوں بھائی مذہب سے نفرت ہو گئے تھے۔ یہاں ان کا کوئی مذہب نہیں تھا انہوں نے اپنے بچوں کو بھی مذہب سے نا آشنا رکھا، وہ صرف ایک مذہب پر یقین رکھتے تھے۔ طاقت.....! جس کے پاس طاقت تھی وہی مالک و مختار اور آقا تھا۔ طاقت کے بل بوتے پر وہ دونوں بھائی اس بستی پر کنٹرول کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑے سخت قوانین بنائے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اس طرح بستی کی بڑھتی ہوئی آبادی بھی کنٹرول میں تھی۔

لوگ چیتوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ انہوں نے ایک یہ قانون بھی بنایا تھا کہ سردار اور ناک کی ملکہ کے علاوہ بستی کا کوئی مرد یا عورت سر کے بال نہیں رکھے گا۔ ان کی ہمنویں تک ناف کرا دی جاتی تھیں۔ ہمارے ان دو بزرگوں کے بنائے ہوئے قوانین آج تک جن لوگوں نے توں چلے آرہے ہیں۔ ان میں بعد میں قبیلے کے مفاد میں ایک دو تبدیلیاں کی گئیں۔

نئے لوگ جانوروں کا گوشت کھا کھا کر تنگ آ گئے تھے۔ وہ اناج کو ترس گئے تھے۔ اس کا ٹیٹا نکالا گیا کہ چیتے شکار کر کے ان کی کھالیں فروخت کی جانے لگیں۔ کھالوں کا سوداگر رامیں صرف ایک مرتبہ اناج اور ہماری ضرورت کی دوسری چیزیں لے کر یہاں آتا تھا۔ ان چیزوں کے بدلے چیتوں کی کھالیں لے جاتا ہے۔ تم جانتے ہو چیتے کا شکار کتنا آگ ہے۔ ہر سال ہمارے کئی آدمی خود چیتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اس طرح بستی کی

کنٹرول میں بھی مدد ملتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے آبادی کو محدود رکھنے کا ایک قانون بنایا تھا جو پہلے بتا چکا ہوں کہ سال میں جتنے بچے پیدا ہوں اتنے ہی بوڑھوں کو

چیتوں کے سامنے ڈال دیا جائے۔

رہائش کے لئے یہ ویرانہ ہی پسند کیوں کیا؟ قبیلے کی آبادی اس قدر محدود کیوں ہے؟ قابوس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”قبیلے میں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ہر سال اتنے ہی بوڑھوں کو بھوکے چیتوں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح قبیلے کی آبادی محدود تعداد سے آگے نہیں بڑھنے دی جاتی اور ہمارے قبیلے کے بزرگ....“ سردار نے خاموش ہو کر گہرا سانس لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میرے قبیلے کے بزرگ تین سو سال پہلے لداخ سے آئے تھے۔ وہ شانگری لادو کے دوسری طرف دشوار گزرا پہاڑوں میں واقع لاما پوری کی عبادت گاہ سے ملحق بستی میں آباد تھے۔ یہ لداخ کی قدیم ترین اور سب سے پرانی عبادت گاہ ہے۔ یہیں پر وہ غار بھی ہے جہاں بدھ مذہب کے ایک عظیم پیشوا ناروپا نے برسوں ریاضت کی تھی۔ یہ بڑی پرسکون بستی تھی لیکن عبادت گاہ کا نیا راہب سب سے مختلف ثابت ہوا۔ وہ جوان اور جو شیلہ قسم کا آدمی تھا۔ سنا ہے کہ اسی نے بوڑھے راہب کو قتل کر کے عبادت گاہ پر قبضہ کیا تھا۔ نیا راہب پہلے عبادت گاہ میں رہنے والی عورتوں پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ جب ان سے دل بھر گیا تو بستی کی عورتوں پر نگاہ رکھنے لگا۔ اس نے کئی عورتوں کو برباد کیا۔ راہب کی ان بد معاشیوں کے باوجود بستی کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے کیونکہ وہ ان کا مذہبی پیشوا تھا۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں بول سکتے تھے۔ راہب نے اپنے ماتحت بد معاش راہبوں کا ایک گروہ بھی بنا رکھا تھا۔ اگر بستی کا کوئی شخص بڑے راہب کی غیر اخلاقی سرگرمیوں پر اعتراض کرتا تو اس کے گروے اس شخص کو مار مار کر ختم کر دیتے۔ لیکن ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بستی میں رہنے والے دو بھائیوں نے عبادت گاہ کے بڑے راہب کو قتل کر دیا۔ اس سے صرف ایک دن پہلے راہب کے گروے کے ان میں سے ایک بھائی کی جوان بیٹی کو اٹھا کر لے گئے تھے اور دوسرے دن لڑکی کی لاش پہاڑوں میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ ان بھائیوں میں سے ایک کا نام زوجی اور دوسرے کا نام فاتو تھا۔ ان دونوں نے اپنی لڑکی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے عبادت گاہ کے بڑے بد معاش راہب کو قتل کر دیا اور رات کے اندھیرے میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر بستی سے فرار ہو گئے۔“

دشوار گزرا پہاڑوں اور خطرناک گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے کئی مہینوں کے بعد اس جگہ پہنچ گئے۔ یہ جگہ کسی بھی آبادی سے کئی روز کے فاصلے پر ہے اور یہاں تک آنے والے راستے

بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کرنے کا یہ بڑا غامض طریقہ ہے۔“ قابوس نے سردار

گیا۔ پانڈے ان کے ملک کا دشمن تھا اور اس نے گنجوں کے اس قبیلے سے بھی دشمنی مول لے لی تھی اس نے نہ صرف ان کی ایک عورت کے ساتھ زیادتی کی تھی بلکہ ان کے دو آدمیوں کو بھی قتل کر دیا تھا اس طرح وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ ندیم نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس سنہری زلفوں والے سردار سے پوچھو کہ جیکو کہاں ہے اور اسے کچھ کھانے کو دیا گیا ہے یا نہیں؟“

قابوس نے سردار سے پوچھا تو وہ چڑچڑ منہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”اس خوبصورت عورت کی تم فکر مت کرو۔ وہ کھانا کھا چکی ہے اور اس وقت آرام کر رہی ہے۔“

جیکو کے لئے خوبصورت کا لفظ سن کر ندیم ٹھٹھا کھٹا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا تھا کہ عورت ہونے کی وجہ سے جیکو کو ان سے الگ رکھا گیا ہے۔ لیکن اب وہ کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کہیں جیکو پر سردار کی نیت تو خراب نہیں ہو گئی تھی؟ کئی ہفتوں تک ویرانوں میں بھٹکے اور صعوبتیں برداشت کرنے سے جیکو اگرچہ کمزور ہو گئی تھی لیکن وہ اب بھی بے حد حسین تھی۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھ کر سردار کی رال ٹپک پڑی ہو۔ لیکن ندیم کو یقین تھا کہ وہ جیکو کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ ایک عورت کے ساتھ زیادتی کرنے پر ہی اس کے بزرگوں نے اپنی قدیم ترین عبادت گاہ کے راہب کو قتل کر دیا تھا اور اپنے آباؤ اجداد کی بستی چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ اور پھر پانڈے کی مثال اس کے سامنے تھی جس نے اس قبیلے کی ایک عورت کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اسے موت کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ گنجوں کے اس قبیلے میں عورت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ظاہر ہے اس صورت میں سردار بھی اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

کھانے کے بعد انہیں ایک اور کمرے میں بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی فرش پر چیتے کی ٹالیں بچھی ہوئی تھیں اور اوڑھنے کے لئے بھی کھالیں ہی موجود تھیں۔ وہ اوگ بیٹھے تپ کر رہے۔ کمرے کے دروازے پر ایک گنجا لکڑی کا بھالا لئے ٹہل رہا تھا لیکن وہ گنجا کی باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا اس لئے وہ اطمینان سے بول رہے تھے۔

”مجھے تو لگتا ہے جیکو کے لئے اس سنہری زلفوں والے سردار کی نیب میں کچھ فتور آگیا

کے خاموش ہونے پر کہا۔  
”مجبوری ہے۔“ سردار نے کندھے اچکائے۔ اس کے سوا اور کوئی طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”تم نے شیناز بان کہاں سے سیکھی؟“ قابوس نے پوچھا۔  
”کھالوں کا سوداگر ہر سال یہاں آتا ہے۔ اس سے اور اس کے آدمیوں سے صرف میں ہی بات کرتا ہوں۔ قبیلے کے کسی بھی شخص کو ان سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ویسے بھی میں کئی مرتبہ قریبی بستی میں جا چکا ہوں جو یہاں سے تین دن کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کے لوگوں سے بھی صرف میں ہی بات کرتا ہوں میرے ساتھ جانے والے خاموش ہی رہتے ہیں۔ انہیں کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“ سردار نے کہا۔

”کیا ہمیں کسی بستی تک پہنچایا جاسکتا ہے؟“ قابوس نے پوچھا۔  
”اس کا فیصلہ دو تین دن بعد کیا جائے گا۔“ سردار نے جواب دیا۔  
اس دوران ایک گھنٹے نے آکر سردار سے کچھ کہا۔ سردار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں بھی اٹھ گئے۔ سردار نے ملکہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ سب اس کمرے سے نکل کر مختلف راہداریوں میں چلتے ہوئے ایک اور کمرے میں آگئے جہاں فرش پر کھالوں کا دسترخوان بچھا ہوا تھا اور بڑی بڑی طشتریوں میں کسی جانور کی بھنی ہوئی رانیں رکھی ہوئی تھیں۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے ان کی بھوک چمک اٹھی تھی لیکن ان لوگوں نے اس وقت تک کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا جب تک سردار نے پہل نہیں کی تھی۔

سردار اور اس کی ملکہ بڑے وحشیانہ طریقے سے کھا رہے تھے۔ سردار کے منہ سے چڑچڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے منہ سے رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی گوشت سے نکلنے والی چکنائی سے تر ہو گئی تھی۔ ملکہ کا بھی کچھ بچہ حال تھا۔

قابوس، ندیم اور محسن بھی مریجوں کی طرح گوشت کی بوٹیاں دانتوں سے نوج نوج کھا رہے تھے۔ کئی روز بعد انہیں اس قدر لذیذ بھنا ہوا گوشت ملا تھا اور وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ گوشت کھاتے ہوئے ندیم کو دفعہ جیکو کا خیال

ہے ورنہ اسے ہم سے علیحدہ رکھنے کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی جبکہ قبیلے کی دوسری عورتیں مردوں کے ساتھ ہی گھل مل کر رہ رہی ہیں۔“ ندیم نے کہا۔



”سردار کی بیوی چیکو سے کہیں زیادہ حسین ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”اور یوں بھی اس قبیلے کی دوسری عورتیں بھی بہت خوبصورت ہیں۔ موٹی موٹی ہر نیوں جیسی آنکھیں، سرخ ہونٹ اور دلکش نفوس۔ اگر کسی ہے تو صرف زلفوں کی۔ ایسی حسین عورتوں کے ہوتے ہوئے اسے چیکو جیسی اجنبی عورت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

”ہمارے ملک کی عورتیں کتنی حسین، وفا شعار اور محبت کرنے والی ہیں۔ ان میں کس چیز کی کمی ہے؟ لیکن ہمارے بہت سے مرد کسی بھی غیر ملکی عورت کو بیاہ کر لے آتے ہیں۔ تو یوں سمجھو کہ سردار بھی ایک غیر ملکی عورت میں دلچسپی لینے لگا ہے۔“ قابوس نے کہا۔ اس کا یہ غیر ملکی والا فلسفہ واقعی بڑا دلچسپ تھا۔

”اگر واقعی گنجوں کا یہ سردار چیکو میں دلچسپی لینے لگا ہے تو یہ بہت برا ہو گا۔“ ندیم نے کہا۔ ”اس طرح ہمیں چیکو سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور ہمیں چیکو کے بغیر ہی یہاں سے ہٹا پڑے گا۔“

”چیکو ہمارے ساتھ جائے گی ورنہ....“ قابوس کہتے کہتے رک گیا۔

”ورنہ کیا؟“ محسن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ورنہ ہم بھی داڑھی، مونچھیں، بھنویں اور سر منڈوا کر اس قبیلے میں شامل ہو جائیں گے۔ اس قبیلے کی عورتوں سے شادی کر لیں گے۔ ہمارے بچے ہوں گے اور جب ہم بڑے ہو جائیں گے تو ہمیں بھوکے چیتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔“

قابوس کی اس بات پر ان دونوں نے خوب دل کھول کر ہنسنے لگا دیا تھا۔ دروازے پر آتے ہوئے محافظ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ ہنسنے لگا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ کیونکہ ان کی مرضی کے بغیر تو ہم یہاں سے نکل سکیں گے۔“ محسن نے کہا۔

مارنے لگے۔ دفعۃً قابوس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ غراب سے پانی میں جاگرا۔ اس کی چیخ اور عورتوں کے قہقہوں کی آوازیں سن کر ندیم اور محسن نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ دو گنجی عورتیں قابوس کو تالاب کی گہرائی کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ وہ اس طرح قہقہے لگا رہی تھیں جیسے کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہی ہوں۔ قابوس اپنے آپ کو چھڑا کر کنارے کی طرف لپکا۔ ندیم اور محسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی پھرتی سے اسے تالاب سے باہر نکال لیا اور وہ تینوں بدحواس ہو کر جھونپڑی کی طرف دوڑے۔ عورتوں کے قہقہے ان کا پیچھا کر رہے تھے اور ان کے ساتھ آنے والا گنجا بھی قہقہے لگا رہا تھا۔

”کم بخت!“ قابوس ایک جگہ رکتے ہوئے بولا۔ ”وقت سے پہلے ہی مرادینا چاہتی تھیں۔“

ندیم اور محسن نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ قابوس کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ ایک گنجا اسے ایک جھونپڑے میں لے گیا۔ اس نے دو کھالیں اس کی طرف پھینک دیں اور جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

پھر ان تینوں کو کھانے کے لئے دیا گیا اور گنجے، اپنے قیدی پانڈے کو لے کر بستی سے باہر لے جانے لگے۔ ندیم وغیرہ اور سردار بھی ان کے ساتھ تھا۔ قابوس نے پانڈے کو بتا دیا تھا کہ اسے بھوکے پیٹوں کے سامنے ڈالنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے اور پانڈے کبھی چیخ کر اور کبھی رورو کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا کہ اسے بچالیا جائے۔ مگر کسی پر اس کی چیخ و پکار کا اثر نہیں ہوا اور گنجے محافظ اسے گھسیٹ کر چلتے رہے۔

وہ بستی کے پچھلی طرف پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رُک گئے۔ یہاں کسی آتش فشاں کی طرح ایک بہت بڑا دھانہ تھا جس کے اندر کی طرف کی دیواریں تقریباً پینتھن درجے کا زاویہ بناتی ہوئی گہرائی میں چلی گئی تھیں۔ اور اس کنویں کے اندر سے چیتوں کے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گنجے محافظ پانڈے کو لے کر کنارے پر کھڑے ہو گئے۔ پانڈے بری طرح چل رہا تھا۔ سردار کے اشارے پر پانڈے کے ہاتھ میں ایک نیزہ دے دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی پانڈے کو عمودی ڈھلان پر دھکیل دیا گیا۔

”اچھا بابا! اب سو جاؤ۔ دیکھتے نہیں کئی روز بعد کتنا آرام دہ بستر ملا ہے۔ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔“ قابوس نے یہ کہتے ہوئے چیتے کی ایک کھال اوپر اوڑھ لی۔

اور پھر کچھ دیر بعد واقعی وہ لوگ سو گئے۔ وہ دیر تک سوتے رہے۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو انہیں اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ دن ہے یا رات۔ کیونکہ کمرے میں مشعلیں جل رہی تھیں۔

ایک گنجے نے انہیں اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ کمرے اور پھر غار کے سامنے والے جھونپڑے سے بھی باہر آ گئے۔ تیز دھوپ چمک رہی تھی جس سے ایک لمحہ کو ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر تک آنکھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے رہے۔ پھر گنجے کے ساتھ چل پڑے۔

جھونپڑوں کے پچھلی طرف گھومتے ہوئے وہ ایک چٹان کے قریب پہنچ گئے جس سے ایک چھوٹا سا آبشار بہہ رہا تھا۔ پانچ چھ فٹ کی بلندی سے بہنے والا پانی ایک کشادہ اور گہرے تالاب میں جمع ہو رہا تھا اور اس سے آگے دو چھوٹی چھوٹی ندیاں پھوٹ رہی تھیں۔

گنجے نے تالاب کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب شاید یہ تھا کہ وہ منہ ہاتھ دھو لیں اور اگر نہانا چاہیں تو نہا بھی لیں۔ وہ تینوں گنجے کے ساتھ تالاب کے کنارے آ گئے۔ تالاب کے کنارے جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ ان جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے جیسے ہی تالاب کے کنارے پہنچے بری طرح چونک گئے۔

”باپ رے!“ قابوس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

ندیم اور محسن نے بھی ہمبرا کر جلدی سے منہ پھیر لئے تھے۔

قہقہے کی چار گنجی عورتیں تالاب میں نہا رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس پر انہیں حیرت بھی ہوئی تھی۔ ایک طرف تو عورت کا اتنا احترام کہ اسے چھیڑنے والے و موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا اور دوسری طرف یہ حالت۔ تین پھر ندیم کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ چیتے کی کھالیں شاید ستر پوشی کے لئے نہیں، موسمی اثرات سے بچنے کے لئے اوڑھی جاتی تھیں اور یہاں شاید برہنگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

وہ تینوں آنکھیں بند کر کے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے اور منہ پر پانی کے چھپا کے



ندیم کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ اس نے ملکہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی اور سحر زدہ سے انداز میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔

وہ بستی سے نکل کر چھوٹی چھوٹی چٹانوں میں گھومتے ہوئے چلنے لگے۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ رُک گئے۔ ان کے سامنے ایک چھوٹی ندی بہہ رہی تھی۔ پتھروں پر اچھلتے ہوئے پانی کا شور خاموش فضا میں ایک بکا سا ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر پہنچ کر ملکہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس کا اشارہ پا کر ندیم بھی اس سے قدرے ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر ملکہ نے کچھ کہا۔ ندیم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ وہ زبان نہیں تھی جو قبیلے والے بولتے تھے۔ ملکہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے جو زبان استعمال کی تھی اس کا تعلق نہ صرف مہذب دنیا سے تھا بلکہ اس میں انگریزی کے ایک دو الفاظ بھی شامل تھے۔

”ملکہ! تم نے جس زبان میں بات کی ہے اس کا تعلق اگرچہ مہذب دنیا سے ہے۔ میں یہ زبان تو نہیں سمجھتا۔ لیکن اس میں شامل انگریزی کے ایک دو الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر پوری طرح نہیں تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی تم سمجھ سکتی ہو۔“ ندیم نے انگریزی میں کہا۔ ”میں انگریزی بھی بہت اچھی طرح بول اور سمجھ سکتی ہوں۔“ ملکہ نے جواب دیا۔ ”کیا.....؟“ ندیم اچھل پڑا۔

”میں فرانسیسی ہوں۔“ ملکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ندیم نے اپنی ران پر چٹکی بھری۔ انگلی کو دانتوں کے نیچے دبا کر کاٹا۔ اسے تکلیف ہوئی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک ناقابل یقین حقیقت کا سامنا کر رہا تھا۔ تین صدیوں سے اس ویرانے میں آباد گنجوں کے اس قبیلہ کی ملکہ ایک فرانسیسی عورت! ناقابل یقین ہی تو تھی یہ بات۔

”میرا نام ویلور ہے۔“ ملکہ نے کہا۔ ”لیکن تم لوگ کون ہو اور یہاں کیسے پہنچے؟ یہ چھوٹی بستی تو دنیا والوں کی نگاہوں سے اس طرح پوشیدہ ہے جیسے کسی دوسرے سیارے پر واقع ہو۔“

اس کے بعد وہ لوگ وہاں نہیں رکے۔ تیز قدم اٹھاتے ہوئے واپس آ گئے۔ پانچ چھ منجے اونچی آواز میں کوئی راگ الاپتے ہوئے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے۔

دوپہر کو وہ منجے بھی واپس آ گئے جو رات کو غار کی طرف گئے تھے۔ وہ غار میں رکھی ہوئی ساری کھالیں اٹھالائے تھے جو انہوں نے سردار کے جھوپڑے کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ سردار نے قابوس کو بتایا کہ قبیلے کے بعض آدمیوں نے یہ کھالیں چوری کر کے اس غار میں چھپا رکھی تھیں جن کا محض اتفاق سے ان کے ذریعے پتہ چل گیا تھا۔ سردار کے کہنے کے مطابق چوری بھی غداری کے مترادف تھی اور اس کی سزا بھی موت ہے۔ اس طرح شام سے پہلے پہلے پنجرہوں میں بند ان چھ گنجوں کو بھی بھوکے جیتوں کے کنوئیں میں پھینک دیا گیا اور جشن کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

چوک سے پنجرے ہٹا کر آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کر دیا گیا تھا۔ ایک جگہ بہت بڑا چبوترہ سا بنا کر اس پر کھالیں بچھا دی گئیں۔ قبیلے کی تمام عورتیں اور مرد جمع تھے۔ گنجوں کا یہ اجتماع بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ الاؤ اور شعلوں کی روشنی میں ان کے سر چمک رہے تھے۔

سردار کے ساتھ اس کی ملکہ اور چیکو کو دیکھ کر وہ تینوں اچھل پڑے۔ اسے نہلا دھلا کر تیار کیا گیا تھا۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال اور چپتے کی کھال کے لباس میں وہ واقعی بے حد حسین لگ رہی تھی۔

چبوترے پر سردار کے ایک طرف ملکہ اور دوسری طرف چیکو بیٹھی ہوئی تھی۔ ندیم صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ملکہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

جشن آدھی رات کے بعد ختم ہو گیا۔ ندیم وغیرہ کو اب ایک الگ جھوپڑا دے دیا گیا تھا اور آج ان کے جھوپڑے پر پہرہ بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک چیکو کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر سو گئے۔

وہ پتہ نہیں رات کا کون سا وقت تھا کہ اپنے کندھے پر ہکا سا بوجھ محسوس کر کے ندیم کی آنکھ کھل گئی۔ جھوپڑے میں ایک چھوٹی مشعل جل رہی تھی۔ اس کی مدھم سی روشنی میں سردار کی ملکہ کو اپنے سامنے دیکھ کر ندیم ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ش.....!“ ملکہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی خاموشی سے اسے جھوپڑے سے باہر لے آئی۔

یہاں تک کیسے آگئیں؟“

”یہ ایک لمبی داستان ہے۔“ ملکہ ویلور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ میں اپنے ملک کے کوہ پیادوں کی ایک ٹیم کے ساتھ نانگا پربت کی چوٹی سر کرنے آئی تھی۔ لیکن ہم نے یہ خطرناک چوٹی سر کرنے کے لئے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ایسا موسم تھا جب تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں۔ ہمیں بہت سے مقامی لوگوں نے منع بھی کیا تھا کہ یہ موسم چوٹی سر کرنے کے لئے مناسب نہیں۔ لیکن ہماری پارٹی کالیڈر بھی ضدی آدمی تھا۔ لوگوں کے منع کرنے اور ٹیم کے ایک دو ممبروں کی مخالفت کے باوجود اس نے اپنی مہم جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمیں مقامی مزدور بھی ڈبل اجرت پر بڑی مشکل سے ملے تھے۔ بہر حال ہم چوٹی سر کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

”میں کیمپ سے روانگی کے دوسرے دن ہم ہوا کے تیز جھکڑوں کی زد میں آ گئے۔ ٹیم کے بعض ممبروں نے مہم ترک کرنے کا مشورہ دیا لیکن پارٹی لیڈر اپنی ضد پر قائم رہا۔ ٹیم کے دو آدمی واپس لوٹ گئے اور ہم مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ تیسرے دن ہمیں برفانی طوفان نے گھیر لیا۔ یہ طوفان صبح سویرے شروع ہوا تھا اور دوپہر تک جاری رہا۔ جب برف کے اس طوفان میں کسی حد تک کمی آئی تو انکشاف ہوا کہ ٹیم کا ایک رکن غائب ہے۔ وہ یا تو برف میں دب گیا تھا یا طوفانی ہوا اسے اڑا کر کہیں لے گئی تھی۔ ممبروں کے مجبور کرنے پر پارٹی لیڈر نے مہم ترک کر کے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن تقریباً دو گھنٹے بعد ہوا میں پھر تیزی آ گئی اور بالآخر طوفان کی صورت اختیار کر گئی۔ ہمارے چاروں طرف برف ہی برف اڑ رہی تھی۔ میں اور میرا ایک ساتھی ایلن اپنی ٹیم کے ممبروں سے ہٹ کر چلے گئے اور پھر راستہ بھٹک گئے۔

میں بھی تمہاری طرح ایلن کے ساتھ کئی ہفتوں تک برف کے اس جہنم میں بھٹکتی رہی۔ اب میں سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہم زندہ کیسے رہے۔ لیکن بالآخر ایک روز موت نے ایلن کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ وہ ایک تنگ سے راستے سے گزرتے ہوئے ایک گہرے کھڈ میں جا گر تھا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ کسی گہرے کھڈ میں چھلانگ لگا کر خود کشی کر لوں۔۔۔۔۔ اس روز میں چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر گئی تھی اور ایک ڈھلان پر دور تک لڑھکتی چلی گئی تھی۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش آنے پر میں نے

”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔“ ندیم نے کہا۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ ایک فرانسیسی عورت ان خوشوار قسم کے سمجوں کی ملکہ کیسے بن سکتی ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ بتانا پسند کرو گی۔۔۔۔۔؟ لیکن اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا یہ جگہ ہمارے لئے محفوظ ہے؟ اگر کسی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو مجھے بھی بھوکے چیتوں کے سامنے پھینک دیا جائے گا؟“

”مطمئن رہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ ملکہ ویلور نے کہا۔ ”اگر قبیلے کے کسی آدمی نے ہم دونوں کو اکٹھے دیکھ بھی لیا تو وہ سردار کو اس کی اطلاع نہیں دے گا۔ کیونکہ قبیلے کے قانون کے مطابق سردار اور ملکہ پر کوئی الزام عائد کرنا بھی قابل گردن زنی جرم ہے اور اپنی خوشی سے کوئی مرنا پسند نہیں کرتا۔“

”لیکن اگر سردار کو تمہاری عدم موجودگی سے کوئی شبہ ہو گیا تو؟“ ندیم بولا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔“ ملکہ ویلور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جشن کے اختتام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے جو مشروب پلایا تھا اس میں ایک نشہ آور بوٹی کارس ملا ہوا تھا۔ اب وہ سورج نکلنے سے پہلے بیدار نہیں ہو سکے گا۔ یہ ویرانہ بڑی عجیب و غریب جگہ ہے۔ ان پہاڑوں میں چیتوں کی بہتات ہے جنہیں اس قبیلے کے لوگ محض بھالوں اور نیزوں سے شکار کرتے ہیں۔ ان چیتوں کی کھالیں خریدنے کے لئے سال میں صرف ایک مرتبہ تاجروں کی ایک پارٹی آتی ہے اور وہ بھی۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا تم یہی سب کچھ بتانے کے لئے مجھے یہاں لائی ہو؟“ ندیم نے اس کی بات کاٹی۔

”نہیں!“ ملکہ ویلور نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ تم لوگ کون ہے؟ لیکن میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ سردار کو وہ لڑکی پسند آگئی ہے۔ اگر سردار نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تو وہ بھی میری طرح زندگی بھر یہاں سے نہیں نکل سکے گی۔“

”ہم تو کئی ہفتوں سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہے ہیں۔ ہمارے کئی ساتھی موت کا شکار ہو چکے ہیں لیکن ہمیں کسی بستی تک پہنچنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ ایک یہ بستی ملی بھی ہے تو عجیب و غریب انسانوں کی۔“ ندیم نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”لیکن تم

اپنے آپ کو سببوں کی اس بستی میں پایا۔ میں زندہ تو بچ گئی لیکن ان کی قیدی بن کر رہ گئی۔ سردار مجھ پر ریشہ ختمی ہو گیا۔ وہ حالانکہ پہلے ہی شادی شدہ تھا لیکن اس نے مجھ سے شادی کر لی اور اپنی پہلی بیوی کا سر منڈوا دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اب اس عورت سے سردار کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

”اس بات کو آٹھ سال بیت چکے ہیں۔ ایک دو مرتبہ سردار مجھے اپنے ساتھ قریبی بستی میں لے جا چکا ہے جو یہاں سے کم از کم تین دن کے فاصلہ پر ہے لیکن اس بستی میں مجھے کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی..... میں اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر یہاں وقت گزار رہی ہوں۔ اور اب تمہارے ساتھ آنے والی وہ لڑکی سردار کو پسند آگئی ہے۔ اگر سردار نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا تو تم لوگ بھی زندگی بھر یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔ عین ممکن ہے کہ تم لوگوں کو بھی کسی نہ کسی جرم میں بھوکے چیتوں کے سامنے ڈال کر تم لوگوں نے نجات حاصل کر لی جائے۔“

”اوہ!“ ندیم اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”لیکن کیا تم یہاں سے نہیں نکلنا چاہو گی؟ اپنوں کے پاس نہیں جانا چاہتیں؟“

”اپنے مجھے یاد تو بہت آتے ہیں۔“ ویلور نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن میں یہاں سے نہیں نکل سکوں گی۔ آٹھ سال میں یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے مہذب دنیا سے آنے والے کسی انسان سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ جو لوگ سال میں ایک مرتبہ اشیائے خورد و نوش دینے اور چیتوں کی کھالیں لینے کے لئے آتے ہیں مجھے تو ان سے بھی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ مجھے ان سے دور ہی رکھا جاتا ہے۔ سردار کئی مہینوں بعد چند روز کے لئے جب قبیلے سے باہر جاتا ہے تو اس کی عدم موجودگی میں میری کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ عورتیں مجھے ہر وقت گھیرے رہتی ہیں اور مرد مجھے بستی کی حدود سے باہر نہیں نکلنے دیتے حالانکہ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں جایا جاسکتا۔“

”اور سردار کی موجودگی میں؟“ ندیم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس کی موجودگی میں مجھے ہر طرح کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔“ ویلور نے جواب دیا۔ ”کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ البتہ سردار ہر وقت مجھے اپنے قریب رکھتا ہے اور اگر میں

بستی میں گھومنا چاہوں یا ادھر ادھر جانا چاہوں تو مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔“

”تمہارے بچے کتنے ہیں؟“ ندیم نے پوچھا۔

”میری کوئی اولاد نہیں ہے۔“ ویلور نے جواب دیا۔

”حیرت ہے! تمہاری شادی کو آٹھ سال ہو چکے ہیں اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔“ ندیم نے کہتے ہوئے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں پہنچنے سے پہلے میں کئی ہفتوں سک دیرانوں میں بھٹکی ہوں۔ بیسیوں مرتبہ گری ہوں، گھائیوں اور ڈھلانوں پر لڑھکی ہوں۔ ممکن ہے اس طرح کوئی اندرونی چوٹ لگنے سے مجھ میں ہی کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ اچھا ہی ہوا کہ میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ورنہ مجھے دکھ ہوتا۔ میری اولاد بھی ان گننے بچوں کی طرح وحشی ہی ہوتی۔“ ویلور ا چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بڑے سفاک لوگ ہیں یہ۔ اور ان کی رسمیں اور قوانین بڑے عجیب و غریب ہیں۔ عورتوں کا یہ بے حد احترام کرتے ہیں۔ کسی عورت کے ساتھ زیادتی کرنے والے کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، لیکن عورتیں اپنی مرضی سے مردوں کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کریں۔ انہیں کچھ نہیں کہا جاتا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ان کی شادی کی رسم بھی بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ کوئی نوجوان اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک وہ کم از کم پانچ چیتوں کو ہلاک کر کے ان کی کھالیں سردار کے پاس جمع نہ کر دیا چکا ہو۔ اس قبیلہ میں اجتماعی شادیوں کا رواج ہے۔ سال میں ایک مرتبہ چاند کی چودھویں شب شادی کے خواہش مند لڑکوں اور لڑکیوں کو جمع کر لیا جاتا ہے۔ اس رات بڑا زبردست جشن منایا جاتا ہے۔ ہر لڑکی کو باری باری اس طرح سامنے ایک چبوترے پر لایا جاتا ہے جیسے اسے نیام کیا جا رہا ہو۔ اور پھر ان نوجوانوں کو آگے آنے کی دعوت دی جاتی ہے جو اس لڑکی سے شادی کے خواہش مند ہوں۔ لڑکی اگر زیادہ خوبصورت ہو تو نوجوانوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ پھر ان نوجوانوں میں کشتی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر مقابلے کے لئے دو تین منٹ کا وقت دیا جاتا ہے اور کسی کی ہار جیت کا فیصلہ سردار کرتا ہے جسے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ ہر لڑکی کے لئے کئی کئی مقابلے ہوتے ہیں۔ لیکن فائنل مقابلہ دونوں میں سے ایک نوجوان کی ہلاکت پر ہی ختم ہوتا ہے۔ مر جانے والے کی لاش اٹھا کر بھوکے

لوگ یا تو زندگی بھر یہیں رُکے رہو گے یا تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔“  
 ”لیکن ہم یہاں سے کیسے نکل سکتے ہیں؟“ ندیم نے کہا۔  
 ”میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ ویلور نے جواب دیا۔  
 ”وہ کیسے؟“ ندیم نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ ویلور اکوٹی جواب دیتی، آہٹ سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز تھی۔ اور پھر یوں لگا جیسے کوئی بڑی تیزی سے بھاگ کر ان کی طرف آیا ہو۔ ویلور نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ تاریکی میں ایک انسانی سایہ بڑی تیزی سے ان کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ ویلور نے ندیم کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور خود بھی بڑی پھرتی سے دوسری طرف لڑھک گئی۔ حملہ آور سایہ اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل ندی میں جا گرا۔

”پکڑو اسے!“ ویلور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ ”یہ سردار ہسپو لاکا خاص آدمی ہے۔ اگر یہ زندہ بچ گیا تو ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور تمہارے ساتھیوں کو بھی زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔“

ایک لمحہ کو تو ندیم کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔ لیکن جب اس کے حوالہ بحال ہوئے تو ندی میں گرنے والا گنجا حملہ آور سنبھل چکا تھا اور وہ نیزہ تانے ندیم پر حملے کے لئے پر تول رہا تھا۔ وہ ندی ہی میں کھڑا تھا۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا، اس کی پنڈلیوں تک آ رہا تھا۔ پانی کی تہہ میں چکنے پتھر تھے اور شاید پتھروں پر اس کے پیر جم نہیں رہے تھے جس کی وجہ سے وہ بار بار اپنی پوزیشن بدل رہا تھا۔

اور پھر اچانک ہی اس نے ندیم پر حملہ کر دیا۔ ندیم بڑی پھرتی سے دائیں طرف ہٹا۔ نیزہ اس کے پہلو کے قریب سے گزر گیا۔ ندیم نے بڑی پھرتی سے نیزے کے ڈنڈے کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ گنجا حملہ آور ایک بار پھر منہ کے بل گرا۔ اس کا سر کسی پتھر پر لگا جس سے اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ ندی کے کنارے پر تھا اور ٹانگیں پانی میں۔ ندیم نے اس پر جھلانگ لگادی مگر گنجا بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ندیم سینے کے بل گرا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا گنجا بڑی پھرتی سے اس کے اوپر سوار ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا

چیتوں کے سامنے پھینک دی جاتی ہے اور زندہ بچ جانے والا نوجوان اس لڑکی کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ شادی کی اجتماعی رسم کے موقع پر میں نے ایک رات میں کئی کئی نوجوانوں کو مرتے دیکھا ہے۔ ان کی دوسری رکیں بھی بڑی خوفناک ہیں۔ اگر کوئی مرد دوسری شادی کرنا چاہے تو اسے پہلی بیوی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ یہ قانون سردار پر بھی لاگو ہوتا ہے۔“

”سرداری موروثی ہے یا کسی اور طریقے سے اس کا انتخاب کیا جاتا ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”کوئی بھی شخص جسے اپنی بہادری پر ناز ہو سردار کو چیلنج کر سکتا ہے۔ مقابلے میں ہار جانے کی صورت میں سردار کو نہ صرف سرداری چھوڑنی پڑتی ہے بلکہ جیتنے والے کے حق میں اسے اپنی بیوی سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ یہ سردار جس کا نام ہسپولا ہے، پہلے سردار کو شکست دے کر اس قبیلہ کا سردار بنا تھا۔ یہ بہت ظالم اور شقی القلب آدمی ہے۔ معمولی معمولی جرائم پر قبیلہ کے لوگوں کو بھوکے چیتوں کے آگے ڈال دینا اس کے لئے معمولی بات ہے۔ اس طرح یہ قبیلہ کی آبادی کو بھی کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے۔“

”آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کا عجیب طریقہ ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”کیا تمہیں یہ خوف نہیں کہ جب تم بوڑھی ہو جاؤ گی تو تمہیں بھی بھوکے چیتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا؟“

”کیا پتہ میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے تک زندہ بھی رہتی ہوں یا نہیں۔“ بلاوجہ موت کے خوف کو ذہن پر مسلط کر لینے سے تو زندگی اور بھی عذاب بن جائے گی۔ ہاں! البتہ ایک بات کا خدشہ رہتا ہے کہ اگر میں سردار کی نظروں سے گر گئی تو وہ مجھے خھوڑ دے گا اور پھر مجھے بھی گنجا کر دیا جائے گا اور مجھے باقی زندگی قبیلے کی عام عورتوں کی طرح گزارنی پڑے گی۔“ ویلور نے جواب دیا۔

”اور شاید اسی لئے تم مجھے یہ مشورہ دے رہی ہو کہ مجھ کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔“ ندیم نے کہا۔

”ہاں! کوئی بھی عورت اپنی زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“ ویلور نے جواب دیا۔ ”اور پھر یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر سردار نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تو تم

دیکھتے ہوئے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ویلور ادوڑتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئی۔

”تم واقعی بہت بہادر ہو۔“ ویلور نے کہا۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جو نیزوں سے چیتوں کا شکار کرتے ہیں اور ان خوشخوار درندوں کی گردنیں مروڑ دیتے ہیں۔ لیکن تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم ان سے زیادہ بہادر اور طاقتور ہو۔“

ندیم ایک ہاتھ سے اب بھی گلا سہلا رہا تھا۔ لیکن ویلور کے اس طرح لپٹ جانے سے وہ اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی رد عمل کا اظہار کرتا، بستی کی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً دو آدمی تھے جو دوڑتے ہوئے اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

”میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔۔ اس طرف۔“ ویلور نے اس سے الگ ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں ندی کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف دوڑنے لگے۔ تقریباً پندرہ گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک چٹان کے پیچھے پہنچ گئے اور بل کھاتی ہوئی ندی کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے۔ بالآخر وہ اس تالاب کے پاس پہنچ گئے جہاں جھرنے کا پانی گر رہا تھا۔ وہ ندی اس تالاب سے نکلتی تھی۔ تالاب سے بستی کی طرف بڑھتے ہوئے وہ محتاط ہو گئے۔ اگرچہ پہلے سردار والا جھونپڑا پڑتا تھا۔ مگر ویلور اندیم کے ساتھ اس کے جھونپڑے کی طرف چلتی رہی جو زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

”اپنے جھونپڑے میں جا کر لیٹ جاؤ اور باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔“ ویلور اُسے جھونپڑے کے دروازے پر چھوڑ کر تیزی سے اپنے ہٹ کی طرف چلی گئی۔

ندیم اپنے جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ دیوار پر لگی ہوئی چھوٹی مشعل اب بھی جل رہی تھی۔ محسن اور قابوس چیتوں کی کھالیں اوڑھے گہری نیند سو رہے تھے۔ ندیم بھی اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ اس کے کپڑے ہیکے ہوئے تھے۔ اس نے تین چار کھالیں اپنے اوپر اوڑھ لیں۔ یہ کھالیں چدر کی طرح سلی ہوئی تھیں۔

تقریباً دس منٹ بعد باہر سے باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ تین چار آدمی تھے جو تیز لہجے میں بول رہے تھے۔ اور پھر ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک آدمی ان کے

دایاں بازو ندیم کی گردن میں لپیٹ دیا۔ ندیم کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے گلے پر حملہ آور کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ندیم کا سانس رکنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ منجھنے کے بازو پر جمادیئے اور گلے پر دباؤ کم کرنے کے لئے اس کے بازو کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

گنجہا حملہ آور بے پناہ طاقت ور تھا۔ ندیم کے گلے پر اس کے بازو کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ندیم کو محسوس ہو رہا تھا کہ مزید چند سیکنڈ دباؤ اسی طرح برقرار رہا تھا اس کا سانس گھٹ جائے گا۔ اس نے آخری کوشش کی اور گھٹنوں پر دباؤ ڈال کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر سوار حملہ آور بھی اوپر اٹھتا چلا یا۔ ندیم نے ایک اور کوشش کی اور قلابازی کھا گیا۔ اس طرح گردن کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ تھا مگر ندیم کی یہ کوشش کامیاب رہی اور حملہ آور اس کے اوپر سے قلابازی کھاتے ہوئے پشت کے بل گرا۔

ندیم ایک ہاتھ سے گلا سہلانے لگا۔ حملہ آور نے سنبھل کر چھلانگ لگائی لیکن ندیم نے ٹانگ چلا دی۔ اس کی ٹھوک حملہ آور کی کھوپڑی پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا گرا۔ ندیم بھی فوراً ہی سنبھل گیا اور اس مرتبہ اس نے گنجے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ پہلے اسے ٹھوکرین رسید کرتا رہا۔ پھر اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس نے دونوں انگوٹھوں سے گنجے کا زرخرہ دبا رکھا تھا۔ ندیم پر دردنگی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ گنجے حملہ آور کا زندہ بچ جانا ان سب کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔

گنجہا حملہ آور اگرچہ چیتے سے بھی زیادہ پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ مگر ندیم پر بھی جنون طاری ہو چکا تھا۔ حملہ آور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ندی کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ ندیم نے ایک زوردار جھکادیا۔ گنجہا کنارے کے پتھروں پر پھسلتا ہوا ندی میں پہنچ گیا۔ اس کے پیر ندی کے کنارے پر تھے اور سر پانی میں ڈوب گیا تھا۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا مگر ندیم نے اس کے گلے پر گرفت ڈھیلی نہیں کی اور اس کے زرخرے سے انگوٹھے اس وقت تک نہیں ہٹائے جب تک وہ بالکل بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔ زرخرے سے انگوٹھے ہٹاتے ہی اس کی پیٹ میں رکی ہوئی ہوا خارج ہوئی اور پانی میں ملبے اٹھنے لگے۔۔۔۔۔ ندیم نے کچھ دیر اس کا سر پانی میں ڈبوئے رکھا۔ اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ندیم کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ وہ چند قدم دور کھڑی ہوئی ویلور کی طرف

دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ سردار سوراہے۔“ قابوس نے بتایا۔

ندیم اٹھ کر باہر آگیا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے کپڑے ابھی تک کسی حد تک گیلے تھے۔ محسن بھی جھوپڑے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ رانفل اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی اور چہرے پر خوف کے سائے صاف نظر آرہے تھے۔ دوسری رانفل قابوس نے اپنے کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔

”تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں اور صورت حال خواہ کچھ بھی ہو ان رانفلوں کا استعمال ذرا احتیاط سے کرنا۔ ان کا کوئی آدمی ہمارے ہاتھوں سے مارا نہیں جانا چاہئے ورنہ ہمارا انجام بھی پانڈے سے مختلف نہیں ہو گا۔“ ندیم کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اُس کا رخ بستی کے چوک کی طرف تھا جہاں رات کو جشن منایا گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ نیزہ بردار گنجنوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ تیز لہجے میں کچھ کہتے ہوئے اسے واپس جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ ندیم خاموشی سے واپس آگیا۔ ان خونخوار قسم کے گنجنوں سے الجھنا بیکار تھا۔ زبان سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے الٹی آنتیں گلے کو بھی آسکتی تھیں۔ اسی لئے وہ خاموشی سے واپس بھی آگیا تھا۔ وہ تینوں اپنے جھوپڑے کے سامنے کھڑے تھے مگر ان گنجنوں نے انہیں جھوپڑے کے اندر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جب تک سردار سے بات نہیں ہوگی انہیں جھوپڑے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک گنجنے نے دروازے کا پردہ ہٹا کر نیزے سے انہیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تینوں ہٹ سے نکل کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے چوک پر پہنچ گئے جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی اور مرد بھی۔ سنہری زلفوں والا سردار اور اس کی ملکہ بھی چبوترے کے قریب کھڑے تھے جہاں رات کو ان کے بیٹھنے کے لئے مسند بنائی گئی تھی۔ لیکن اس وقت چبوترے پر ایک گنجنے آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے ابل ہوئی تھیں۔

”یہ کیا ہو گیا سردار! اسے کس نے مارا ہے؟“ قابوس نے آگے بڑھ کر سردار سے

پوچھا۔

”اس آدمی کا کہنا ہے۔“ سردار نے ایک گنجنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کہ اس نے رات

جھوپڑے کے سامنے رک گیا ہو اور باقی سردار کے جھوپڑے کی طرف چلے گئے ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد ویلور کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی گنجنوں کی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی اور گنجنے بھی تیز لہجے میں جواب دے رہے تھے۔ ان کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ اور پھر وہ لوگ ندیم والے جھوپڑے کے سامنے رُک گئے۔ کچھ دیر آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر کسی نے دروازے کے سامنے کا پردہ ہٹا دیا۔ ندیم نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے گہری نیند سوراہا تھا۔ پھر اس نے ایک آنکھ میں بہت معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا۔ ویلور، دو گنجنوں کے ساتھ دروازے کے اندر کی طرف کھڑی گنجنوں سے دبے لفظوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ گنجنوں کے چہروں پر شدید حیرت کے تاثرات تھے۔ وہ باری باری ان تینوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک گنجنے کی نظریں تو ندیم پر ہی مرکوز تھیں۔ ویلور نے کچھ کہا۔ اور پھر وہ لوگ باہر نکل گئے۔ دروازے کا پردہ بھی گرا دیا گیا تھا۔ ندیم کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔ اس نے محسن اور قابوس کی طرف دیکھ۔ وہ اب بھی گہری نیند سوراہے تھے۔ بستی کے مرکزی چوراہے کی طرف سے اب بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ لیکن یہ شور سن کر بھی قابوس اور محسن کی آنکھ نہیں کھلی۔ غالباً تھکن کی وجہ سے وہ بہت گہری نیند میں تھے۔ ندیم نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور باہر کے شور کے باوجود وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ صبح قابوس نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

”کیا ہوا؟“ قیامت آگئی کیا؟“ ندیم آنکھیں ملتے ہوئے بڑبڑایا۔

”غضب ہو گیا۔“ قابوس نے کہا۔ ”رات کو کسی نے قبیلہ کے ایک گنجنے کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش ندی میں پڑی ہوئی ملی ہے۔ لوگ اس کی لاش کو اٹھا لائے ہیں جو چوک میں رکھ دی گئی ہے اور کچھ گنجنے ہمارے جھوپڑے کے سامنے اس طرح کھڑے ہیں جیسے ہم پر پہرہ دے رہے ہوں۔ ان کی زبان تو میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن وہ جس طرح خونخوار نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں اس سے لگتا ہے جیسے انہیں ہم پر شبہ ہو۔“

”اور سردار کیا کہتا ہے؟ تم سے کوئی بات ہوئی؟“ ندیم نے پوچھا۔

”سردار ابھی اپنے جھوپڑے سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے ایک گنجنے سے اشاروں میں

جاؤ گے۔ مانگا میرا خاص آدمی تھا۔ میں معلوم کر لوں گا کہ اسے قتل کس نے کیا ہے۔ قاتل کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے گی کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔“ سردار نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مانگا کی لاش اٹھا کر اونچی آواز میں کوئی المیہ گیت گاتے ہوئے پچھلی پہاڑی کی طرف چل پڑے۔ ندیم وغیرہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ مانگا کی لاش کو بھوکے چیتوں والے کھڑ میں پھینکنے جا رہے تھے۔ ندیم نے کن انھیوں سے ملکہ ویلور کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ندیم بھی رخ بدل کر مسکرانے لگا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس کا دل کانپ اٹھا کہ اگر سردار کو یہ پتہ چل گیا کہ مانگا کو اس نے قتل کیا ہے تو اس کا جو انجام ہو گا اس کے بارے میں شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

مانگا کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد بستی والوں کی زندگی معمول پر آگئی۔ سب کوئی ایک پارٹی نیزے سنبھالے اونچی لے میں کوئی گیت گاتی ہوئی چیتوں کے شکار کے لئے پچھلے پہاڑوں کی طرف چلی گئی۔

ان لوگوں میں سے کسی نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنے ہٹ کے سامنے دھوپ میں بیٹھ گئے۔ قابوس اور محسن مانگانی کے قتل کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ندیم خاموش بیٹھان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ اگر وہ انہیں یہ بتاتا کہ مانگا کو اس نے قتل کیا ہے تو شاید ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ وہ ابھی انہیں ویلور سے گزشتہ رات کی ملاقات اور مانگا کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ ویلور اسے ابھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے کسی قسم کی منصوبہ بندی کی جاسکتی۔ لیکن ویلور نے گزشتہ رات جو کچھ بھی بتایا تھا وہ اس کے لئے خاصا تشویش ناک تھا۔ اگر مانگا اس کے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کو ویلور سے ملاقات کے بارے ہی میں بتاتا۔

انہیں جھوپڑے کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ بھوک سے ان کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی تھی۔ مزید آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد ایک لڑکی ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے چپے کی جو کھال پہن رکھی تھی وہ خاصی مختصر تھی۔ چہرے کے نقوش نہایت دلکش تھے اور موٹی موٹی سیاہ

کو کسی کی چیخوں کی آواز سنی تھی۔ یہ اپنے جھوپڑے سے باہر آیا تو ہلکی ہلکی چیخوں کی آواز ندی کی طرف سے آتی ہوئی سنائی دی۔ اس نے سب سے پہلے تمہارے جھوپڑے میں جھانک کر دیکھا کہ شاید تم میں سے کوئی باہر نکلا ہو اور کسی جنگلی جانور کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ اس کے کہنے کے مطابق تمہارا یہ ساتھی ہٹ میں موجود نہیں تھا۔“ اس نے ندیم کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ ایک اور آدمی کو جگا کر اپنے ساتھ لے کر اس طرف گیا تو اسے ندی میں مانگا کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ اس نے فوراً ہی آکر مجھے اطلاع دینا چاہی۔ مگر میں سو رہا تھا۔ میری ملکہ ان کے ساتھ آگئی۔ ملکہ نے ان دونوں کے ساتھ آکر سب سے پہلے تمہارے جھوپڑے میں دیکھا۔ ملکہ اور ان دونوں آدمیوں کے مطابق اس وقت تم تینوں اپنی اپنی جگہ پر گہری نیند سو رہے تھے اور ان کی آوازوں سے بھی کسی کی آنکھ نہیں کھلی۔“

”ہمیں تو صبح پتہ چلا ہے سردار!“ قابوس نے کہا۔ ”ہم رات کو اس قدر تھک گئے تھے کہ بستر پر گرتے ہی سو گئے تھے اور پھر کچھ ہوش نہیں رہا۔“

”ہمارے لوگوں کو شبہ ہے کہ مانگا کو تم میں سے کسی نے قتل کیا ہے۔ لیکن میری ملکہ نے ان کی تسلی کر دی ہے کہ جب یہ قتل ہوا تھا تینوں سو رہے تھے۔ میں نے بھی انہیں سمجھا دیا ہے کہ تم تینوں بہت نیک انسان ہو۔ اگر برے آدمی ہوتے تو ہمارے پیدا کرنے والے ان آلوں سے تم سب کو قتل کر دیتے۔“ سردار نے کہا۔

وہ تینوں چونک گئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ آتشیں ہتھیاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، لیکن اب انہیں پتہ چل گیا تھا کہ کم از کم سردار ان ہتھیاروں اور ان کے استعمال سے بھی واقف ہے۔ لیکن انہیں حیرت تھی کہ جب انہیں پکڑ کر لایا گیا تھا تو سردار نے ان کی رائفلیں اپنے قبضے میں کیوں نہیں لی تھیں؟ حالانکہ پانڈے، جاگہ کہنے والی ایک ایسی ہی چھوٹی چیز سے ان کے دو آدمیوں کو مار چکا تھا۔ ان سے ہتھیار نہ لینے کی وجہ شاید یہ تھی کہ سردار نے آتے ہی چمیکو کو ان سے الگ کر دیا تھا اور اپنے نرم اور دوستانہ رویے سے انہیں بھی اعتماد میں رکھنا چاہتا تھا۔

”تم لوگوں پر دن کے وقت کہیں جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ سردار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بلیتہ رات کے اندھیرے میں تم لوگ بستی سے باہر نہیں

”آج رات جب تمہیں اپنے جھوپڑے کے قریب کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے تو باہر آ جانا۔ جھوپڑے کے باہر جو بھی آدمی کھڑا ہو گا اس کے ساتھ چلے آنا۔“ ویلور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”یہ گنجا بڑے غور سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر اسے کوئی شبہ نہ ہو جائے۔“ ندیم نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے تالاب کے پانی میں کچھ دیکھ رہا ہو۔

”یہ نمران ہے۔ میرا طلب گار..... میرا وفادار..... یہ میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ ویلور نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ ندیم کچھ کہتا، گنجنے نمران نے ویلور کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کوئی سرگوشی کی اور بستی کی طرف سے آنے والے ڈھلواں راستے کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہسپولا آ رہا ہے۔“ ویلور نے سرگوشی میں ندیم کو بتایا۔

☆

آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ اگر اس کے سر پر بال ہوتے تو اس کے حسن کو مزید چار چاند لگ جاتے۔ قابوس نے تو اسے دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں اور محسن نے بھی رُخ بدل لیا۔

ندیم اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ اشاروں سے بتا رہی تھی کہ وہ کھانے کے لئے اس کے ساتھ چلیں۔

”اب تو آنکھیں کھول لو قابوس! یہ لڑکی خوشخبری لے کر آئی ہے۔ ہمیں کھانا کھانے کے لئے بلایا جا رہا ہے۔“ ندیم نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لڑکی انہیں ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ایک طرف چل پڑی تھی۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ لڑکی انہیں ایک جھوپڑے میں لے گئی جہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ نیم برہنہ عورتیں، مرد اور بچے۔ درمیان میں کسی جانور کی بھنی ہوئی رائیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ غالباً ریڈیر کی رائیں تھیں۔ کیونکہ اس خطے میں ریڈیر بکثرت پائے جاتے تھے۔ بعض اوقات تو غول کے غول ٹپکتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ان کے لئے جگہ بنادی گئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ قابوس کے دونوں طرف لڑکیاں تھیں جو اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ قابوس سمٹا جا رہا تھا۔ اس نے بمشکل دو تین نوالے کھائے اور بالآخر جب قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ ایک ران اٹھا کر جھوپڑے سے باہر بھاگ گیا۔ اس کی اس حرکت پر ندیم اور محسن مسکرا کر رہ گئے۔

کھانے کے بعد وہ اپنے جھوپڑے میں آگئے۔ قابوس جھوپڑے میں نہیں تھا۔

”میرا خیال ہے وہ جھرنے کی طرف گیا ہو گا۔ تم بیٹھو! میں ابھی آتا ہوں۔“ ندیم کہتا ہوا سردار کے جھوپڑے کے قریب سے گزرتا ہوا جھرنے کی طرف چل پڑا۔

تالاب کے کنارے پر جھاڑیوں کے قریب وہ ٹھٹھک کر ٹک گیا۔ ویلور تالاب میں پیر لکائے بیٹھی تھی۔ اس طرح بیٹھنے سے چپتے کی کھال اس کے گھٹنوں سے اوپر تک سمٹ گئی تھی۔ وہ پانی میں ڈوبے ہوئے پیروں کو آہستہ آہستہ حرکت دے رہی تھی۔

ویلور اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ہٹا گنجا بھی تھا جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ویلور، ندیم کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ ندیم اس سے تین چار فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور چلو سے پانی پینے لگا۔



کر شدید حیرت ہوئی تھی کہ گنجوں کے اس قبیلہ کی ملکہ فرامیسی ہے۔

”آج رات ویلور اسے ملاقات ہوگی۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں یہاں سے نکلنے کا منصوبہ بنایا جائے گا۔“ ندیم نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ قابوس نے کہا۔ ”ہم نہ تو چیکو کو یہاں چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی خود ساری زندگی گنجوں کی اس بستی میں گزار سکتے ہیں۔ اور پھر ہماری زندگی کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے ویلور کا خیال درست ہو اور سردار چیکو لے شادی کے بعد ہمیں موت کے گھاٹ اتار دے۔“

”چیکو ہمارے ساتھ جائے گی۔ اس بات کا اطمینان رکھو۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“ محسن بولا۔

وہ تینوں بڑی شدت سے رات ہونے کا انتظار کر رہے تھے، لیکن وقت جیسے تھم گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وقت کسی طرح کاٹے ہی نہیں کٹ رہا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ بستی کے چوک میں مشعلیں روشن ہو گئیں۔ بستی کے لوگ الاؤ کے گرد بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ گیت گارہے تھے۔ یہ تینوں اپنے جھونپڑے میں تھے۔ قابوس چوک کی طرف سے قہتہوں کی آواز سن کر چوک پر جانے کے لئے جھونپڑے سے نکلا۔

محسن اور ندیم جھونپڑے میں بیٹھے تھے کہ چیخ کی آواز سن کر باہر بھاگے۔ جھونپڑے سے چند قدم کے فاصلے پر قابوس زمین پر پڑا تھا اور ایک نیزہ اس کی ران میں پیوست تھا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے قابوس کی طرف دوڑے۔

شور کی آواز سن کر بستی کے بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ محسن اور ندیم اسے اٹھا کر جھونپڑے کے اندر لے آئے اور اسے زمین پر بچھی ہوئی کھال پر لٹا دیا۔ نیزے کا پھل تقریباً تین انچ تک ران میں پیوست تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ کچھ لوگ جھونپڑے کے اندر بھی گھس آئے تھے۔ ندیم نے نیزہ کھینچ کر نکالنا چاہا تو قابوس بری طرح چیخا۔

”اسے مت نکالو۔۔۔۔۔“ وہ دانت پر دانت جھاتے ہوئے بولا۔ ”میری ٹانگ۔۔۔۔۔“

ندیم جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کچھ دور ہٹ گیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اس نے اپنے عقب میں قدموں کی آوازیں سن لی تھیں۔ لوگوں کی آواز اس کے قریب آ کر رُک گئی۔ اور پھر اچانک ہی کسی نے اسے تالاب میں دھکا دے دیا۔

ندیم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ شروپ سے پانی میں گرا۔ اور جب غوطہ کھا کر پانی کی سطح پر ابھرا تو فضا سرد اور ہسپولا، ویلور، نمران اور چند دوسرے لوگوں کے قہتہوں سے گونج اٹھی تھی۔۔۔۔۔ سردار نے مذاق میں اسے تالاب میں دھکا دیا تھا۔ اس مذاق کو سمجھ کر ندیم بھی ان کے قہتہوں میں شامل ہو گیا اور انہیں پیرواکی کے کرتب دکھانے لگا جس پر لباس کی وجہ سے اسے اگرچہ خاصی دشواری پیش آرہی تھی، لیکن وہ سردار کو خوش کرنے کے لئے پانی میں الٹی سیدھی قلابازیاں کھاتا رہا۔ اور جب وہ باہر نکلنے کے لئے کنارے کے قریب پہنچا تو سردار نے اسے سہارا دینے کے لئے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ندیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ سردار بھی تالاب میں گر گیا اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد ویلور، نمران اور تین چار مرد اور عورتیں بھی چھلانگ لگا کر تالاب میں پہنچ گئیں۔ اور پھر جو طوفان بد تمیزی شروع ہوا وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔

جھرنے سے بہنے والا پانی حیرت انگیز طور پر گرم تھا۔ ندیم جب تک پانی میں رہا اسے سردی کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن پانی سے باہر آتے ہی اسے سردی لگنے لگی۔ اس نے اپنے جھونپڑے میں آکر گیلیہ کپڑے اتار کر کھالیں لپیٹ لیں اور کپڑے دھوپ میں پھیلا دیئے۔

قابوس کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی واپس آگیا۔ وہ تینوں دھوپ میں بیٹھے تھے۔ ندیم نے موقع مناسب سمجھتے ہوئے ان دونوں کو گزشتہ رات ویلور سے ہونے والی ملاقات اور سردار ہسپولا کے عزائم کے بارے میں بتا دیا۔ ان دونوں کو یہ جان

مرچیں بھر رہی ہیں میری پوری ٹانگ میں۔“

قابوس کے چہرے پر بے پناہ کرب و اذیت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے بڑی سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے جیسے تکلیف کو دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ قابوس ایک باہمت انسان تھا۔ کئی روز سے اس سرد جہنم میں بھٹکتے ہوئے ان سب نے بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ قابوس بھی ایک موقع پر سفید بھیڑیے کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اس نے بھی بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں لیکن وہ ان سب سے زیادہ باہمت اور حوصلہ مند ثابت ہوا تھا۔ اس کے منہ سے کبھی آف تک نہیں نکلا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس نے تکلیف برداشت کرنے کے لئے دانت اس سختی سے بھینچ رکھے تھے کہ جڑوں کی ہڈیاں پوری طرح ابھر آئی تھیں۔

اچانک ندیم کے ذہن میں ایک اور خیال ابھر۔ قابوس چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس کی پوری ٹانگ میں مرچیں بھر رہی ہیں۔ کہیں اس نیزے کی انی زہر میں بھی ہوئی تو نہیں تھی؟ یہ سوچتے ہی ندیم کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ابھی کل رات ہی تو ویلورا نے اسے بتایا تھا کہ ان پہاڑوں میں حیرت انگیز تاثیر رکھنے والی جڑی بنیاں پائی جاتی ہیں۔ علاج کے لئے استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں کے علاوہ ان پہاڑوں میں یقیناً ایسی جڑی بوٹیاں بھی پیدا ہوتی ہوں گی جو کسی جاندار کے لئے موت کا پیغام بن سکتی ہوں اور یہ قبائلی..... تہذیب و تمدن سے نا آشنا صدیوں سے ان پہاڑوں میں رہنے والے یہ قبائلی ان جڑی بوٹیوں کے استعمال سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ندیم نے افریقہ اور برازیل کے جنگلوں میں آباد قبائلیوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ وہ خوفناک جنگلی جانوروں اور اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے اپنے ہتھیار زہر آلود رکھتے تھے۔ تو کیا قابوس کی ٹانگ میں بیوست نیزہ بھی زہر میں بجا ہوا تھا؟ اسی خیال نے ندیم کو برسرِ طرح بے چین کر دیا تھا۔

کسی نے سردار کو بھی خبر کر دی تھی۔ چند منٹ بعد سردار بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ویلورا بھی تھی۔ قابوس کی حالت دیکھتے ہی سردار سمجھ گیا۔ اس نے چیخ کر اپنے آدمی سے کچھ کہا جو دوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس گھنچے کو واپس آنے میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے کوزہ نمائی کے دو برتن اٹھا رکھے تھے۔

سردار نے دو تین آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جھک کر قابوس کو ذبوح لیا۔ سردار بھی قابوس کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے نیزہ پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے باہر کھینچ لیا۔ نیزہ نکلتے ہی ٹانگ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ سردار نے ایک کوزے میں سے مرہم کی طرح میالے سے رنگ کی لٹی نکال کر زخم میں بھر دی۔ اس مرہم کی اچھی خاصی مقدار زخم میں بھرنی پڑی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حیرت انگیز طور پر زخم سے بہنے والا خون بند ہو گیا تھا۔

مٹی کے دوسرے کوزے میں گلابی رنگت کی لٹی بھری ہوئی تھی۔ سردار کوزے میں سے لٹی نکال کر قابوس کی ٹانگ پر ملنے لگا۔ جب نیزہ ایک زوردار جھٹکے سے نکالا گیا تھا تو تکلیف کی شدت سے قابوس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی تھی۔ اسے تین آدمیوں نے بڑی مشکل سے قابو میں رکھا تھا۔ لیکن دوسرے مرہم زخم میں بھرنے اور ٹانگ پر ملنے کے بعد حیرت انگیز طور پر اس کی تکلیف کم ہوتی چلی گئی۔ اس کی ٹانگ میں کچھ دیر پہلے جو مرچیں سی بھر رہی تھیں اب وہ اذیت و احساس بند رہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔

سردار نے اپنے ایک آدمی سے کچھ کہا۔ وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آدمی لکڑی کے ایک پیالے میں کوئی مشروب لے آیا۔ سردار نے پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ مشروب قابوس کو پلا دیا۔ اتنی تکلیف اٹھانے کے بعد بھی قابوس ہوش ہی میں رہا تھا۔ ”نیزے کی انی زہر میں بھیجی ہوئی تھی۔“ سردار نے قابوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے جو مرہم تمہارے زخم میں بھرا ہے اس سے زہر کا اثر تھوڑی دیر میں مکمل طور پر زائل ہو جائے گا۔ اس مشروب سے تمہیں اند آجائے گی۔ اپنے ساتھیوں کو بتا دو کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر سو جاؤ گے۔“

قابوس نے ندیم کی طرف دیکھا اور مدھم لہجے میں اسے بتانے لگا کہ سردار نے کیا کہا۔ ندیم اور محسن کے چہروں پر طمانیت سی آگئی۔

سردار اب بھی قابوس کے پاس زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا، مسکرا کر ندیم اور قابوس کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف گیا۔ ویلورا نے بھی مسکرا کر ندیم کی طرف دیکھا اور سردار کے پیچھے ہی چس پڑی۔

سے مار دینا چاہتا تھا۔

”لیکن وہ تو بہت شریف آدمی ہے۔ قبیلہ کی نیم برہنہ عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اسے تو ان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، اس کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“ محسن نے کہا۔

”قابوس پر حملہ کسی ذاتی دشمنی کا نتیجہ ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”اس وقت ہم میں سے کوئی بھی جھوٹے سے باہر نکلتا تو اس حملہ کی زد میں آسکتا تھا۔ حملہ آور گھات لگائے بیٹھا تھا، اور بد قسمتی سے قابوس اس کی زد میں آگیا۔“

”لیکن کوئی ہمیں کیوں مارنا چاہتا ہے؟ ہم سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ محسن بولا۔

”بعض اوقات دشمنی کے لئے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”بہت سی باتیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو بلا جواز ہوتی ہیں۔“

”لیکن یہ تو بہت مہمان نواز قسم کے لوگ ہیں۔“ محسن نے کہا۔

”ہو سکتا ہے قبیلے کے کسی شخص کو ہمارا یہاں آنا پسند نہ آیا ہو۔“ ندیم نے کہا۔

”لیکن کیوں.....؟“ محسن بولا۔ ”ہمارے آنے سے کسی کو کیا فرق پڑا ہو گا۔ ہم نہ تو

اس قبیلے کی سرداری کے دعوے دار ہیں اور نہ ہی ہم میں سے کسی نے قبیلے کی کسی گنجی حسینہ سے عشق لڑانا شروع کیا ہے جو کسی کو ناگوار گزرا ہو۔“

”وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن بہر حال ہمیں اب پہلے سے زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔“

ندیم نے جواب دیا۔

”آج رات تم ویلور سے ملنے جاؤ گے یا نہیں؟“ محسن نے پوچھا۔

”یہ صورت حال پر منحصر ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”ملاقات کے لئے کوئی خاص

وقت یا جگہ طے نہیں ہوئی تھی۔ اب یہ جو غنی صورت حال سامنے آئی ہے اس سے یہ

اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل کرتی ہے یا نہیں۔“

وہ دونوں جھوٹے میں بیٹھے اسی صورت حال پر باتیں کرتے رہے۔ وہ دونوں بار بار

قابوس کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ قابوس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پرسکون نظر آ رہا تھا

جس کا مطلب تھا کہ زہر کا اثر بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ ندیم کو جزی بوٹیوں کی تاثیر پر

اتنی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ قدرت نے انسان کی بھلائی کے لئے اس زمین پر کیا کچھ پیدا

جھوٹے میں بھری ہوئی تمام عورتیں اور مرد بھی باہر چلے گئے۔

ندیم نے قابوس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس نے جھک کر

ایک کھال اس کے جسم پر ڈال دی اور قابوس کی طرف دیکھتا ہوا جھوٹے سے باہر آگیا۔

جھوٹے کے سامنے اب بھی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ وہ لوگ غالباً اسی واقعہ کے بارے

میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک قدرے بھاری بھر کم عورت ندیم کے قریب آگئی۔ اس نے

جسم پر جو کھال پہن رکھی تھی وہ چھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ نرم لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کا

اگرچہ ایک لفظ بھی ندیم کے پلے نہیں پڑ سکا تھا لیکن ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ

قابوس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔

ندیم اس سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرح سر ہل رہا تھا جیسے اس کی

بات سمجھ رہا ہو۔

اور پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے جانے لگے۔ کچھ دیر بعد ندیم اکیلا ہی رہ گیا۔

وہ ہٹ کے سامنے کھڑا دھڑا دھڑا دیکھنے لگا۔ چوک کی طرف سے شور اور تہقہوں کی آواز

سنائی دے رہی تھی۔ بستی کے لوگ اس واقعے کو بھول کر معمول کے مطابق اپنی

مصروفیات میں لگ گئے تھے۔ اور ان کی مصروفیات بھی اس وقت کیا تھیں؟ گیت گانا، گپ

شپ کرنا اور تہقہ لگانا۔

ندیم ہٹ کے اندر آگیا۔ قابوس سوچا تھا اور محسن دیوار سے ٹیک لگائے خاموش اور

افردہ سا بیٹھا ہوا تھا۔ ندیم بھی اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”صرف دو دن سکون سے گزرے تھے۔“ محسن نے کہا۔ ”لگتا ہے جیسے خطرات نے

ایک بار پھر ہمیں اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا ہے۔“

”ہاں.....! لگتا تو ایسا ہی ہے۔“ ندیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”نقہ ریکی

گردش ہے جو بار بار ہمیں اپنی پیٹ میں لے رہی ہے۔ گنجوں کی اس بستی میں پہنچ کر مجھے

کچھ اطمینان ہوا تھا کہ ہم تہذیب و تمدن سے دور سہی لیکن اپنے جیسے انسانوں میں تو ہیں۔

لیکن یہ انسان تو بہت مختلف نکلے..... گو کہ یہ ہمارے لئے بہت مہربان اور ہمدرد ثابت

ہوئے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قابوس پر زہر میں بجھے ہوئے نیزے سے حملے

کس نے کیا اور کیوں کیا تھا؟ اس حملے سے لگتا ہے کہ حملہ آور جو کوئی بھی تھا قابوس کو جان

سیدھی کر رکھی تھی جیسے کسی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو۔ اس نے ندیم کی چال ہی سے اسے پہچان لیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے ندیم کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

”وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں تمہارے لئے بھنا ہوا گوشت لے آیا ہوں۔“ ندیم نے جھونپڑے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمارا کھانا تو ایک آدمی دے گیا ہے۔ بھنی ہوئی دورانیں ہیں۔ میں باہر کھڑا تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ محسن نے اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔

کڑی کے ایک طشت میں بھنی ہوئی دورانیں رکھی ہوئی تھیں۔ ندیم نے گوشت کا وہ ٹکڑا بھی طشت میں رکھ دیا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”آؤ..... شروع ہو جاؤ۔“ ندیم نے کہا۔

”قابوس کوچگائیں یا نہیں؟“ محسن اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”نہیں!“ ندیم نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”اسے کوئی نشہ آور مشروب پلایا گیا ہے۔ وہ نشہ کے زیر اثر گہری نیند میں ہو گا۔ اسے سویا رہنے دو۔“

وہ دونوں کھانا کھانے لگے۔ وہ دونوں بمشکل ایک ہی ران ختم کر سکے تھے۔ دوسری ران انہوں نے ہٹ میں کونے میں پڑے ہوئے ایک پتھر پر رکھ دی تھی کہ اگر صبح ناشتہ ملنے میں دیر ہوئی تو اس سے پیٹ بھر لیں گے۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بستی میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر بتدریج خاموشی چھا چلی گئی۔ مزید ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد تو فضا میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ ندیم اور محسن دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

ندیم کا خیال تھا کہ آج رات ویلور شاید اسے ملاقات کے لئے نہ بلائے۔ لیکن وہ جاگتا رہا۔ لوگ شام کو پیش آنے والے واقعے کو بھول گئے ہوں گے۔ یہ کچھ عجیب فطرت کے مالک تھے۔ جب کوئی اس قسم کا واقعہ رونما ہوتا تو پوری بستی میں کھلبلی مچ جاتی۔ یہ لوگ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیتے۔ لیکن ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد سب کچھ اس طرح بھول جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آج صبح مانگا کی لاش ملنے کے بعد پوری بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ بستی کے سب ہی لوگوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ لیکن مانگا کی لاش کو ٹھکانے

نہیں کیا تھا؟ لیکن انسان ہی ناشکر ہے۔

”تم بیٹھو! میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔“ ندیم کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس نے ایک راتقل بھی اٹھالی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ محسن نے پوچھا۔ اس پر ایک دم گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی تھی۔

”چوک تک۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”چند منٹ میں آ جاؤں گا۔“

”ندیم ہٹ سے نکل گیا۔ وہ کچھ دیر تک ہٹ کے سامنے کھڑا محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر چوک کی طرف چل دیا جہاں اونچی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ندیم جب قریب پہنچا تو دس بارہ عورتیں اور مرد ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہی رینڈیر یا کسی اور جانور کا بھنا ہوا گوشت۔ وہ لوگ وحشیوں کی طرح گوشت نوج نوج کر کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔

ندیم کو دیکھ کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ ندیم بھی خاموشی سے ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ایک آدمی نے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر ندیم کی طرف بڑھادیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ندیم نے گوشت کا ٹکڑا لے لیا اور اس آدمی کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے دوسری طرف وہی موٹی سی عورت بیٹھی ہوئی تھی جس نے ہٹ کے سامنے ندیم سے اظہار ہمدردی کیا تھا۔

ندیم بوٹیاں نوج کر کھانے لگا۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا ایک آدمی گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔ ندیم نے محسوس کیا کہ وہاں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بڑی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دو اور آدمی گوشت کے ٹکڑے کھا کر وہاں سے چلے گئے۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ اس کی وجہ سے اٹھ کر جا رہے تھے۔ بالآخر ندیم نے بھی گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھالیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے وہاں بیٹھے ہوئے آدمیوں اور عورتوں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اپنے جھونپڑے کی طرف چلے گا۔

محسن جھونپڑے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے راتقل اس طرح

ہاتھ۔ لیکن ندیم پوری طرح جاگ رہا تھا۔ اور پھر دفعۃً کسی بچے کے رونے کی آواز سن کر ہچک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی بچہ منہ سے رونے کی دو آوازیں نکال کر خاموش ہو گیا۔

ندیم نے آہستگی سے محسن کو ہلادیا۔ محسن نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔  
”کک..... کیا ہوا؟“ اس نے رائفل پر گرفت جماتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے سنگل ملا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔ لیکن میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔“  
یم نے سرگوشی کی اور رائفل سنبھال کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن اچانک ہی ایک ہلکی سی آواز سن کر چونک ا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے بہت ہلکی آواز میں سسکی بھری ہو۔ ندیم رائفل سنبھالے محتاط ازمیں آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ تقریباً دس گز کے فاصلہ پر دوسرا جھوپڑا تھا۔ وہ جیسے ہی یب پہنچا ایک دراز قد آدمی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔

وہ نمران تھا جو ایک ہاتھ میں نیزہ سنبھالے کھڑا تھا۔ اس نے ندیم کو اپنے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا۔ ندیم نے بھی اشارے سے اسے رکنے کو کہا اور دبے قدموں چلتا ہوا اپنے پیڑے میں آگیا۔ محسن رائفل سنبھالے دروازے کے اندر تیار کھڑا تھا۔

”ویلو راکا آدمی مجھے لینے کے لئے آگیا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے واپسی میں دیر ہو جائے۔  
ناتم پریشان مت ہونا۔ اور اگر یہاں کوئی بڑبڑ ہوئی تو رائفل احتیاط سے استعمال کرنا۔ یہ شش کرنا کہ گولی دشمن کی ٹانگ پر لگے۔“ ندیم نے کہا۔  
”ٹھیک ہے۔ مطمئن رہو۔“ محسن نے جواب دیا۔

ندیم جھوپڑے سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا دوبارہ نمران کے قریب پہنچ گیا۔  
ناتم دیکھنے ہی چل پڑا تھا۔ بستی میں وہ دبے قدموں چلتے رہے۔ لیکن بستی سے نکلتے ان کی رفتار تیز ہو گئی اور پھر یہ دیکھ کر ندیم چونک گیا کہ ان کا رخ اس پہاڑی کی طرف کس کے دوسری طرف بھوکے چیتوں والا غار تھا۔ ایک لمحہ کو ندیم کے ذہن میں یہ آیا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا جا رہا؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے مل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ ویسے وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے رائفل ساتھ کرا چھا ہی کیا تھا۔

لگانے کے بعد بستی کے لوگ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے اور وہاں کو اس طرح بھول گئے تھے جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

اس بستی کا کوئی قبرستان نہیں تھا۔ یہ لوگ شاید مردوں کو دفن کرنا نہیں جانتے تھے۔ اور پھر کسی مردے کو دفن کرنے کا موقع ہی کب آتا تھا۔ اپنے مردوں کو تو وہ بھوکے درندوں کی خوراک بنا دیتے تھے۔ ندیم نے ایک اور بات بھی نوٹ کی تھی کہ اس بستی میں کوئی جھوپڑا کسی ایک فیملی کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ جس کا جس جھوپڑے میں دل چاہے گھس جاتا۔ لیکن یہ غنیمت تھا کہ ابھی تک کسی نے ان کے جھوپڑے میں مداخلت نہیں کی تھی۔

غالباً رات کے دس بج رہے ہوں گے۔ ندیم ایک بار پھر اٹھ کر جھوپڑے سے باہر آ گیا۔ تاریکی اور گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنا کی نہیں دے رہی تھی۔ بستی کے لوگ اپنے اپنے جھوپڑوں میں دیکے گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ کچھ دیر باہر کھڑے رہنے کے بعد ندیم دوبارہ جھوپڑے میں آگیا۔

”میرا خیال ہے وہ آج رات تمہیں نہیں بلائے گی۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ آرام سے لمبی تان کر سو جاؤ۔“ محسن نے کہا۔

”ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ ہے۔ ہمیں کم از کم آدھی رات تک انتظار کر لینا چاہئے۔ اور ویسے بھی آج رات لمبی تان کر سونا مناسب نہیں ہوگا۔“ ندیم نے کہا۔

”کیوں؟“ محسن نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
”جس نے قابوس پر حملہ کیا تھا وہ موقع پا کر دوبارہ بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے اس لئے کم از کم ہمیں آج کی رات تو جاگ کر گزارنی چاہئے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں آج کی رات جاگ کر ہی گزارنی ہوگی۔“ محسن نے کہتے ہوئے غیر ارادی طور پر رائفل اپنے ہاتھ میں لے لی۔

وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ وہ اگرچہ آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر ن کے کان کسی آہٹ یا کسی آواز پر لگے ہوئے تھے مگر گہرے سناٹے میں کسی قسم کی آواز نائی نہیں دے رہی تھی۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ محسن دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز پوزیشن میں بیٹھا دیکھنے

”اگر حملہ اس نے کرایا تھا تو پھر اسے قابوس کو بچانے کی کیا ضرورت تھی؟“ ندیم بولا۔

”یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ تم لوگوں کا ہمدرد ہے۔ اگر وہ قابوس کو نہ بچاتا تو تم لوگوں کے دل میں کدورت آسکتی تھی۔“ ویلور نے کہا۔

”اگر ہسپتال کو تم پر شبہ ہو گیا ہے تو آج رات ہماری یہ ملاقات نہیں ہونی چاہئے تھی۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری نگرانی کر رہا ہو۔“ ندیم بولا۔

”آج میں نے اسے نیند آور رس کے دو قطرے پلائے تھے۔ صبح سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ وہ یقیناً میری نگرانی کر رہا ہے۔ لیکن میں چھپ کر آئی ہوں۔ ہسپتال کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس کے آدمی مانگا کو تم نے قتل کیا تھا۔ کیونکہ ایک آدمی نے بتایا تھا کہ ندی کی طرف سے چیخوں کی آواز سن کر اس نے سب سے پہلے ہمارے ہٹ میں جھانکا تھا اور اس وقت تم اپنے بستر پر نہیں تھے۔ لیکن جب میں اس کے ساتھ آئی تو تم وہاں موجود تھے اور صبح جب تم سردار کی موجودگی میں چوک پر آئے تھے تو تمہارے کپڑے بھیکے ہوئے تھے۔ اس نے تم کو تو بے قصور قرار دے کر تسلی دے دی تھی لیکن تمہارے بھیکے ہوئے کپڑے دیکھ کر اسے تم پر شبہ ہو گیا تھا۔ اور آج دن میں تالاب کے قریب ہمیں اکٹھے دیکھ کر اس کے شبہ کو مزید تقویت ملی اور آج شام اس نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی لیکن زد میں تمہارا سا تھی آگیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہم پر مزید حملے کر دے سکتا ہے۔“ ندیم کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”کیا ایسی صورت میں یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم جلد سے جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ تم اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہو؟ اور جیکو کہاں ہے؟“

”اسے ایک الگ جھونپڑے میں رکھا گیا ہے۔ ایک محافظ اس کی نگرانی اور دو عورتیں اس کی دیکھ بھال کے لئے جھونپڑے میں موجود ہیں۔ لیکن جب تک تمہارا سا تھی چلنے کے قابل نہ ہو جائے تم لوگ یہاں سے کیسے جاسکو گے؟“ ویلور نے کہا۔

”تمہارے خیال میں اسے ٹھیک ہونے میں کتنے دن لگیں گے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”میں صبح کچھ دوائیں بھیج دوں گی۔ ایک دوا اس کے زخم پر لگانے کے لئے ہو گی اور ایک کھانے کے لئے۔ ان دواؤں کے استعمال سے وہ تین چار روز میں چلنے پھرنے لگے

نمران بڑی تیزی سے چل رہا تھا اور ندیم کے لئے اس کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔ بھوکے چیتوں والے کھڑے تقریباً بیس گز پہلے نمران ایک چٹان کے قریب رک گیا۔ گہرے کھڑے چیتوں کے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کھڑا خاصا گہرا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ زندہ چیتے اس کھڑے میں چھوڑے گئے ہوں گے؟ وہ نمران سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر مختلط انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

نمران نے چٹان کے قریب رک کر منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ اس کے ساتھ ہی چند سینکڑ بعد چٹان کے دوسری طرف چند چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی اور ایک سایہ چٹان کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔

وہ ویلور تھی۔ جو ندیم کے سامنے آکر رک گئی۔ ندیم گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تاریکی ہونے کے باوجود ویلور کے جسم کے برہنہ حصے صاف نظر آرہے تھے۔ ویلور نے نمران کی طرف رخ کر کے کچھ کہا۔ وہ ایک طرف ڈھلان پر اتر گیا۔

ویلور نے آگے بڑھ کر ندیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے نرم ملائم ہاتھ کے لمس سے ندیم اپنے آپ میں عجیب گدگدی کی سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ ویلور اسے لے کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ ندیم نے راتفل اپنے دائیں طرف زمین پر رکھ لی تھی۔

”مجھے تمہارے ساتھ ہی کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا فوس ہے۔“ ویلور نے کہا۔ ”لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ بروقت پتہ چل گیا تھا۔ اگر دیر ہو جاتی تو اس کی جان بچا سکتی تھی۔“

”یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“ ندیم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہمارا دشمن یہاں کون ہو سکتا ہے؟“

”میرا خیال ہے سردار ہسپتال کو شبہ ہو گیا ہے۔“ ویلور نے کہا۔ ”کل اس نے دونوں کو تالاب پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تمہیں پانی میں دھکا دے کر اس نے اگرچہ بانہ مذاق میں ٹال دی تھی لیکن میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت کینہ پرور آدمی ہے اسے شبہ ہو گیا ہے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف کوئی سازش کروں۔ وہ حملہ اس نے دراصل تم پر کر لیا ہو گا لیکن زد میں دوسرا آگیا۔“

ندیم نے راقفل اٹھائی اور وہ دونوں چٹان کے دوسری طرف ڈھلان کی طرف دوڑے۔  
نمران ایک گنبج کے ساتھ ڈھلان پر گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ ندیم نے راقفل سیدھی کر لی۔ لیکن ویلور نے ہاتھ اٹھا کر اسے راقفل استعمال کرنے سے روک دیا۔

”اس کی آواز پوری بستی کو یہاں جمع کر دے گی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔  
نمران اور اس کا حریف ایک دوسرے سے گتھم گتھا ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے جھاڑیوں میں اٹک کر رک گئے۔ حریف نے نمران کو دبوچ رکھا تھا۔ ندیم نے نمران کی مدد کے لئے آگے بڑھنا چاہا مگر ویلور نے ایک بار پھر اسے روک لیا۔

”نمران اتنا کمزور نہیں ہے۔ وہ اکیلا اس جیسے چار آدمیوں پر بھی قابو پاسکتا ہے۔“  
ندیم رک گیا۔ ویلور نے غلط نہیں کہا تھا۔ نمران نے جلد ہی اپنے حریف کی گرفت سے نجات حاصل کر لی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے حریف نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کے سامنے کھڑے خونخوار نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے دو پہاڑ آپس میں ٹکرائے ہوں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ نمران نے بڑی پھرتی سے جھک کر اپنے حریف کو پکڑ کر سر سے اوپر اٹھالیا اور دو تین چکر کاٹنے کے بعد اسے سینٹ کی بوری کی طرح پتھروں پر پٹخ دیا۔

حریف کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی تھی۔ نمران نے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے دبوچ لیا۔ حریف کی گردن اس کی آہنی بانہوں کی گرفت میں تھی۔ اس نے حریف کی گردن کو ایک بازو کی پلیٹ میں لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ تیسرے جھٹکے پر کڑاک کی آواز ابھری اور حریف کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا لیکن نمران نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔

”اسے اٹھا کر چیتوں کے کھڈ میں پھینک دو۔“ ویلور نے نمران کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی زبان میں کہا۔

نمران نے جھک کر لاش کندھے پر اٹھائی اور چٹان پر چڑھنے لگا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ جسم پر لپیٹی ہوئی کھال سے اس طرح مسل رہا تھا

”گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کم از کم ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے گا۔“ ندیم بولا۔  
”ایک ہفتہ نہیں، کم از کم پندرہ سولہ دن۔“ ویلور نے کہا۔

”وہ کیوں؟“ ندیم نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہسپو لانے جیکو سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ ویلور نے کہا۔ ”اور شادی کی یہ رسم پورے چاند کی رات کو ادا ہوگی۔ چودھویں شب کا چاند جیسے ہی طلوع ہو گا دونوں کی انگلیوں سے خون کا ایک ایک قطرہ نکال کر شادی کی رسم پوری ہو جائے گی۔ اس رات ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔“

”ہم..... کیا مطلب؟“ ندیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم بھی.....؟“

”ہاں!“ ویلور نے جواب دیا۔ ”ہسپو لا کو پتہ چل جائے گا کہ میں نے تم لوگوں کو فرار میں مدد دی ہے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ غداری کی سزا بڑی خوفناک ہوتی ہے۔ اس لئے میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ چند روز ہمارے لئے بڑے اذیت ناک ثابت ہوں گے۔“  
ندیم بولا۔

”اس قبیلہ میں نمران کی طرح میرے کچھ اور بھی وفادار ہیں۔“ ویلور نے کہا۔ ”میں کل ہی انہیں ہدایت کر دوں گی۔ وہ تم لوگوں سے دور رہ کر تمہاری حفاظت کریں گے۔ میرا خیال ہے کل نیا چاند طلوع ہو گا۔ جیسے تیسے یہ دن تو گزارنا ہوں گے۔“  
”اور جیکو؟“ ندیم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”فکر مت کرو۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔“ ویلور افسوس کرتے ہوئے اس پر جھک گئی۔

ندیم نے سرکنے کی کوشش کی مگر ویلور نے اسے اپنی مرمریں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ ندیم کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں یکدم اٹھ چل پڑے۔  
ڈھلان کی طرف سے ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے دو آدمیوں میں دھینگا مشتی پوری ہو۔ بلکی بلکی غراہٹیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پتھروں کے لڑھکنے کی آوازیں بھی۔

جیسے ہاتھ صاف کر رہا ہو۔

وہ تینوں ڈھلان اترنے لگے۔ بستی کے قریب پہنچ کر وہ محتاط ہو گئے۔

”نمران کے ہاتھوں مرنے والا ہسپتال کا خاص آدمی تھا۔“ ویلور نے ایک جگہ رکتے ہوئے ندیم کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔ ”اسے یقیناً میری نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کی گمشدگی پر ہسپتال پاگل ہو جائے۔ اب تم لوگوں کو مزید احتیاط سے رہنے کی ضرورت ہوگی۔ اب تم یہاں سے جھوپڑے کی طرف چلے جاؤ۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کی نظروں میں نہ آ جاؤ۔ میں اب دو چار روز بعد تم سے رابطہ کروں گی۔ تم جاؤ۔۔۔۔۔“

میں نمران کے ساتھ دوسری طرف سے چلی جاؤں گی۔“

ندیم رانقل سنبھالے بستی کی طرف چلنے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں دو ہیولے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نظر آئے اور پھر وہ دونوں نیچے جھکتے چلے گئے۔ ندیم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ویلور، نمران کو اس کی خدمات کا معاوضہ دینے کے لئے وہاں رکی تھی۔ وہ مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بستی کی طرف چلنے لگا۔

ندیم جب ہٹ میں داخل ہوا تو محسن رانقل سنبھالے مستعد بیٹھا تھا۔ ندیم کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

”کوئی ہٹ کی طرف آیا تو نہیں تھا؟“ ندیم نے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! میں تو پردے کی آڑ میں دروازے کے قریب ہی بیٹھا رہا تھا۔ کسی کو اس طرف سے گزرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔“ محسن نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ ”ویلور کے ساتھ ملاقات میں کیا ملے؟“

”چاند کی چودھویں شب سردار ہسپتال، جیکو سے شادی کرنے والا ہے۔ اس رات ہمارے فرار کا منصوبہ ہے۔ ویلور ابھی ہمارے ساتھ جائے گی لیکن اس سے پہلے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمیں کسی بھی صورت حال سے غمنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔“ ندیم نے کہا۔

”کوئی گڑبڑ؟“ محسن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں! سردار کا ایک اور آدمی ہمارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”سردار کو ویلور پر شبہ ہو چکا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر اس کے خلاف کوئی گڑبڑ کر سکتی ہے یا ہمیں یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے سکتی ہے۔ اس لئے وہ خفیہ طور پر ویلور کی نگرانی کر رہا ہے۔ ویلور نے سردار کو تو خواب آور رس پلا کر اسے گہری نیند سلا رکھا ہے۔ لیکن اس کا آدمی ویلور کا پیچھا کرتا ہوا ہم تک پہنچ گیا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ ویلور کا ایک قابل اعتماد ساتھی نمران ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اس نے سردار کے آدمی کی گردن مروڑ کر اس کی لاش بھوکے چیتوں والے کھڈ میں پھینک دی۔ صبح جب سردار کو اپنے آدمی کی گمشدگی کا پتہ چلے گا تو وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ خدا کرے قابوس دو چار روز میں چلنے کے قابل ہو جائے تو چاند کی چودھویں شب سے پہلے ہی ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔“

”اور جیکو؟“ محسن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”اچھا! اب تم سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔ اب ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

محسن نے رانقل اپنے سر ہانے رکھ دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ ندیم دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورت حال پر غور کرنے لگا۔ صورت حال واقعی سنگین ہو گئی تھی۔ سردار ہسپتال کو کسی قسم کا شبہ ہو جانے کا مطلب تھا کہ وہ ایک بار پھر خطرات میں گھر گئے تھے۔ سردار کے دو آدمی مارے جا چکے تھے۔ مانگا تو خود ندیم کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور دوسرا نمران کے ہاتھوں۔ جس کی لاش بھوکے چیتوں کی خوراک بننے کے لئے گہرے کھڈ میں پھینک دی گئی تھی۔ سردار نے اس شخص کو خاص طور پر ویلور کی نگرانی پر معمور کیا تھا اور اس کا اس طرح غائب ہو جانا سردار کے شبہ کو تقویت دے سکتا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ ندیم اپنے ہٹ میں دروازے کے قریب بیٹھا سوچ رہا تھا کہ باہر شور کی آواز سنائی دی۔ ان آوازوں میں ویلور کی آواز نمایاں تھی جو چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ شور کی آواز سن کر محسن بھی اٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ یہ شور کیسا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پتہ نہیں کیا بات ہے؟ ویلور کے چیخنے کی آواز آرہی ہے۔ تم ذرا ہوشیار ہو کر بیٹھنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ ندیم کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ لیکن وہ اس مرتبہ رانقل ساتھ لے کر



نہیں گیا تھا۔

سردار کے جھوپڑے کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ تین چار آدمی مشعلیں لئے کھڑے تھے۔ ویلور ایچ جیج کرکچھ کہہ رہی تھی۔ ندیم لوگوں کو ہٹاتا ہوا قدرے آگے بڑھ گیا۔ ویلور نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ گنوں کی زبان میں چیخنے کے ساتھ ایک آدھ لفظ انگریزی کا بھی بولتی جا رہی تھی۔ اس جیج وپکار میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا مقصد ندیم کو پیغام دینا تھا اور ندیم اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

”میں نے ان لوگوں کو بتایا ہے کہ گلوں نے سردار کو کھانے میں بے ہوشی کا رس دے دیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ سردار گہری نیند میں ہے تو اس نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی۔ میں نے مزاحمت کی تو گلوں نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ میں نے شور مچا دیا جس پر وہ جھوپڑی سے نکل کر ان چٹانوں کی طرف بھاگ گیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب سردار کو پتہ چلے گا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ گلوں نے جان کے خوف سے بھاگ گیا ہے۔“

ویلور مسلسل چیخ رہی تھی۔ ندیم نے پہلی مرتبہ ویلور پر توجہ دی تو اسے پتہ چلا کہ ویلور کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ پشت پر بندھی ہوئی کھال کی ڈوریاں ٹوٹ گئی تھیں اور کھال کمر سے نیچے لٹکی ہوئی تھی۔

ویلور ایچ جیج کر ایک طرف اشارہ کر رہی تھی۔ پانچ چھ آدمی نیزے سنبھال کر منہ سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے چٹانوں کی طرف دوڑ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مشعل بھی تھی۔

لوگ اپنے گھروں سے نکل نکل کر جمع ہو رہے تھے۔ ویلور بہت غصے میں تھی اور تمام گنچے اس کے غصے سے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ بعض عورتیں تو اس کی باتیں سن کر بین کرنے لگی تھیں اور بعض نے سینہ کو پی شروع کر دی تھی۔ ایہ عورت اور وہ بھی ان کی ملکہ کی توہین کی گئی تھی جس کا انہیں بے حد صدمہ پہنچا تھا۔

ندیم واپس آ گیا۔ محسن نے دروازے کا پردہ ہٹا رکھا تھا اور دیدے پھاڑے باہر دیکھ رہا تھا۔ ندیم کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

”کیا ہوا؟ یہ نیولین کی پڑپوتی کیوں چیخ رہی ہے؟“ محسن نے پوچھا۔

”اس نے ہمیں بچانے کے لئے یہ سارا نالٹک رچایا ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ محسن نے اسے گھورا۔

”نمران کے ہاتھوں مارا جانے والا آدمی گلوں، سردار کے چند خاص آدمیوں میں سے تھا۔ اس کی گمشدگی پر ہم پر شبہ کیا جاتا لیکن ہمیں بچانے کے لئے ویلور نے جیج کر لوگوں کو جمع کر لیا اور انہیں بتا رہی تھی کہ گلوں نے سردار کو بے ہوشی کی دوا کھلا کر اس کی ملکہ کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ جان کے خوف سے پہاڑی کی طرف بھاگ گیا ہے۔ چند آدمی اس کی تلاش میں بھیجا چکے ہیں تاکہ اسے پکڑ کر سزا دی جاسکے۔“ ندیم نے اسے تفصیل سے بتا دیا۔

”میرا خیال ہے اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اطمینان سے سو جانا چاہئے۔“ محسن بولا۔

”خطرہ تو ہے۔ بہر حال تم سو جاؤ۔ میں تھوڑی دیر اور جاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ندیم نے کہا۔

”نہیں! میں تو تھوڑی نیند لے چکا ہوں۔ تم سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔“ محسن نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ندیم سو گیا اور محسن جاگتا رہا۔

ندیم کی جب آنکھ کھلی تو باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دروازے کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور دھوپ اندر آرہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قابوس بھی جاگ رہا تھا۔

”ہیلو!“ ندیم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نئی زندگی مبارک ہو۔ کل تو ہم، تم سے مایوس ہو گئے تھے۔“

”زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔“ قابوس نے جواب دیا۔ ”لیکن زندگی میں اتنی اذیت کبھی نہیں ہوئی جو کل میں نے چند منٹ میں اٹھائی ہے۔“

”تمہاری بے ہوشی میں یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ ہم اس قینے سے فرار کی تیاری کر رہے ہیں۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ سردار نے ہمیں مردانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔“

ندیم نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ اس نے مانگا کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

قبیلے کے لوگ ان سے خوفزدہ رہنے لگے ہیں اس لئے جب تک اصل معاملے کا پتہ نہیں چلتا یہ لوگ کم سے کم باہر نکلیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ اب ہم اپنے آپ کو ان کا قیدی سمجھیں؟“ محسن بولا۔

”تقریباً!“ قابوس نے جواب دیا۔ ”لیکن جھوٹے سے نکلنے پر بالکل پابندی نہیں ہے۔“

تین چار روز گزر گئے۔ قابوس اب چلنے پھرنے لگا تھا۔ دوانے حیرت انگیز طور پر اثر کیا تھا اور اسے چلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ ایک روز وہ تینوں جھوٹے سے باہر تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب واپس آئے تو ان تینوں کے بیگ غائب تھے۔

”میرے بیگ میں ہیرے تھے، وہ بھی گئے۔ لیکن غنیمت ہے کہ رائفلیں ہمارے پاس تھیں اس لئے یہ بچ گئیں۔“ قابوس نے کہا۔

ندیم یا محسن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بیگ غائب کرنے میں سردار کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ اس شام ویلور، نمران اور ایک اور گنجنے کے ساتھ ان کے جھوٹے میں پہنچ گئی۔

”دو دن بعد تم تینوں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈالنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔“ ویلور نے سرگوشی میں کہا۔ ”آج رات تم تینوں تیار رہنا۔ نمران تم لوگوں کو لینے کے لئے آئے گا۔ پہلے ایک جھوٹے سے چھیکو کو چھڑوایا جائے گا اور اس کے بعد ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ چھیکو کے ہٹ میں دو خونخوار محافظ تعینات کر دیئے گئے ہیں۔ دو عورتیں بھی ہیں۔ وہ چاروں جھوٹے کے اندر موجود ہوں گے۔ تم لوگوں کو ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

ویلور اور گنجنے چلے گئے اور یہ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر تینوں کے بونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ سردار واقعی بے حد کینہ پرور ثابت ہوا تھا اور اس نے بالآخر ان تینوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اور پھر آدھی رات کے بعد وہ تینوں ہٹ سے نکل کر نمران کے ساتھ چوروں کی طرح اس ہٹ کی طرف جا رہے تھے جہاں چھیکو کو قید رکھا گیا تھا۔

”یہ خانہ خراب فرنگی ہے۔“ قابوس کا اشارہ ویلور کی طرف تھا۔ ”یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی؟ کب کا منصوبہ بنایا ہے؟“

”ویسے تو چاند کی چودھویں شب کا منصوبہ ہے۔ لیکن کسی ہنگامی صورت حال میں اس سے پہلے بھی پروگرام بن سکتا ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔“

ندیم بولا۔

”مجھے حیرت ہے کہ زخم میں زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی۔ ذرا اٹھ کر چلوں پھروں گا تو کچھ اندازہ ہوگا۔“ قابوس نے جواب دیا۔

وہ لوگ بہت دیر تک انتظار کرتے رہے کہ انہیں کھانے کو کچھ بھیجا جائے گا یا بلایا جائے گا۔ لیکن جب نہ کچھ کھانے کو آیا نہ بلایا گیا تو انہوں نے وہی بھنی ہوئی ران اٹھا کر کھائی جو رات کو فگ گئی تھی اور محسن نے سنبھال کر رکھ دی تھی۔

دوپہر کے لگ بھگ ایک گنجا آکر انہیں مٹی کے دو کوزے دے گیا۔ ان میں دوائیں تھیں۔ اس نے ندیم کو اشاروں سے سمجھا دیا کہ کون سی دوا کھانے کو تھی اور کون سی زخم پر لگانے کی۔ ظاہر ہے یہ دوائیں ویلور نے بھیجی تھیں۔ ندیم نے قابوس کے زخم پر دو الگ الگ دوا اور کھانے والی دوا کی بھی ایک خوراک دے دی۔

قابوس دن بھر لیٹا رہا۔ محسن اور ندیم بھی اشد ضرورت کے تحت صرف ایک دو مرتبہ جھوٹے سے باہر نکلے تھے جبکہ دن کا زیادہ حصہ جھوٹے ہی میں گزارا گیا تھا۔ دن بھر انہیں کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ انہیں کھانے کو بھی کچھ نہیں ملا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد سردار ایک عورت اور دو آدمیوں کے ساتھ آ گیا۔ عورت نے لکڑی کا طشت اٹھا رکھا تھا جس میں شاید ابلے ہوئے چاول بھرے ہوئے تھے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ چاول نہیں تھے کسی قسم کے سفید بچ تھے اور ان کا ذائقہ بے حد لذیذ تھا۔

سردار دیر تک قابوس سے شینا اور برہنسکی زبانوں میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد قابوس نے انہیں بتایا کہ بقول سردار جب سے یہ لوگ آئے ہیں کچھ عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ پہلے ندی میں اس کے ایک آدمی کی لاش ملی۔ پھر قابوس پر قاتلانہ حملہ ہوا اور گزشتہ رات اس کا ایک آدمی پر اسرار طور پر لاپتہ ہو گیا ہے۔

”اگر سردار کو پتہ چل گیا کہ ہم نے رات اس طرح باری باری سو کر گزاری ہے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ دوسرے محافظ نے جواب دیا۔

”سردار کو کیسے پتہ چلے گا؟ اور پھر وہ لڑکی کون سا بھاگ جائے گی۔ وہ گہری نیند سو رہی ہے اور وہ صبح سے پہلے نہیں اٹھے گی۔ دو عورتیں اس کے ساتھ اندر بھی موجود ہیں۔ وہ بھی سو رہی ہیں۔ تم سو جاؤ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں جگا دوں گا۔“ پہلے محافظ نے کہا۔

دوسرا محافظ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کی آواز پہچان لی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز پوزیشن میں بیٹھ گیا۔ نیزہ اس نے زمین پر لٹا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جلد ہی اوٹ گئے لگا۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ خود بھی پھسلتا ہوا زمین پر لبا ہو چکا تھا۔ پہلا محافظ اب پہلے سے زیادہ مستعد ہو گیا تھا اس نے دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ بستی میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر پردہ گرا کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

ندیم اور اس کے ساتھی اپنے جھونپڑے سے نکل کر نمران کے ساتھ چلتے ہوئے چیکو والے جھونپڑے کی پشت پر پہنچ گئے۔ وہاں رک کر نمران نے اشاروں میں انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ جو کہنا چاہتا تھا وہ سمجھنے میں انہیں دیر نہیں لگی۔ ندیم نے قابوس کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں رائفلیں بھی اس کے حوالے کر دیں اور پھر نمران اور محسن جھونپڑے کے ایک طرف اور ندیم دوسری طرف سے گھومتے ہوئے اس کے سامنے والے حصے کی طرف آنے لگے۔ وہ اس طرح احتیاط سے چل رہے تھے کہ قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ اپنی اپنی طرف سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔

ندیم اور نمران تقریباً ایک ہی وقت میں ہٹ کے اوپر سے گھومتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ محسن، نمران کے پیچھے تھا۔ نمران نے اپنا نیزہ محسن کے حوالے کر دیا اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے ندیم کو اشارہ کیا۔ ان دونوں نے دروازے کے سامنے لٹکے ہوئے کناروں کو پکڑ لیا اور پھر بیک وقت پردہ ہٹا کر بڑی پھرتی سے اندر داخل ہو گئے۔

محافظ اچانک ہی انہیں اپنے سامنے دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے نیزہ سیدھا کرنا چاہا۔ مگر نمران نے بڑی پھرتی سے اس پر چمٹا لگا دی اور محافظ کو سنبھلنے کا

چیکو والا جھونپڑا قدرے بڑا تھا۔ اگرچہ آمدورفت کے لئے دروازہ ایک ہی تھا لیکن اندر سے یہ جھونپڑا دو حصوں میں تقسیم تھا۔ گویا اس کے دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ آگے اور ایک پیچھے۔ ان دونوں کمروں کے بیچ میں بھی ایک دروازہ تھا۔

پہلے کمرے میں وہ دونوں خونخوار محافظ تھے جن کے بارے میں ویلور نے ان لوگوں کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ جھونپڑے کے دروازے پر کھال کا پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ دونوں اندر کی طرف دروازے کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ان میں ہر ایک کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ آنکھوں کی اس سرخی نے ان کے چہروں کو کچھ اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بھالے تھے جن کے آگے لوہے کی مخصوص ساخت کی تین نوک دار انیاں لگی ہوئی تھیں۔ دیوار پر لگی ہوئی مشعل کی روشنی میں بھالوں کی یہ انیاں چمک رہی تھیں۔

وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ اس طرح انہیں وقت گزارنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک محافظ اندرونی دروازے کے قریب چلا گیا۔ اس دروازے پر بھی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ذرا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا اور پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا اپنی جگہ پر آ گیا۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ایک محافظ جمائیاں لینے لگا۔ اسے شاید نیند آرہی تھی۔

”ہم دونوں کا بیک وقت جاگنا مناسب نہیں ہے۔“ دوسرے محافظ نے جمائیاں لینے والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی زبان اٹینٹی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کسی خالی ڈبے میں پتھر کھڑک رہے ہوں۔ ”تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ، میں جاگتا رہوں گا۔ پھر تم اٹھ جانا اور میں تھوڑی دیر کے لئے سولوں گا اس طرح ہم باری باری رات گزار لیں گے۔“

اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ندیم بھی اپنے حریف کو اگلی دنیا میں پہنچا چکا تھا۔ وہ بھی اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔ نمران اور ندیم نے ایک لمحے کو ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نمران نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا اور وہ دبے قدموں اس دروازے کی طرف بڑھے گئے۔ محسن بھی نیزہ سنبھالے ان کے پیچھے ہی تھا۔

ندیم نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ دوسرا کمرہ نسبتاً بڑا تھا اور یہاں بھی مشعل جل رہی تھی۔ تمام جھوپڑوں میں مشعل والی جگہ پر قدرے اوپر ایک سوراخ موجود تھا جس سے مشعل سے اٹھنے والا دھواں باہر نکل جاتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ رات بھر مشعل جلتے رہنے کے باوجود کسی ہٹ میں دھواں نہیں بھرتا تھا۔

اس کمرے کا منظر بڑا عجیب تھا۔ فرش پر کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور تین عورتیں سو رہی تھیں۔ درمیان میں جھیکو تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں قبیلہ کی ایک ایک گنچی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں جوان تھیں اور آڑی ترچھی لینے کی وجہ سے کھالیں ان کے جسموں سے ہٹ گئی تھیں۔ ندیم اندر داخل ہو گیا۔ نمران اور محسن بھی اس کے پیچھے ہی آ گئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر محسن کے ہاتھ سے نیزہ چھوٹ گیا اور اس کا دستہ ایک گنچی عورت کی پنڈلی کی ہڈی پر لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی، نمران نے لپک کر اس کا گلا دبوچ لیا۔

محسن، جھیکو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اچھی خوراک اور آرام نے اس پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اس کے سینے پر سے بھی چھتے کی کھال سر کی ہوئی تھی اور سینے کا زیر و بم قیامت ڈھا رہا تھا۔

نمران نے جس عورت کو دبوچا تھا اس کے منہ سے خرخراہٹ کی جیج سی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ بری طرح ہاتھ پیر پٹ رہی تھی۔ آواز سن کر جھیکو اور اس کے دوسری طرف سوئی ہوئی دوسری عورت بھی جاگ گئی۔

ندیم اور محسن بیک وقت حرکت میں آئے تھے۔ محسن نے جھیکو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ ندیم نے دوسری عورت کی گردن دبوچ لی۔ اسے ایک عورت کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کرتے ہوئے بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اسے زندہ چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ خود سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے۔

موقع دیئے بغیر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں محافظ کا پیر پھلا اور وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ نمران بھی اس کے اوپر ہی آ رہا تھا مگر اس نے محافظ کی گردن نہیں چھوڑی تھی۔

دوسرا محافظ فرش پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا اور ندیم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن نمران اور اس کے حریف کی دھینگا مشقی کی آواز سن کر سویا ہوا محافظ جاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، ندیم نے اسے چھاپ لیا۔ ندیم نے اس پر وہی داؤ آزما ہاتھ جس میں طاقت کم استعمال ہوتی تھی مگر ٹیکنیک سے حریف کو موت کے گھاٹ اتاراجا سکتا تھا۔ ندیم نے اپنے حریف کی گردن اپنے دائیں بازو کی پلٹ میں لے رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے سر کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔ اس کا حریف بہت طاقتور تھا۔ اس کا جسم فولادی تھا لیکن ندیم نے اسے زیر کرنے کے لئے جو ٹیکنیک استعمال کی تھی وہ بہت خطرناک تھی۔ ایسی ٹیکنیک میں حریف کی طاقت کسی کام نہیں آتی تھی۔

ندیم کے دانت بھنجے ہوئے تھے۔ اس کے جڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ حریف کی گردن پر اپنی پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اور بالآخر کڑاک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ندیم نے دو تین اور جھٹکے دیئے۔ حریف بری طرح تڑپ رہا تھا مگر ندیم اس کی ٹوٹی ہوئی گردن پر گرفت جمائے رہا۔

نمران نے بھی اپنے حریف پر یہی ٹیکنیک استعمال کی تھی۔ وہ بھی اپنے حریف کی گردن کو گرفت میں لئے زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔ تین چار روز پہلے ویلور کی نگرانی کرنے والے سردار کے محافظ کی گردن بھی اس نے اسی طرح توڑی تھی۔ اور اب بھی وہ یہی طریقہ استعمال کر رہا تھا۔ صرف ایک منٹ بعد نمران کا حریف بھی اس کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

محسن نیزہ سنبھالے ہٹ کے باہر کھڑا تھا۔ اندر سے اٹھاٹھ کی آوازیں سن کر وہ چونک گیا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ کہیں ندیم یا نمران تو محافظوں کی گرفت میں نہیں آ گئے۔ یہ خیال آتے ہی وہ نیزہ سنبھالے پردہ ہٹا کر بڑی پھرتی سے دروازے میں داخل ہو گیا لیکن یہاں کی صورت حال اس کے تصور سے مختلف تھی۔

نمران نے محسن کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنے حریف کی لاش فرش پر پٹختی اور

بیٹھا تھا۔ ندیم نے قابوس سے دوسری رائفل لے لی اور وہ نمران کی رہنمائی میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے۔

مختلف جھوپڑوں کے گرد گھومتے ہوئے وہ جلد ہی جھرنے والے تالاب پر پہنچ گئے جہاں ویلور اڈو اور گنجنے آدمیوں کے ساتھ ان کی منتظر کھڑی تھی۔ ان کے قریب ہی زمین پر ایک بڑی سی گٹھڑی پڑی تھی۔ ندیم وغیرہ کے آتے ہی ویلور نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ایک گنجنے نے جھک کر گٹھڑی سر پر لاد لی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گٹھڑی کو سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ دوسرے گنجنے پکے پاس بھی نیزہ تھا۔

”اس گٹھڑی میں کیا ہے؟“ ندیم نے ویلور سے پوچھا۔

”کھانے کا سامان! ہمیں کم از کم تین دن ویرانے میں سفر کرنا ہے۔ اب نکل چلو یہاں سے۔“ ویلور نے کہا۔ اور پھر نمران کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی زبان میں بولی۔

”نمران! تم آگے چلو۔ ہماری رہنمائی کرو۔“

نمران فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ وہ لوگ اس کے پیچھے چل پڑے۔ جھرنے والی چٹان کے پچھلی طرف پہنچ کر وہ ڈھلان اترنے لگے۔ چاند کی ابتدائی تاریکی تھی۔ نمران سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے وہ گنجا جس نے گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ اس کے پیچھے ملکہ اور پھر ندیم وغیرہ تھے۔ سب سے آخر میں دوسرا نیزہ بردار گنجا تھا۔ قابوس رائفل سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹانگ میں زخم ہونے کے باوجود وہ ان کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی لیکن اس بات پر اسے حیرت ضرور تھی کہ اتنا گہرا زخم دو چار روز میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ اگر وہ شہر میں ہوتا تو کئی روز تک ہسپتال میں پڑا رہتا۔

”ہمیں چند گھنٹوں تک تیز رفتاری سے چلنا ہو گا۔“ ملکہ نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر ان لوگوں کو ہمارے فرار کا پتہ چل گیا تو فوراً ہی ہمارا تعاقب شروع ہو جائے گا۔ یہ لوگ پہاڑوں میں بہت تیز رفتاری سے سفر کرتے ہیں۔ ہماری تلاش میں شکاری کتوں کی طرح چاروں طرف پھیل جائیں گے اور اس راستہ پر تو ان کی خاص توجہ ہو گی۔“

”اگر انہیں فوراً پتہ چل گیا تو کیا سردار بیدار ہو سکتا ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

جیکو کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ وہ ابھی تک محسن یا ندیم کی شکل نہیں دیکھ سکی تھی۔ جب اس نے نمران کو دیکھ لیا تھا جو اس کی ایک محافظ عورت کا گلا دبوچ رہا تھا۔ جیکو چیخا چاہتی تھی مگر اس کا منہ اس سختی سے بند کر دیا گیا تھا کہ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنے منہ پر رکھا ہوا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جیکو! ڈرو نہیں۔ یہ میں ہوں، محسن! چیخنا مت۔ میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔“ محسن نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی اور اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ جیکو کے چہرے پر اب بھی خوف کی جھلک تھی۔ وہ متوحش نگاہوں سے پہلے محسن اور پھر ندیم اور نمران کی طرف دیکھنے لگی جو ان گنجی عورتوں کو دبوچے ہوئے تھے۔

”یہ گنجا ہمارا ہی ساتھی ہے۔“ محسن نے سرگوشی کی۔ ”اس قبیلے کے سردار نے تم سے شادی کرنے اور ہم سب کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے ہم لوگ یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔ اس قبیلے کی ملکہ بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔“

”ملکہ؟“ جیکو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ کسی قبیلے کی ملکہ اپنے قبیلے کو چھوڑ کر بھاگ رہی ہو؟“

”وہ اس قبیلے کی عورت نہیں ہے۔“ محسن نے بتایا۔ ”وہ فرانسیسی عورت ہے۔ کئی سال پہلے کسی طرح ان کے ہاتھ لگ گئی تھی اور سردار نے اس سے شادی کر لی تھی۔ اب وہ اپنے لوگوں میں جانا چاہتی ہے اس لئے ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ اب تم جلدی سے اٹھ کر اپنا سامان سمیٹو! تمہارا بیگ کہاں ہے؟ ہمارے بیگ تو چوری ہو گئے اور یہ ایک فالتو کھال اپنے اوپر لپیٹ لو۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔“

جیکو جلدی سے اٹھ گئی اور ایک کھال اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹنے لگی۔ محسن نے کھال کے اسٹریپ اس کی پشت پر باندھ دیے۔ جیکو کا بیگ کونے میں پڑا ہوا تھا۔ محسن نے لپک کر وہ بیگ اٹھا لیا۔ نمران اور ندیم ان عورتوں سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ نمران نے اپنا نیزہ اٹھا لیا اور انہیں اشارہ کیا۔ وہ لوگ پہلے کمرے سے باہر آ گئے۔ نمران نے باہر والے دروازے سے جھانک کر دیکھا ورنہ انہیں اشارہ کیا۔ اور وہ سب لوگ ہٹ سے باہر آ گئے۔ ہٹ کے پچھلی طرف قابوس ان کا منتظر تھا۔ اس نے ایک رائفل کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور دوسری رائفل دونوں ہاتھوں میں سنبھالے کسی گوریلے کی طرح پوزیشن سنبھالے

جائے گی۔ یوں بھی میرا خیال ہے ہم خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں۔“

”تم اس قبیلے کے لوگوں کو نہیں جانتے۔“ ویلور نے کہا۔ ”یہ اپنے شکار کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اسے شکار نہ کر لیں یا خود اس کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہم اپنے آپ کو اس وقت تک خطرے سے محفوظ نہیں سمجھ سکتے جب تک اس بستی میں نہ پہنچ جائیں بلکہ اس بستی سے بھی آگے نہ نکل جائیں۔ تم سردار ہسپولا کی عزیز ترین متاع کو لے کر بھاگ رہے ہو۔ ایک مجھے اور دوسری چیکو.... ہسپولا آسانی سے تمہارا پیچھا کیسے چھوڑ دے گا؟ وہ تو دنیا کے آخری سرے تک تمہارا تعاقب کرے گا۔ اور جہاں تک تمہارے ساتھی قابوس کا مسئلہ ہے تو اس کے لئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مرہم نے اس کے زخم کو پلستر کر دیا ہے۔ اگر اسے کوئی تکلیف ہوتی تو وہ خود بھی بول اٹھتا۔ بہر حال! میں نمران سے پوچھتی ہوں۔ اگر کوئی محفوظ جگہ ہو تو ہم تھوڑی دیر کے لئے رک سکتے ہیں۔“

ویلور اتیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی نمران کے قریب پہنچ گئی جو ان سے کئی قدم آگے تھا۔ ویلور نے اس سے بات کی تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اور پھر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے راستہ بدل لیا۔ وہ اصل راستے سے ہٹ کر چٹانوں میں ایک غار میں پہنچ گئے۔ غار صاف ستھرا تھا۔ ایک کونے میں جلی ہوئی لکڑیاں اور کوسلے پڑے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ یہ غار پہلے بھی استعمال ہوتا رہا تھا۔ وہ لوگ نڈھال سے ہو کر بیٹھ گئے۔ نمران اور اس کے دونوں ساتھیوں پر اس سفر کا زیادہ اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویلور کے کہنے پر گنجے نے گٹھڑی کھول لی اور وہ چیزیں نکال کر کھانے لگے۔ سفید بچ، جو کل رات ابلے ہوئے کھائے تھے، بھنے ہوئے تھے۔ ان میں ذرا سی منھاس تھی اور ذائقہ لذیذ تھا۔ ویلور نے بتایا کہ یہ بچ کھالیں خریدنے کے لئے آنے والے تاجر ہی لے کر آئے تھے۔

چیکو دیوار سے ٹیک لگاے بیٹھی تھی۔ اس نے چیتے کی فالتو کھال اتار کر زمین پر رکھ دی تھی۔ یہ کھالیں خاصی وزنی تھیں لیکن ان کی وجہ سے وہ سردی سے بچے ہوئے تھے۔ ویلور نے بھی ایک فالتو کھال لے رکھی تھی۔

ایک گھنٹہ غار میں رکنے کے بعد وہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا اور

”میں نے اسے خواب آور رس کے دو قطرے پلائے تھے۔ ویسے تو صبح سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کھل سکے گی۔ لیکن اگر اسے جھنجھوڑا جائے تو وہ اٹھ جائے گا۔ اور ویسے بھی میرا خیال ہے ان لوگوں کو ہمارے فرار کا صبح ہونے سے پہلے پتہ نہیں چلے گا بشرطیکہ تم لوگوں نے جیکو کے محافظوں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑا ہو۔“ ویلور نے کہا۔

”وہ دونوں خونخوار محافظ اور دونوں عورتیں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”پھر بھی ہمیں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا ہو گا۔“ ویلور نے کہا۔

یہ ایک تنگ سارا راستہ تھا جس کے دونوں طرف چٹانیں تھیں۔ راستہ مسلسل ڈھلوان تھا اور تاریکی ہونے کے باوجود ان کی رفتار خاصی تیز تھی۔ چیکو بھی اس تیز رفتاری میں ان کا ساتھ دے رہی تھی حالانکہ اس قبیلے میں پہنچنے سے پہلے اس سے ایک قدم اٹھانا بھی محال ہو رہا تھا لیکن کئی روز کے آرام اور اچھی خوراک نے اس میں نئی توانائی بھر دی تھی۔ وہ سب تازہ دم تھے اس لئے انہیں تیز چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ راستہ مسلسل ڈھلان ہونے کی وجہ سے بھی انہیں چلنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ ندیم نے ایک بات اور بھی خاص طور پر محسوس کی تھی کہ ڈھلوان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ راستہ خاصا پرہیز تھا۔ ہر چند قدم کے بعد انہیں کسی نہ کسی چٹان کے گرد گھومنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات تو ندیم کو محسوس ہوتا جیسے وہ ایک ہی جگہ پر چکر کاٹ رہے ہوں لیکن یہ اس کا وہم تھا۔

صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ وہ کم از کم پانچ گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے تھے اور اب تھکن محسوس کرنے لگے تھے۔ ندیم کو قابوس کا خیال تھا۔ زیادہ چلنا اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ زخموں پر ٹانگے تو نہیں لگے تھے۔ محض جڑی بوٹیوں کے مرہم۔ سے ٹھیک ہوا تھا۔ اندیشہ تھا کہ زخم کھل نہ جائے۔ ایسی صورت میں ان سب کے لئے مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔ ندیم نے حالانکہ راستے میں ایک دو مرتبہ پہلے بھی ویلور اسے کچھ دیر رکنے کو کہا تھا مگر وہ مسلسل چلتے رہنے پر اصرار کرتی رہی تھی۔ اور اب پھر اس نے ویلور کے قریب پہنچ کر کہا۔

”ہم کچھ دیر کہیں رُک کر آرام نہ کر لیں؟ اگر قابوس کا زخم کھل گیا تو مشکل پیدا ہو

”اس طرف آنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا کیا؟“ ندیم نے ویلور اسے پوچھا جو اس کے آگے آگے گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔

”اصل راستہ تو کوئی اور ہے۔“ ویلور نے جواب دیا۔ ”مگر نمران کے کہنے کے مطابق اس راستے سے بہت سا وقت کم ہو جائے گا۔“

”سردار یا اس کے آدمیوں کو بھی اس راستے کا علم ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔  
 ”میرا خیال ہے سردار اور اس کے آدمی بھی اس راستے سے واقف ہیں لیکن دشوار گزار اور خطرناک ہونے کی وجہ سے اسے بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی مختصر ایک اور راستہ بھی ہے مگر وہ راستہ بہت ہی زیادہ خطرناک ہے۔“ ویلور نے جواب دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اس سرنگ سے باہر نکل آئے۔ جھک کر چلنے سے سب کی کمریں دہری ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑے اپنی حالت درست کرتے رہے۔ پھر آگے چلنے لگے۔ ان کے بائیں طرف گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا اور دائیں طرف چٹانوں کا سلسلہ تھا۔ وہ ان چٹانوں میں چلتے ہوئے دریا سے دور ہوتے چلے گئے۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ وہ رات گزارنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگے۔ اور بالآخر انہیں ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں آرام سے رات گزاری جاسکتی تھی۔ انہوں نے اس جگہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ محسن نے یہ تجویز پیش کی کہ کچھ سوکھی جھاڑیاں اور لکڑیاں جمع کر کے سردی سے بچنے کے لئے آگ جلا لی جائے۔ مگر ویلور نے سختی سے منع کر دیا۔ کیونکہ آگ کی روشنی اور دھوئیں سے ان کا تعاقب کرنے والے آسانی سے ان کا سراغ لگالیں گے۔

کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے سردی کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی۔ جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی، سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لوگ چیتوں کی کھالیں اوڑھے سٹے ہوئے تھے اور سب سو رہے تھے۔ ندیم بھی سو گیا تھا۔ وہ نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ ندیم کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ اور پھر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ کوئی عورت تھی۔ وہ چمکیو یا ویلور ہی میں سے کوئی ہو سکتی تھی۔

”یہ میں ہوں، ویلور۔“ ایک سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”سردی لگ رہی

قابوس کے زخم کے بارے میں ویلور کا خیال واقعی نرم دھوپ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ قابو لڑا ہٹ کے علاوہ اور کوئی تکلیف محسوس نہیں کر رہا درست نکلا تھا۔ وہ ٹانگ میں ہلکی سی لنگڑا

تھا۔ اب تک وہ جس راستے پر سفر کرتے رہے تھے وہ دو پہر تک وہ رُکے بغیر چلتے رہے۔ شکاری پیش نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اب راستہ خاصا ٹھیک ٹھاک تھا۔ انہیں چلنے میں کوئی دیش جگہ بیٹھ کر کچھ دیر آرام کیا۔ کھانا کھایا اور پھر آگے دشوار گزار ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک چٹان کے دامن میں پہنچ گئے جس کے ساتھ تقریباً چل پڑے اور بالآخر ایک ایسی عمودی چ

پچاس فٹ کی گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ اس چٹان کے دوسری طرف پہنچنے کا ایک ہی چٹان پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چارپانچ فٹ چوڑی ایک کارنس سی بنی ہوئی ذریعہ تھا۔ دریا کے رُخ پر چٹان کے کر چٹان کے دوسری طرف پہنچنا تھا۔ تھی۔ انہیں اس خوفناک راستے پر چل کر اس اگرچہ چارپانچ فٹ چوڑی تھی۔ مگر تیز ہوا کی نمران سب سے پہلے آگے بڑھا۔ ہاتھ۔ نمران چٹان پر ہاتھ جمائے آہستہ آہستہ آگے وجہ سے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر چمکیو اور اس کے پیچھے دوسرے تھے۔ ہر ایک بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے ویلور، پھر نہ غا۔ ہوا انہیں بری طرح دھکیل رہی تھی اور وہ لوگ کے درمیان تقریباً تین فٹ کا فاصلہ مل رہے تھے۔

چٹان کی دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے اپر چلتے رہے۔ آگے یہ کارنس چٹان کے ساتھ گھوم تقریباً پچاس گز تک وہ اسی کارنس چٹان تھی جو دریا کے اندر کی طرف نکلی ہوئی تھی گئی تھی۔ دوسری طرف سامنے بھی اُس وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا اور اس چٹان کے ساتھ کوئی ایسی کاحیسے ہی موڑ گھومے، دوسری چٹان میں ایک تنگ سی جیسے آگے راستہ بند ہو گیا ہو۔ لیکن داخل ہوتے چلے گئے۔

سرنگ کا دبانہ نظر آیا۔ وہ اس سرنگ جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ یہ سرنگ خاصی تنگ تھی اور اُن وہ آوازوں کے سہارے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ نے کے بعد سرنگ بائیں طرف مڑ گئی اور بہت دور رہے۔ تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے نظر آ رہی تھی۔

سرنگ کے دوسرے دہانے کی روش

ہے۔“

ندیم کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ پھر ویلور اس کے سینے پر سر رکھ کر سو گئی۔ ندیم نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اسے دیر تک نیند نہیں آ سکی تھی۔

صبح اٹھنے کے فوراً بعد ہی وہ چل پڑے۔ ابھی انہوں نے تقریباً دو گھنٹے سفر کیا تھا اور وہ چٹانوں ہی میں تھے کہ نمران کے ایک ساتھی کی چیخ سن کر اچھل پڑے۔ ان سب نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ ایک گنجاز مین پر گرا ہوا تھا اور اس کے سینے میں ایک نیزہ پیوست تھا۔

”بھاگو۔۔۔۔ اس طرف۔۔۔۔ ان پتھروں کے پیچھے۔“ ندیم چیخا۔

اسی وقت ایک چٹان پر سے بہت سے لوگوں کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم اور اس کے ساتھی دوڑ کر پتھروں کی آڑ میں دب گئے۔ ندیم نے چٹان کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ اسے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ چٹان پر گنبجے کھڑے نیزے لہراتے ہوئے افریقہ کے زولو قبائلیوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ ان کے درمیان سردار ہسپو لاکھڑا تھا۔ اس کی سنہری زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

”ویلور!“ سردار ملکہ کا نام لے کر چیخا۔ ”تم لوگ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔“

”ویلور نے ندیم کو بتایا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ قابوس نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔ اس نے پتھر کی آڑ لے کر راتفل سیدھی کر لی۔

”احتیاط سے قابوس!“ ندیم نے کہا۔ ”ہمارے پاس یہی دو میگزین ہیں جو راتفلوں میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی گولی ضائع نہیں ہونی چاہئے۔“

”فکر مت کرو۔ ایک بھی گولی ضائع نہیں ہوگی۔“ قابوس نے کہا اور ٹرائیگر دبا گیا۔ ویرانہ تڑتاہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ چٹان پر کھڑے ہوئے چھ گنبجے خوفناک انداز میں چیختے ہوئے گرے اور چٹان پر لڑھکنے لگے۔ سردار اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے چٹان کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ قابوس دوڑتا ہوا چٹان پر چڑھ گیا۔ ندیم بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ سردار اور اس کے ساتھی چٹان کے دوسری طرف ڈھلان پر دوڑے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ ندیم نے اپنی راتفل کا ٹرائیگر دبا دیا۔ دو اور گنبجے ڈھیر ہو گئے۔ سردار اور اس کے چار ساتھی چٹانوں میں غائب ہو گئے۔ قابوس اور ندیم واپس آ گئے۔

”اب یہاں سے نکل چلو۔ اگر ہسپو لاکھ کے ساتھ مزید آدمی ہوئے تو وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کرے گا۔“ ویلور نے کہا۔

نمران اور اس کا دوسرا ساتھی حیرت سے ان راتفلوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن کے دھماکوں نے قبیلے کے چھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ نمران نے اپنے مردہ ساتھی کے سینے میں گڑا ہوا نیزہ نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے کھانے پینے کے سامان والی گٹھڑی اٹھالی اور وہ لوگ تیزی سے چلنے لگے۔ گنبجے کی لاش کو انہوں نے ویسے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے ان کے ہاں مردوں کو دفن کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔

وہ لوگ چٹانوں میں گھومتے ہوئے ایک بار پھر دریا پر پہنچ گئے۔ اس جگہ دریا کا پانی اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن اس کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ دریا کے کنارے عمودی تھے۔ وہ کنارے کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلتے رہے۔ ندیم اور قابوس محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے لیکن سردار یا اس کا کوئی ساتھی نظر نہیں آیا تھا۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ ان راتفلوں سے ڈر کر واپس چلے گئے ہوں گے۔“ سردار نے اپنے آدمیوں کی لاشیں گرتے دیکھی ہیں۔ اب وہ شاید ہمارے پیچھے نہ آئے۔“ ندیم نے کہا۔

”اس خوش فہمی میں بھی مت رہنا۔“ ویلور نے کہا۔ ”وہ دنیا کے آخری سرے تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ تم اس کی دنیا لوٹ کر لے جا رہے ہو۔ وہ آرام سے کیسے بیٹھے گا؟“

شام کا اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں دریا کے دونوں کناروں کے مابین تقریباً پچیس گز کا فاصلہ تھا اور دونوں کناروں پر چٹانیں تھیں۔ ایک بہت موٹا سا ایک چٹان سے دوسری چٹان تک تتا ہوا تھا۔ دریا پر سے صرف ایک رے کا یہ معلق پل دیکھ کر ندیم وغیرہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ لیکن ندیم کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ اس رے کے ذریعے دریا کیسے پار کیا جائے گا۔ رے سے الٹ کر دریا پار کرنے کی کوشش کرنا خود کشی کے مترادف تھا۔



”دریابار کیسے کیا جائے؟“ ندیم نے سوالیہ نگاہوں سے ویلور کی طرف دیکھا۔  
 ”اس کا بندوبست ہے۔“ ویلور نے کہتے ہوئے نمران کو اشارہ کیا۔

نمران نے سامان والی گھڑی کھولی اور اس میں سے بیلٹ کی طرح چمڑے کی لمبی لمبی پٹیاں نکالنے لگا۔ ان بیلٹوں کے ساتھ ایک ایک الگ پٹی بھی لگی ہوئی تھی جس کے سرے پر لکڑی کے ہنک لگے ہوئے تھے۔

ویلور نے ایک بیلٹ اٹھا کر اپنی کمر پر پیٹ لیا۔ اس نے بیلٹ کو اس طرح گرہیں دے لیں کہ وہ کھل نہ سکے۔ ہنک والی پٹی اس کی پشت پر تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ ہنک رے میں پھنسا دیا جائے گا اور اس طرح رے کے ساتھ لٹکے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچ جائیں گے۔

سب نے بیلٹ باندھ لئے۔ ندیم نے جھیکو کا بیلٹ خود باندھا تھا اور اس کی گرہیں خوب اچھی طرح چیک کر لی تھیں۔ پل کار سادریا کے کنارے سے کافی آگے ایک چٹان میں لگے ہوئے ایک آہنی ہنک سے بندھا ہوا تھا۔ ہنک کے نیچے پلیٹ فارم کی طرح ایک بہت بڑا پتھر بڑا ہوا تھا۔ اس نے اس پتھر پر چڑھ کر ہنک کو رے میں پھنسا دیا۔ ندیم نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر سہارا دے رکھا تھا۔ اور پھر اس نے ویلور کا اشارہ پا کر اسے ہلکا سا دھکا دے دیا۔

دریابا کا دوسرا کنارہ ذرا نیچے تھا۔ اس طرح وہ رسا بھی کسی قدر نیچے کی طرف ترچھا تھا۔ ویلور ہنک سے لٹکی رے کے ساتھ پھسلتی جا رہی تھی۔ اور ان سب کے دل بڑی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ چند منٹ بعد ہی ویلور اور دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس نے ہنک کو رے میں سے نکال کر ایک طرف کھڑے ہو کر ہاتھ ہلایا۔

ندیم نے جھیکو کو پتھر پر کھڑا کر کے اس کی بیلٹ کا ہنک رے میں پھنسا دیا۔ جھیکو بری طرح خوفزدہ تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

”ڈرو نہیں! ہنک والے بیلٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لو اور آنکھیں بند کر لو۔ ریڈی..... گو.....“ ندیم نے کہتے ہوئے ہلکا سا دھکا دے دیا۔ جھیکو کے منہ سے ایک خوفزدہ سی چیخ نکلی اور وہ رے سے معلق پھسلتی چلی گئی۔

باری باری کر کے قابوس، محسن اور نمران بھی دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ نمران اپنے ساتھ وہ گھڑی بھی لے گیا تھا جس میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ نمران کے بعد

دوسرے گھنچے کے باری آئی۔ ندیم اسے رے پر پھسلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دریابا کے وسط میں پہنچ کر وہ گنجا اچانک ہی جھولنے لگا اور پھر اچانک ہی وہ چالیس پچاس فٹ نیچے دریا میں جا گرا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری چیخ بہت ہی خوفناک تھی۔

ندیم کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ گھنچے کو نیچے گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گنجا دریابا میں گرا اور پانی کی تیز لہریں اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ ندیم نے اوپر دیکھا۔ ہنک اور بیلٹ اب بھی رے پر اٹکا ہوا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ گنجا اپنی کمر پر بیلٹ کی گرہیں ٹھیک سے نہیں باندھ سکا ہو گا اور راستہ میں گرہیں کھل گئی تھیں۔

آخر میں ندیم ہی رہ گیا تھا۔ گھنچے کا حشر وہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے احتیاطاً بیلٹ کی گرہیں چیک کیں اور پتھر پر چڑھ گیا۔ وہ ہنک رے میں لٹکانا ہی چاہتا تھا کہ کوئی چیز ’زن‘ کی آواز کے ساتھ اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک نیزہ تھا جو اس کے سر کے قریب سے گزرتا ہوا پیچھے جا گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گھنچے قبائلوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ندیم نے بڑی بھرتی سے کندھے سے رائفل اتار کر آواز کی طرف دیکھا۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر سردار مسپو لا اپنے چار آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ندیم نے فوراً ہی فائر کھول دیا۔ ایک گنجا ڈھیر ہو گیا۔ سردار اور باقی تینوں گھنچے دوڑ کر چٹانوں کی آڑ میں چلے گئے۔ ندیم جلدی سے پتھر پر چڑھ گیا اور ہنک کو رے میں پھنسا کر پیر پتھر کے کنارے پر رکھ کر اپنے آپ کو ایک زوردار جھکا دیا۔ وہ تیزی سے رے پر پھسلنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رائفل سنبھال رکھی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد گھنچے چٹان کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ایک گھنچے نے نیزہ اس کی طرف کھینچ مارا۔ نیزہ ندیم کے قریب سے گزر گیا۔ اس نے بھی فائر کر دیا۔ قبائلی بار بار رے والے ہنک کی طرف آرہے تھے۔ وہ غالباً رسا کاٹنا چاہتے تھے اور ندیم فائر کرتے ہوئے انہیں رے سے دور رکھے ہوئے تھا۔ سردار مسپو لا چیخ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ رسا کاٹنے کی کوشش میں ایک اور گنجا ندیم کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

ندیم بخیریت دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ سردار کا ایک آدمی رے سے اٹک گیا تھا اور ہاتھ کی مدد سے لٹکتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی وسط میں پہنچا، نمران نے نیزے سے رے پر بھرپور وار کیا۔ رسا کٹ گیا اور وہ قبائلی رے سمیت چٹنا ہوا دریابا میں جا گرا اور

دریا کی تیز لہروں نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔  
سردار ہسپتال دوسرے کنارے پر کھڑا چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ ویلور انڈیم کی طرف  
دیکھ کر مسکرا دی۔

”دریابار کرنے کا کوئی اور راستہ تو نہیں؟“ ندیم نے پوچھا۔  
 ”وہ یہاں سے کم از کم آدھے دن کی مسافت پر ہے۔ چیتوں کی کھالوں کے شکاری اس طرف سے آتے ہیں۔ ہسپو لاب یقیناً اس طرف جائے گا۔“ ویلور نے کہا۔  
 ”اندھیرا پھیل رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کوئی ٹھکانہ تلاش کر لینا چاہیے۔“ ندیم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چٹانوں میں چلنے لگے اور بالآخر ایک غار میں ڈیرہ ڈال دیا۔ یہ غار خاصا بڑا تھا اور اس میں بھی جلی ہوئی لکڑیوں اور کوسلے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے باہر سے بہت سی جھاڑیاں اور لکڑیاں جمع کر لیں اور نمران نے گٹھڑی میں سے پتھر نکال کر آگ روشن کر لی۔ آج وہ واقعی تھک گئے تھے۔ گٹھڑی میں بھنا ہوا گوشت بھی موجود تھا۔ نمران نے بھنی ہوئی رانیں لکڑی کی سلاخ میں پرو کر انہیں گرم کر لیا اور وہ ۔۔۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر گوشت کھانے لگے۔

وہ رات انہوں نے کسی خوف کے بغیر اطمینان سے سو کر گزاری۔ صبح اٹھ کر وہ دیر تک غار میں آگ جلا کر بیٹھے رہے۔

”اب وہ بستی یہاں سے کتنی مسافت پر ہے؟“ ندیم نے ویلور اسے پوچھا۔  
 ”تقریباً آدھے دن کا فاصلہ ہے۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ زیادہ وقت بھی لگ جائے۔  
 کیونکہ آگے کا راستہ کچھ دشوار ہے۔“ ویلور نے جواب دیا۔

”تو پھر..... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں روانہ ہو جانا چاہئے۔“ ندیم نے کہا۔  
 ”ہاں چلو!“ ویلور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ نمران تے بھی اپنی گٹھڑی سنبھالی اور سب غار سے نکل آئے۔ کچھ دور تک تو راستہ ہموار رہا۔ پھر واقعی دشوار اور خطرناک راستہ شروع ہو گیا۔ اور یہ راستہ سب سے زیادہ دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ کبھی انہیں کسی چٹان پر چڑھنا پڑتا اور کبھی کسی تیز بہاؤ والی ندی میں سے گزرنا پڑتا۔

کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ انہیں بڑی مشکل پیش آرہی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ انہیں اس پہاڑ پر اس طرح چڑھنا پڑا تھا جیسے کوہ پیما کی کر رہے ہوں۔ لیکن ان کے پاس کوہ پیما کی کا کوئی سامان نہیں تھا وہ تو اپنی زندگیوں کو بھی بوجھ سمجھ کر بڑی مشکل سے اسے گھسیٹ رہے تھے۔

ایک پتھر پر چڑھتے ہوئے چیکو کا پیر پھسل گیا۔ وہ جیتی ہوئی کئی فٹ تک نیچے لڑھکتی چلی گئی۔ جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں تو آئی تھیں مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوئی تھی کہ اس کے سیدھے پیر میں موج آگئی تھی۔

وہ کئی ہفتوں سے ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹ رہے تھے۔ اب ان سے ہی اپنی تکلیفیں برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ اپنے آپ کو نہیں گھسیٹا جا رہا تھا، چیکو کو ساتھ گھسیٹنا کچھ اور مشکل ہو گیا تھا۔

وہ تقریباً تین گھنٹوں میں اس پہاڑ پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ وہ درختوں کے سائے میں گر کر ہانپنے لگے۔ اپنے آپ کو سنبھالنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ جب حواس بحال ہوئے تو اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ ان کے سامنے نشیب میں تاحہ نگاہ چڑ کے فلک بوس درختوں کا جنگل تھا اور کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے بہت دور کوئی مشین چل رہی ہو۔ وہ لوگ اس سمت چل دیئے جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ اب انہیں ایسی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے فلک بوس درخت جڑوں سے اکھڑ کر گر رہے تھے۔ بالآخر تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں چند آدمی بڑے بڑے آروں سے درخت کاٹ رہے تھے۔ جزیئر سے چلنے والے ان آروں سے درخت بڑی آسانی سے کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔

وہ چار آدمی تھے جو درخت کاٹ رہے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی ان لوگوں کو دیکھا اپنا کام چھوڑ کر چیختے ہوئے ایک طرف بھاگ اٹھے۔ ان کے حلیے بھی ایسے تھے کہ کوئی بھی شخص انہیں دیکھ کر ڈر سکتا تھا۔ قابوس شینا اور برشسکی زبانوں میں انہیں پکارتا رہا۔ لیکن وہ نہیں رکے۔ یہ لوگ بھی اس طرف چلتے رہے جس طرف درخت کاٹنے والے مزدور دوڑے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایک بہت بڑے جھونپڑے کے قریب پہنچ گئے۔ جھونپڑے

کے سامنے ان مزدوروں کے علاوہ دو اور آدمی بندوقین لئے کھڑے تھے۔ قابوس نے چیخ کر کہا کہ وہ گولی نہ چلائیں۔

ان کا ایک ٹھیکیدار تھا جس نے اس جنگل میں درخت کاٹنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ قابوس نے شینا زبان میں انہیں مختصر طور پر اپنی کہانی سنائی تو ٹھیکیدار ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”تم لوگ تھوڑی دیر یہاں آرام کر لو۔ میں اپنی جیب پر تم لوگوں کو بستی تک پہنچا دوں گا۔“

ٹھیکیدار کے ایک آدمی نے چائے بنالی۔ چائے میں کنڈیشنڈ ملک استعمال کیا گیا تھا۔ چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی انہیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ ذائقہ چکھا ہو۔ چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ انہیں اپنے آپ میں زندگی بیدار ہوتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ٹھیکیدار کی جیب میں لدے ہوئے تھے اور جیب نشیب میں نا ہموار راستے پر اچھلتی ہوئی جارہی تھی۔ وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔

جیب پر سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جنگل سے نکل آئے اور اب نشیب میں ایک بستی نظر آرہی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بستی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ اور پھر سب سے پہلے بستی کی کچی مسجد کا مینار دکھائی دیا۔ وہ بستی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ فضا میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہونے لگی۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

”بے شک! اللہ بہت بڑا ہے۔“ قابوس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ سب مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اس سرد جہنم سے نکل آئے تھے جس نے ان کے کئی ساتھیوں کو نگل لیا تھا، اور بالآخر وہ قدم قدم پر موت سے آنکھ پھولی پھیتے ہوئے انسانوں کی بستی میں آگئے تھے جہاں زندگی مسکرا رہی تھی۔

(ختم شد)